دیارِ دل

فرحت اشتیاق

دیارِ دل

دیر تک سونے کی اسے عادت نہیں تھی۔ رات میں خواہ کسی وقت بھی سوئی ہو، صبح اپنے مقررہ وقت پر ہی اس کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی۔ اگرچہ کہ رات بھی وہ کونسا بہت بھرپور اور مکمل نیند سوئی تھی۔ گزشتہ پندرہ دنوں کی طرح کل رات بھی بستر پر لیٹ کر کروٹیں ہی بدلی تھیں۔ کبھی سوئی، کبھی جاگی، کبھی ڈر کر اٹھ بیٹھی، پھر بھی نئے سال کی اس پہلی صبح وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی اس نامکمل اور ادھوری نیند سے بیدار ہو چکی تھی لیکن بیدار ہو کر بھی وہ کرے کیا؟ یہاں اپنے اس گھر میں وہ بالکل تنہا ہے، بالکل اکیلی۔

وہ کس کے لئے بستر سے اٹھے، وہ کس کے لئے کمرے سے نکلے۔ جو تنہائی کمرے میں اس کے ساتھ ہے وہی اس گھر کے ہر کونے میں بکھری ہوئی ہے۔ وہ پورا دن بھی اس بستر پر لیٹے کمرے میں مقید گزار دے تو کوئی اسے پوچھنے نہیں آئے گا کہ آج وہ اٹھ کیوں نہیں رہی۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں، کہیں اس کے ساتھ کوئی اور مسئلہ تو نہیں۔

یہ خود ترسی تھی۔ یہ بدترین خود ترسی تھی مگر وہ کیا کرتی۔ ان دنوں اس کا کہیں جانے آنے کا تو کیا اپنے کمرے تک سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ روتی نہیں تھی۔ پتہ نہیں وہ کچھ محسوس کرتی بھی تھی کہ نہیں کہ اگر سوچنے اور محسوس کرنے لگتی تو شاید شدتِ غم سے پاگل ہو جاتی۔

عمر بھر اس سے بہت ناراض، بہت خفا اور بہت دور رہنے والی اس کی ماں اس بار حقیقتاً اس سے بہت دور چلی گئی تھی اسے بالکل تنہا، بالکل اکیلا اور بے امان چھوڑ کر۔ کینیڈا اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔

وہ ان کا غصہ، ان کی ناراضی، ان کی اپنے سے ذہنی دوری سب سہنے کی عادی تھی۔ مگر وہ یوں اس سے ناراض ہو کر، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کینیڈا خالہ کے پاس جا سکتی ہیں؟

وہ ابھی بھی سوچنا شروع کرتی تو اسے یقین نہ آتا۔ کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہو سکتی، کوئی ماں اتنی سخت دل نہیں ہو سکتی کہ اپنی جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر اس سے ناراض ہو کر خود دوسرے ملک جا بیٹھے۔

اس کے بالکل برابر والا گھر اس کے ماموں کا تھا۔ ممی اسے اکیلا چھوڑ کر جاتے وقت کچھ بھی نہیں کہہ کر گئی تھیں۔ وہ اسے خدا حافظ تک نہ کہہ کر گئی تھیں۔ انہوں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ کیوں جا رہی ہیں؟ وہ کتنے دنوں کے لئے جا رہی ہیں؟ وہ کب آئیں گی؟ اور سب سے بڑھ کر اہم بات ان کی غیر موجودگی میں وہ گھر میں تنہا کس طرح رہے گی؟ ان کی جانب سے ایسی کسی بھی بات کا اس شدید ناراضی کے عالم میں کوئی ذکر نہیں ہوا تھا لیکن اگر دل میں انہوں نے یہ سوچ کر خود کو اطمینان دلا دیا تھا کہ ان کے برابر والا گھر تو ان کے سگے بھائی کا ہے، جس بیٹی سے وہ ناراض ہو کر دور دیس جا رہی ہیں وہ اپنے ماموں

کے گھر رہ لے گی، اگر انہوں نے ایسا سوچا تھا وہ تب بھی ماموں کے گھر ہرگز نہیں گئی تھی۔

وہ کیوں کسی کے گھر جائے۔ وہ کیوں کسی کے گھر رہے، جب اس کی جنم دینے والی ماں کو اس کی پروا نہیں ہے پھر وہ کسی دوسرے سے کوئی آس کیوں باندھے؟ وہ ساری دنیا سے خفا تھی۔ وہ ساری دنیا سے ناراض تھی۔ وہ تجمل ماموں کے کہنے اور معیز کے فون پر سمجھانے کے باوجود ماموں کے گھر نہ گئی تھی۔

وہ پندرہ دنوں سے اپنے گھر میں بالکل اکیلی رہ رہی تھی۔ وہ سارا دن اکیلی رہتی۔ وہ ساری رات اکیلی رہتی، ان کے اور ماموں کے گھروں کے بیچ دیوار توڑ کر جو ایک گیٹ گھروں کے اندر ہی نکالا گیا تھا اسے بھی وہ بند رکھتی۔ رات میں ایک ہلکے سے کھٹکے اور آہٹ تک سے وہ اٹھ بیٹھتی۔ خوف سے کانپتی رہتی مگر ماموں کے گھر نہ جاتی، اگر یہ ضد تھی تو ٹھیک ہے، یہ ضد ہی تھی۔ اگر ممی ضد دکھا سکتی ہیں، اسے اکیلا چھوڑ کر جا سکتی ہیں تو پھر وہ بھی ضد دکھا سکتی ہے۔ وہ بھی ان ہی کی بیٹی ہے۔

زہرا مامی کئی بار اسے سرکش اور خودسر قرار دے چکی تھیں بلکہ ان کے مطابق تو ممی کے اسے اکیلا چھوڑ کر جانے کی قصوروار بھی مکمل طور پر وہی تھی۔

ان کے ان تبصروں میں نیا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں ان ہی القاب سے نوازا کرتی تھیں۔ اس کی زبان کی طراری سے خائف رہتی تھیں۔ اس لئے منہ پر صاف کچھ نہ کہہ پاتیں تو در پردہ طنز کے تیر ضرور برساتیں۔

مختلف بات اس بار یہ تھی کہ تجمل ماموں بھی اس ساری صورتحال کے لئے قصوروار اسی کو سمجھتے تھے۔ اسے ماں سے محبت نہیں، اسے ماں کے غموں کا کوئی احساس نہیں، کیسی بیٹی ہے وہ جو ماں کے دکھوں کا مداوا کرنے کے بجائے ان میں اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔

یہ کون سے دکھ تھے جن کا مداوا صرف دولت کے حصول کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھتی نہ تھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا کچھ کہنے کا۔ اسے کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔

جب ماں ہی بیٹی کو نہ سمجھ رہی ہو تو کسی دوسرے سے کیا گلہ؟

معیز ان دنوں اپنے بزنس کے کام سے چائنا گیا ہوا تھا، اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسی سے سب کچھ کہتی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی لیکن اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ سب ہوتا ہی کیوں؟ وہ ممی کو اتنی جذباتی اور امیچور حرکت بھی نہ کرنے دیتا۔ وہ یقیناً انہیں کینڈا جانے سے روک لیتا۔

انہوں نے معیز کو بیٹا بنایا ہوا تھا اور جس وقت وہ کسی ضد پر اڑی ہوتیں تو صرف معیز ہی اگر چاہتا تو انہیں اس ضد سے باز رکھ سکتا تھا۔

معیز اس کا کزن تھا، اس کا دوست تھا۔ اپنی پوری فیملی میں اگر کسی کے ساتھ اس کی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی تھی تو وہ معیز تجمل ہی تھا۔ وہ اس کے انٹلیکٹ (Intellect) کو سمجھتا تھا اور اسے سراہتا بھی تھا۔

وہ نہ زہرا مامی کی طرح طنز کرتا، نہ تجمل ماموں کی طرح نصیحتیں نہ ممی کی طرح اس سے شاکی و بدگمان رہا کرتا۔

ڈیڈی کے انتقال کے بعد جب بتدریج ممی بھی اس سے ذہنی طور پر دور ہوتی چلی گئیں تب معیز ہی وہ واحد شخص تھا جس نے ہمیشہ اسے سمجھا، اسے سنا، وہ اس سے کہہ سن کر ہمیشہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی۔

صبح سویرے کی بیدار ہوئی آخر وہ ساڑھے گیارہ بجے بستر سے اٹھ گئی۔ یکم جنوری کی اس خوب سرد صبح ٹھنڈے پانی سے نہانے کے لئے خاصی ہمت درکار تھی مگر خود اذیتی کی جن کیفیتوں کا وہ شکار تھی ایسے میں اسے ٹھنڈا پانی ہی اپنی تھکن اور بوجھل پن دور کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دیر شاور کے نیچے کھڑی وہ ٹھنڈے پانی کو اپنے جسم پر بہاتی اپنے مردہ ہوئے اعصاب اور جسم کو توانائی پہچانے کی کوشش کرتی رہی۔ نہانے کے بعد وہ بے دلی اور پژمردگی سے چلتی کچن میں آ گئی۔ اس نے کل دوپہر اور رات بھی کچھ نہ کھایا تھا اور اس وقت بھی کچھ کھانے کو اس کی طبیعت راغب نہیں تھی اسی لئے وہ اپنے لئے فقط ایک کپ چائے کا اہتمام کر رہی تھی۔ چائے کا کپ لے کر وہ کچن سے باہر نکل آئی۔

پورے گھر میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ صرف اس کے اپنے چلنے سے ایک معمولی سی آواز پیدا ہو رہی تھی اور وہ بھی اس مکمل خاموشی اور گہرے سناٹے کا مزید شدید احساس دلا رہی تھی۔

ممی پندرہ دن پہلے جب یہاں تھیں تب بھی دن کے اوقات میں وہ کبھی گھر پر نہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کی صبح سے رات گئے تک کی بے شمار و بے حساب مصروفیات ہوا کرتی تھیں، مگر تب ان کے مختلف گھریلو امور کے لئے مامور کئی ملازم یہاں ضرور موجود تھے۔ ممی کے جانے کے بعد دسمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے پورے مہینے کی تنخواہیں ہاتھ میں پکڑا کر ان سب کو فارغ کر دیا تھا۔ گھر میں صرف دو افراد اور ان کا بھی زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا ہو پھر نوکروں کا یہ جم غفیر اکٹھا کرنے کی تک کیا تھی۔

وہ ممی کی موجودگی میں بھی اتنے ڈھیر ملازمین کے رکھے جانے پر کبھی خوش نہ ہوئی تھی اور اب ان کی غیر موجودگی میں تو اس بے مقصد فوج کو اپنے سر پر سوار رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اب اپنے بل بوتے پر زندگی گزارے گی تو اپنے بل بوتے پر فی الحال وہ کئی کیا ایک نوکر بھی افورڈ نہیں کر سکتی۔ اسے کسی کی کسی دولت جائیداد سے کوئی سروکار نہیں۔ جس بات پر ممی اس سے ناراض ہو کر گئیں وہ اب بھی اپنی اسی بات پر قائم خود کو ہر اعتبار سے حق پر اور درست مان رہی تھی۔ زندگی کی الجھی گتھیوں کو سلجھاتی وہ باہر لان میں آ گئی۔ گیٹ کے پاس رول ہوا آج کا تازہ اخبار گرا تھا مگر یہ کیسا لطیفہ تھا کہ اسی کے ساتھ پچھلے کئی دنوں کے اخبار بھی اسی طرح رول ہوئے پڑے تھے۔

شاید چار یا پانچ دنوں سے اس نے یہاں سے اخبار اٹھائے ہی نہیں تھے۔ وہ کپ ہاتھ میں لئے گیٹ تک آئی اور سارے اخبار کچھ ایک، کچھ دوسرے ہاتھ میں سنبھال لئے۔ انہیں بے دلی سے لان چیئر پر ڈال کر وہ دوسری کرسی پر بیٹھ کر چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

اس کی بھوک، پیاس بالکل مری ہوئی تھی۔ اس وقت بھی چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے اسے یہ نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کل پورا دن ایک لقمہ بھی حلق سے نہ اتار کر آج اسے ضرور کچھ کھا لینا چاہئے۔

اس کی زندگی کی تمام الجھنوں کا حل کیا نکلے گا؟ زندگی اس طرح کب تک گزرے گی؟ اس کے پاس نہ کوئی دوست موجود تھا نہ ہمدرد، وہ کس کے پاس جائے، وہ کس سے مشورہ مانگے۔

خود کو زندگی میں اتنا تنہا، اتنا بے امان، اتنا غیر محفوظ اور اتنا اکیلا اس نے کبھی بھی محسوس نہ کیا تھا جتنا پچھلے پندرہ دنوں سے کر رہی تھی۔

شاید معیز لاہور میں ہوتا تو وہ اس سے ہمیشہ کی طرح اپنے دکھ سکھ اور دل کی باتیں کہہ لیتی مگر کہہ دینے سے بھی کیا ہوتا۔ زندگی جن الجھنوں اور جن مشکلات میں گھری ہے وہ تو ویسے ہی گھری رہتی۔

چائے کے کپ میں سے آخری گھونٹ لیتے اس نے برابر والے گھر کی طرف دیکھا۔ رات وہاں نیو ایئر پارٹی تھی۔ نئے سال کا جشن خوب زور و شور سے منایا گیا تھا۔ پوری رات وہاں سے شور شرابا، بہت تیز آواز میں بجتا میوزک، قہقہے باتیں، آوازیں سب یہاں تک بھی آتے رہے تھے۔

رات وہاں بہت ہنگامہ خیز انداز میں زندگی جاگی تھی اور اب دن کے ساڑھے بارہ بجے بھی وہاں زندگی گہری نیند سو رہی تھی۔

رات بھر جاگ کر نئے سال کا بھرپور انداز میں جشن منانے والے اب اپنی تھکن اتار رہے تھے۔

گھر کے افراد تو کیا اسے وہاں سے کسی ملازم تک کے چلنے پھرنے یا باتیں کرنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔

کل رات، وقت کے وقت اسے بھی فون کر کے اس کی کزن ارم نے اس پارٹی میں شرکت کی بہت رسمی سی دعوت دی تھی لیکن اگر یہ بہت پر اخلاق اور پر جوش بلاوا بھی ہوتا وہ تب بھی وہاں نہ جاتی۔

ان دنوں تو خیر وہ زندگی ہی سے بے زار ہو رہی تھی مگر جب ایسا نہیں تھا تب بھی بسنت اور نیو ایئر نائٹ اور نیو ایئر پارٹیز جیسی لغویات کو اس نے ہمیشہ سخت ناپسند کیا تھا۔

کبھی امی گھر پر ایسی کوئی بے مقصد اور فضول پارٹی رکھتیں تو وہ دل پر کڑا ضبط کرتی بحالت مجبوری صرف ان کی ناراضی کے خوف سے اس میں شریک ہوا کرتی تھی۔

چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی سطح بالکل خشک اور ذہن بالکل خالی تھا۔

اس کا ملال اور یاسیت مایوسی میں اور مایوسی بے حسی میں بدل رہی تھی۔ وہ اتنی بے حس سی کیوں ہو رہی ہے؟ اسے خود پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ وہ کھل کر روتی کیوں نہیں۔ ایک بار خوب کھل کر رو لے تو شاید اندر کا سارا غبار نکل جائے۔

اندر فون کی بیل بج رہی تھی اور وہ بے حسی سے بیٹھی کیاری میں کھلے نئے پھولوں کو دیکھ رہی تھی مگر فون پر جو کوئی بھی تھا وہ اتنی جلدی ہمت ہارنے کو تیار نہ تھا۔ فون کی یہ مسلسل بجتی بیلیں اسے اپنی برداشت سے باہر ہوتی محسوس ہوئیں تو ناچار اٹھ کر اندر آئی۔

''ہیلو۔'' خاصی بے زاری سے اس نے ہیلو کیا۔

وہ ان دنوں ایسی ہی چڑچڑی اور بد مزاج سی ہو رہی تھی۔

''میں ولی بول رہا ہوں۔'' ہیلو، ہائے اور سلام دعا کے بغیر یہ فقرہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

''اوہ......'' اس کے ہونٹ ناگواری سے بھرپور انداز میں سکڑے۔

وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد کی آواز سننے کو تیار ہو سکتی تھی، سوائے اس ایک شخص کے۔

اس کی زندگی کی ہر الجھن، ہر پریشانی اور ہر مصیبت کی وجہ یہی ایک شخص تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتی تھی وہ واقعی اس سے بے پناہ نفرت

کرتی تھی۔اس دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی اگر وہ ولی صہیب خان اس میں نہ ہوتا یا کم از کم وہ فارہ بہروز خان کی دنیا میں تو نہ ہوتا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر وہ فوراً بولا۔

نئے سال کے اس پہلے دن جو سب سے پہلی آواز اس نے سنی،وہ اس شخص کی ہے اس کے چڑ چڑے پن اور غصے میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

وہ فارہ ہی بات کر رہی ہے، کی تصدیق کے بغیر جو دوٹوک اور حکمیہ سے لہجے میں اس سے جملہ بولا گیا اس نے اس کی طبیعت کو مزید مکدر کیا۔

فون پر اس سے زندگی میں صرف ایک ہی بار بات ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ مکار انسان اس کی آواز بخوبی پہچانتا تھا۔''لیکن میں تم سے ہرگز ملنا نہیں......اس نے انتہائی سخت لہجے میں کہنا چاہا مگر اس نے اس کے انکاری جملے کو مکمل نہیں ہونے دیا۔

''میں تم سے Divorce (طلاق) کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔فون پر اتنی لمبی بات نہیں ہو سکتی۔بہتر ہے،تم مجھ سے کہیں باہر ملو۔''وہ یک دم بالکل خاموش ہو گئی۔

یہ کال اگر غیر متوقع تھی تو یہ بات اس سے بھی بڑھ کر غیر متوقع۔

وہ اس کے سر پر ایک آسیب کی طرح تو پچھلے چھ سالوں سے مسلط تھا مگر گزرے چھ سات ماہ اس نے جتنی اذیت اور جتنی بے چینی میں گزارے تھے،ایسے میں اسے لگنے لگا تھا کہ یہ شخص کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

وہ شخص ولی صہیب خان جتنا چالاک اور گھمنڈی انسان تھا،ایسے میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس سے علیحدگی چاہتی ہو اور وہ اسے چھوڑ بھی دیتا۔وہ اس سارے مسئلے کو اپنی ناک اور انا کا مسئلہ بنا کر اسے ناکوں چنے چبوا سکتا تھا اور چبوا رہا تھا۔اس کے منہ سے Divrce (طلاق) کا لفظ سن کر وہ کتنی دیر تو بے یقینی سے ریسیور تھامے رہی۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''ٹھیک ہے کہاں ملنا ہے۔''اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کی مایوسی اور پژمردگی یک لخت ہی کچھ کم ہوئی ہے۔

وہ کیا بات کرنے والا تھا، یہ بعد کی بات تھی۔فی الحال تو یہی بہت غنیمت نظر آ رہا تھا کہ وہ اس معاملے پر بات کرنے کے لئے تیار ہے۔

اس کی جانب سے ولی صہیب خان تک خلع کا قانونی مطالبہ کب کا پہنچ چکا تھا مگر نجانے یہ مسئلہ کب تک لٹکا رہنا تھا۔اسے کورٹ، کچہری، وکیل، جرح، الزامات، جوابی الزامات ہر چیز سے الجھن اور کوفت محسوس ہو رہی تھی۔لوگوں کو تماشا دکھانے اور جگ ہنسائی کا کوئی فائدہ بھی تھا؟ لوگوں کو گفتگو کے لئے چٹخارے دار موضوع ہاتھ آ جائے،ہمدردی کے بہانے لوگ مزا لینے آئیں۔

اس کی پہلے ہی سے مشکل زندگی کو مشکل تر بنائیں۔کورٹ سے باہر،دنیا کو تماشا دکھائے بغیر اگر خوش اسلوبی سے یہ معاملہ طے ہو سکتا تھا تو اس سے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات اس کے لئے کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔وہ اسے یہ بتا کر کہ کہاں ملنا ہے اور کتنے بجے ملنا ہے،فون بند کر چکا تھا۔

ریسیور واپس رکھ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی۔لباس تبدیل کرتے وہ خود کو آنے والی صورتحال کے لئے تیار کرنے لگی۔

❁❁❁

مقررہ ٹائم پر وہ اس ریسٹورنٹ کے باہر اپنی گاڑی پارک کر رہی تھی جہاں اس نے اس سے ملنے کے لئے کہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ اسے سامنے ہی کی ایک میز پر بیٹھا نظر آ گیا۔ وہ اگر بالکل ٹھیک ٹائم پر وہاں آئی تھی تو وہ وقت سے پہلے وہاں موجود تھا۔

وہ اس کی میز کے سامنے آ کر رکی اور پھر مکمل خود اعتمادی کے ساتھ کرسی کھینچ کر اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

اس غیر ملکی ریسٹورنٹ میں کئی نوجوان جوڑے اردگرد کی میزوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ نئے سال کا پہلا دن ساتھ مناتے، مستقبل کے حسین خواب بنتے، عہد و پیماں اور وعدے کرتے، سرگوشیوں میں کچھ دلنشین باتیں کرتے۔

خود پر ترس کھانا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا مگر پھر بھی اپنے اردگرد ان محبت بھری سرگوشیوں میں مگن جوڑوں کو دیکھ کر اس کا دل نئے سرے سے آزردہ ہوا۔ ڈیڈی سے، اپنی تقدیر سے نئے سرے سے شکوے دل میں پیدا ہوئے۔

جس عمر میں لڑکیاں خواب دیکھنے اور خواب بننے شروع کرتی ہیں اس عمر میں کسی اور نے نہیں اس کے اپنے ڈیڈی نے اس مغرور اور متکبر انسان کو اس کے سر پر مسلط کر کے اسے خواب دیکھنے کے حق سے ہی محروم کر دیا تھا۔

اس کی اپنی بھی کوئی پسند، کوئی خواہش، کوئی خواب ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ بھی سوچے بغیر اس شخص کو اپنی بیٹی کی زندگی کا مالک بنا ڈالا تھا۔

یہاں اس میز پر اس سامنے والی کرسی پر معیز بیٹھا ہوتا، کسی فکر اور کسی اندیشے کے بغیر وہ اس سے باتیں کر رہی ہوتی۔ بے فکری سے ہنس رہی ہوتی، قہقہے لگا رہی ہوتی۔

کاش زندگی اتنی ہی آسان ہوتی، کاش زندگی اتنی ہی ہماری خواہشوں کے تابع ہوتی۔ سر جھٹک کر خود کو اس خود ترسی سے باہر نکالتے اس نے سامنے اکڑ کر بیٹھے اس مغرور گھمنڈی شخص کو دیکھا۔

ویٹر ان کی میز کی طرف آیا۔ اس سے اس کی مرضی پوچھے بغیر اس نے دو کپ کافی کا آرڈر کر دیا۔

وہ یہاں کچھ کھانے پینے اور دوستانہ گپ شپ کرنے آئی بھی نہیں تھی، وہ یہاں اپنی طلاق کی بات کرنے آئی تھی اور طلاق کبھی بھی دوستی اور محبت میں نہ تو دی جاتی ہے اور نہ لی جاتی ہے، اسی لئے جب کافی ان کے آگے سرو کر دی گئی وہ تب بھی اس سے لاتعلق ہی بیٹھی رہی۔

آرڈر ہونے اور کافی آ جانے کا وقفہ ان کے بیچ مکمل خاموشی میں گزرا تھا۔

وہ خود سے بات شروع کرنا نہیں چاہتی تھی، اس نے بلایا ہے، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو پھر جو وہ کہنا چاہتا ہے وہ اسے پہلے بغور سنے اور سمجھے گی، اس کے بعد کچھ بولے گی۔

وہ اس دوران بالکل خاموش اور اس سے بے نیاز و لاتعلق سا رہا تھا۔ کافی سرو ہو جانے کے بعد ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم Divorce (طلاق) چاہتی ہو۔“ یہ سوال یا تصدیق چاہنے والا فقرہ نہ تھا، یہ گویا کسی بات کا آغاز تھا۔ ”میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ ایک ڈرامائی سا وقفہ دے کر وہ اپنی کافی میں شکر ملانے لگا۔

سانس روک کر اس نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا، یہ تو جیسے کوئی خیال

وخواب کی بات تھی۔ایسے ظالم اور متکبر لوگ کتنے انا پرست اور خود سر ہوتے ہیں۔

وہ جانتی تھی خود چاہے وہ کسی بھی من پسند لڑکی سے جب دل کرتا شادی کر لیتا مگر اسے نجانے کب تک اپنے نام کے ساتھ لٹکا کر رکھنے والا تھا۔اتنے با اثر لوگوں سے براہ راست مقابلے کے لئے تجمل ماموں نے بہت اچھے وکیل کا بندوبست کیا تھا۔

وہ خلع کے لئے اس کی طرف سے بہت اچھے اور مضبوط دلائل دے گا مگر یہاں قانون، گواہ، جج، عدالتیں اور انصاف سب طاقتور ہی کو فائدہ پہنچاتے ہیں، جس کے پاس جتنی دولت ہے، جتنی طاقت ہے، جتنی حیثیت ہے، وہی اتنا کامیاب ہے۔

کون جانے ولی سے خلع کی صورت علیحدگی اسے کتنی خواری اٹھانے کے بعد اور خود پر، اپنے کردار پر کون کون سی تہمتیں لگوانے کے بعد کب جا کر نصیب ہو۔

"لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔ یوں سمجھ لو، میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل یا ایک اگریمنٹ کرنا چاہتا ہوں۔اگر تم میرے ساتھ یہ ڈیل یا اگریمنٹ کرنا چاہو تو میں تمہیں ہر طرح یقین دلانے کے لئے تیار ہوں کہ تمہیں تمہاری حسب خواہش آزادی کا پروانہ دے دوں گا، نہیں تو تمہارے مرضی ہے۔میں ظاہر ہے، تمہیں مجبور تو کروں گا نہیں۔"

اگر کوئی دھمکی اس کے لفظوں سے نہیں جھانک رہی تھی تو اس کی نگاہوں سے ضرور چھلک رہی تھی۔"میں کب تک تمہیں لٹکا کر رکھ سکتا ہوں۔میں کتنا تمہیں خوار و ذلیل کر سکتا ہوں۔یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کی نگاہوں کا یہ دھمکاتا تاثر وہ پہچان سکتی تھی۔

طاقت کے زعم میں اکڑتے اس خود پسند انسان سے وہ کتنی شدید نفرت کرتی ہے، نفرت کی ان گہرائیوں کو وہ کبھی ناپنا چاہتی تو ناپ نہ پاتی۔

"کیا ڈیل؟" ڈرے یا گھبرائے بغیر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ اٹھارہ سال کی فارہ بہروز خان نہیں تھی جو اپنے نکاح کے بعد کتنے مہینوں تک گھر سے نکلتے ہر بار یہ سوچ کر ڈر جایا کرتی تھی کہ کہیں با اثر خاندان سے تعلق رکھنے والا شوہر اسے اغواء نہ کروا لے، اسے زبردستی اٹھا کر نہ لے جائے۔وہ آج ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھی۔

اپنے دشمن کی طاقت کا اسے بالکل ٹھیک طرح اندازہ تھا مگر وہ اس طاقت سے ڈر کر بزدلوں کی طرح تھر تھر کانپ نہیں رہی تھی۔نہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور نہ اس کی آواز۔

"تمہیں تین مہینوں تک آغا جان کے پاس ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے، اگر آج تم میرے ساتھ چلو تو آج سے لے کر 31 مارچ تک تمہیں وہاں ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔اگر تم ایسا کرنے پر آمادہ ہو تو یکم اپریل کو جو تم چاہتی ہو وہ تمہیں مل جائے گا۔" بڑا پروفیشنل اور بزنس لائیک اسٹائل تھا ان جملوں کا۔گویا واقعی یہاں ایک کاروباری ڈیل طے پا رہی تھی۔

یہ بات اس کے لئے غیر متوقع تھی۔ڈیل کے لفظ پر وہ کچھ خاص چونکی نہیں تھی، اسے لگا تھا وہ اس سے کہے گا تم جائیداد میں اپنے سارے حق سے دستبردار ہو جاؤ، میں بدلے میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔

وہ نہ حسینۂ عالم تھی، نہ دنیا کی آخری لڑکی جس کے عشق میں وہ فنا ہو رہا ہو۔جتنے عرصہ سے طلاق اور خلع کی یہ کھینچا تانی ان دو گھرانوں کے

درمیان چل رہی تھی اگر کوئی غیرت مند مرد ہوتا تو کب کا اس لڑکی کو آزاد کر چکا ہوتا جو بالکل صاف اور واضح کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

فارہ اسے ناپسند کرتی ہے، فارہ کی ممی اسے ناپسند کرتی ہیں، اس کے باوجود وہ آج تک اس رشتے کو نبھانے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہے۔ اس نکاح کو زبردستی قائم رکھنے کی وجوہ میں سرفہرست یہی وجہ اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ ایک تو وہ اس کے علیحدگی کے مطالبے کو غیرت اور انا کا مسئلہ بنا بیٹھا ہے اور دوسرا وہ جائیداد کی تقسیم نہیں چاہتا جس جائیداد کا وہ تنہا وارث بنا ہوا تھا۔ فارہ سے شادی کی صورت میں وہ سب اس کے پاس رہتی اور علیحدگی کے نتیجے میں ظاہر ہے وہ فارہ کے حصے کا مالک تو نہیں بن سکتا تھا۔

اس کی ممی نے خلع کے ساتھ ساتھ آغا جان کی جائیداد میں فارہ کے حصے کا بھی مطالبہ کر رکھا تھا اور اسے ڈیل لفظ سے یہی شک ہوا تھا کہ وہ اس سے جائیداد سے دستبرداری کا مطالبہ کرے گا اور یہ سوچتے ہی وہ خود کو ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار بھی کر چکی تھی کہ آغا جان کی جائیداد میں وہ اپنے ہر حق سے دستبردار ہو جائے گی۔

دولت، جائیداد اس کا مطلوب و مقصود نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا۔

یہ ولی صہیب خان یا روحی بہروز خان کا مقصدِ حیات تو ہو سکتا تھا مگر فارہ بہروز خان کا ہرگز نہیں۔ ولی کتنا بھی گھٹیا، کم ظرف اور پست ذہنیت کا انسان تھا، اس سے اسے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اس اذیت ناک سوچ سے کہ اس کی اپنی ممی بھی دولت اور جائیداد کو اپنا ٹارگٹ اور گول بنا بیٹھی تھیں۔

چاہے آغا جان کو ہرانے کے لئے انہیں جھکانے اور شکست دینے کے ہی لئے مگر وہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ کر تو رہی تھیں۔

انا کی یہ ایک عجیب و غریب جنگ تھی ان کے اور آغا جان کے بیچ جس میں ہر خسارہ اور ہر نقصان اس کے حصے میں آ رہا تھا۔ ممی اور اس میں بنیادی اختلاف اور جھگڑے و کشیدگی کا سبب ان کا یہ مطالبہ ہی تھا۔ اس کے طلاق کے مطالبے کو گھمبیر و پیچیدہ اس دوسرے مطالبے ہی نے کر کے رکھ دیا تھا۔

لیکن اب یہ ولی ڈیل کا نام لینے کے بعد کہہ کچھ اور ہی رہا تھا۔ اس کی سوچ کے برعکس اور بہت مختلف۔

وہ اس کے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے، دھوکہ دہی اور مکاری پر مبنی یہ کوئی نیا آئیڈیل اس کے گھٹیا دماغ میں آیا ہے۔ وہ یہ سوچ رہی تھی اور وہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے اپنی بات کا ردِعمل اس کے چہرے پر پڑھنے میں محو تھا۔

''تم سچ بول رہے ہو، میں کیسے یقین کر لوں؟ میرے تین مہینے وہاں رہنے سے تمہیں یا آغا جان کو کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ اس ساری بات کا مقصد کیا ہے؟''

''تم مطلب اور مقصد کو چھوڑ دو۔ تمہیں وہاں جانا ہے۔ آغا جان کے ساتھ ایک بہت محبت کرنے والی پوتی بن کر رہنا ہے۔ اس دوران طلاق اور خلع کا ان کے سامنے نام بھی نہیں لینا۔ اگر تم ایسا کرنے پر راضی ہو تو میں آج سے ٹھیک تین مہینے بعد تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گا۔'' وہ اپنے مخصوص حاکمانہ اور مغرورانہ انداز میں فوراً بولا، دوٹوک اور مستحکم لہجے میں۔

''اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ فرسٹ اپریل کو میں فول نہیں بنائی جاؤں گی؟ تمہیں کیا میں اتنی احمق نظر آتی ہوں کہ تم زبانی مجھ سے کوئی

معاہدہ کرو گے اور میں اس پر احمقوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تمہارے پیچھے چل پڑوں گی؟" اس مغرورانداز پر دل میں شدید نفرت محسوس کرتے، وہ طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں بولی۔

"اتنی قابل اور عالم فاضل ڈاکٹر کو احمق سمجھنے کی غلطی میں کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ تمہاری قابلیت اور ذہانت کا میں پہلے ہی سے معترف ہوں۔ تب ہی تو جانتا تھا کہ یہ بات ہو گی اور تب ہی یہ ایک قانونی دستاویز تیار کروا کر لایا ہوا ہوں۔" اس کا لب و لہجہ سنجیدہ اور بالکل پروفیشنل تھا۔

بولنے کے دوران وہ میز پر رکھے سیاہ رنگ کے لیدر بریف کیس کو کھسکا کر اپنے سامنے کر کے اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے بریف کیس میں سے ہلکے پیلے رنگ کا ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اسے دیکھ لو، خواب اچھی طرح پڑھ لو، پڑھی لکھی اور خاصی ذہین لڑکی ہو، اتنا تو اسے ایک نظر دیکھ کر ہی جان لو گی کہ یہ میری طرف سے ایک عہد نامہ ہے اور اس کی قانونی حیثیت مسلم ہے۔ اس پر میرے دستخط کے علاوہ دو معتبر سینئر وکلاء کے دستخط بطور گواہ موجود ہیں۔

کوئی بھی معاہدہ یا Pact برابری کی سطح پر ہوتا ہے مگر ہمارے اس معاہدے میں اپر ہینڈ (Upper Hand) میں تمہیں دے رہا ہوں۔ آج سے ٹھیک تین ماہ بعد یکم اپریل کو فارہ بہروز کا ہر مطالبہ اسی کی طے کردہ شرائط پر پورا کرنے کا قانوناً پابند ہوں گا۔ چاہے وہ مطالبہ طلاق کا ہو، رخصتی سے قبل کے حق مہر، جائیداد میں حصے کا یا ان کے علاوہ کسی اور بھی چیز کا، جب ہر مطالبہ کہہ دیا تو وہ ایک سے زیادہ مطالبات بھی ہو سکتے ہیں۔

اول تو اس کی نوبت نہیں آئے گی لیکن اگر فرض کر لو کہ تین مہینوں بعد میں تمہارے مطالبات پورے کرنے کے وعدے سے مکر جاؤں تب تم اس تحریری شہادت کو ایک مضبوط دلیل اور ثبوت کے طور پر پاکستان بھر کی کسی بھی عدالت میں چلی جاؤ، فیصلہ تمہارے ہی حق میں ہو گا اور ویسے تم سمجھ سکتی ہو کہ ایسا میں چاہوں گا نہیں کہ اس میں میری ہتک ہے، اس لئے عدالت وغیرہ تک اسے لے جانے کی نوبت آئے گی نہیں۔ میں از خود ہی تمہارے تمام مطالبات پورے کر دوں گا۔ یہ کاغذ صرف تمہیں یقین دلانے کے لئے ہے۔"

اس نے ایک نظر اس کاغذ کو اور پھر ایک نظر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

اسے جائیداد میں اپنا حصہ یا دوسری کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں، وہ صرف اس سے طلاق چاہتی ہے، اسے کوئی غرض نہیں پڑی تھی جو اس شخص کو یہ وضاحتیں پیش کرتی، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ آغا جان کی جائیداد میں اپنا حصہ چاہتی ہے تو بے شک شوق سے سمجھتا رہے۔

وہ اکیلے میں ماں سے چاہے اس مسئلے پر جتنا بھی اختلاف کر لے مگر اس شخص کو تو یہ ہرگز بھی نہیں بتائے گی کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ اس کی ممی کا ہے، اس کا نہیں اور اس معاملے پر ان دونوں کے تعلقات میں خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

وہ اسے دولت، جائیداد کا طلب گار سمجھے تو سمجھتا رہے، خود کون سا مختلف ہے اور خود کے کونسی باپ کی دولت ہے جس دولت جائیداد کا قانونی مالک و وارث بنا بیٹھا ہے وہ جیسے اس کے دادا کی ہے، اسی طرح وہ فارہ بہروز خان کے بھی دادا ہی کی ہے۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے دیکھتا، اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔ یہ اس کا کوئی مکر ہو سکتا ہے، اس سب کے پیچھے اس کی کوئی گھناؤنی سازش، کوئی چال کارفرما ہو سکتی ہے اس کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ اس نکاح سے اتنی تنگ آ چکی تھی، اتنی شدید ذہنی الجھن اور اذیت کا شکار تھی کہ اسے ختم کرنے کے لئے تین مہینے کیا، چھ مہینے بھی آغا جان

کے پاس پشاور جا کر رہنے پر آمادہ ہو جاتی مگر یہ یقین تو ہوتا کہ اس سے سچ بولا جا رہا ہے اسے کسی نئی سازش یا دھوکے کا شکار نہیں بنایا جا رہا۔

وہ کس سے پوچھے، وہ کس سے مشورہ کرے اس کی زندگی کے فیصلے ہمیشہ دوسرے کرتے تھے، بات اس کی زندگی کی ہو رہی ہوتی تھی اور اس میں اس کے علاوہ باقی ہر کوئی بولا کرتا تھا۔ اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ وہ خود بھی کر سکتی ہے، شاید برسوں سے دوسروں کے فیصلے سنتے سنتے وہ یہ بھول ہی گئی تھی، تب ہی تو اس وقت جو فیصلہ کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو بری طرح الجھنے لگی۔

کشمکش اور الجھن کا شکار ہوتے اس نے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اس کے جواب کا ہنوز عجلت بھرے انداز میں منتظر تھا۔

''فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔'' اس کے کانوں میں اپنے ڈیڈی کی آواز گونجی۔

ان کی برسوں پرانی یہ نصیحت جو انہوں نے اسے اسکول اور پڑھائی سے متعلق کسی فوری اور اہم فیصلے کرنے کے وقت کی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی یہ نصیحت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر وہ اس کے حافظے سے کبھی نکلی بھی نہیں تھی اور اس وقت نجانے کیوں ان کی یہ نصیحت اسے اچانک یاد آ گئی تھی۔

شاید برسوں بعد یہ کوئی ایسا فیصلہ تھا جو وہ تنہا کرنے جا رہی تھی۔ اسے سمجھانے، مخلصانہ مشورہ دینے والا کوئی دوست، کوئی ہمدرد ان لمحوں میں ایسے میسر نہ تھا اور شاید یہ فیصلے کے اس مشکل لمحے کی تنہائی ہی کا احساس تھا جو اسے اپنے ڈیڈی کی برسوں پرانی یہ بات یوں ایک دم اور بالکل اچانک یاد دلا گیا تھا۔

''اکثر بہت اہم فیصلے ہمیں بہت عجلت میں اور فوراً کرنے پڑ جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی اہم فیصلہ درپیش ہو تو ہمارے دل اور دماغ میں جنگ سی چھڑ جاتی ہے۔ دل کچھ کہتا ہے اور دماغ کچھ اور۔ ایسے میں جو سب سے پہلی سوچ دل میں ابھرے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ دماغ انسان کو اندیشوں میں مبتلا کر کے بزدلانہ فیصلے کروانا چاہتا ہے جبکہ دل حوصلے اور جرأت کا سبق سکھاتا جو صحیح ہے وہ کرنے کو کہتا ہے۔'' ڈیڈی نے ان جملوں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔

''سمجھ لو کہ ہمارا دل ایک مشین ہے، اگر ہم نے اسے.....'' نجانے کیا کیا جو کچھ اسے یاد رہا'' کچھ بھول گئی، کچھ سمجھا، کچھ بالکل نہ سمجھ سکی۔ کم از کم تیرہ سال کی عمر میں تو ان جملوں کا ایک لفظ نہ سمجھ سکی تھی اور نہ ہی ان کا مقصد اور مطلب اس پر واضح ہوا تھا مگر آج یہاں فیصلے کے اس مشکل لمحے کا تنہا سامنا کرتے ہوئے اسے ڈیڈی کی یہ نصیحت اچانک ہی یاد آ گئی تھی اور بے ساختہ ہی وہ اس پر عمل بھی کرنے لگی تھی۔

اس کا دماغ اس مغرور خود پسند شخص پر بھروسہ کرنے سے انکاری ہے مگر اس کا دل...... وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے اپنے دل کی آواز سننے کی کوشش کی، اس سے مشورہ مانگنا چاہا۔

''تمہیں وہاں چلے جانا چاہئے۔'' اس کا دل اس سے یہی کہہ رہا تھا۔

دل کی آواز سنتے وہ سوچنے لگی کہ آغا جان کے پاس چلے جانے میں کوئی نقصان تو نہیں۔ ان سے اس کے تمام شکوے، شکایتیں، ناراضیاں اور گلے جائز اور ہر اعتبار سے بالکل درست ہیں۔ پر ہیں تو وہ اس کے سگے دادا ان کے پاس جانے پر آمادگی ظاہر کر دینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی

غلط جگہ جانے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔

وہ اچھے انسان نہیں۔ جانتی ہے وہ ظالم، جابر، مطلق العنان اور نہایت متکبر شخص ہیں۔ یہ بھی اس کے علم میں ہے، اس سے جس محبت کا وہ دم بھرتے ہیں، وہ خود پرستی و انا پرستی کے سوا کچھ نہیں۔ جو بیٹے کی موت کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکت کر سکتا ہے، وہ بہو کو نیچا دکھانے اور ذلیل و بے عزت کرنے کے لئے پوتی سے محبت و چاہت کے ہتھیار استعمال کر کے اسے ماں کے خلاف اکسانے کی حرکت کیوں نہیں کر سکتا؟

چلو مان لیا۔ آغا جان یہ موجودہ ڈرامہ، یہ سب معاہدہ وعاہدہ کا کھیل محض ممی کو نیچا دکھانے کے لئے کر رہے ہیں یا ان کا دست راست ولی ان سے ایسا کروا رہا ہے۔

"تم طلاق اور خلع کا شور مچا رہی ہو اور میری پوتی تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ بخوشی میرے پاس میرے گھر آ کر رہ رہی ہے۔"

ان کی انا ممی کے مقابل یہ سب کچھ کہہ کر بہت خوش ہو گی اور پھر بہت فیاضی دکھاتے وہ پوتی ہی کی محبت میں، اس کی خواہش کا احترام کرتے، اعلیٰ ظرفی و محبت کا ثبوت فراہم کرتے اپنے پوتے سے اس کی جان بخشی کروا کر اپنی انا کو مزید او نچائی پر پہنچا دیں گے۔

لیکن اس سارے ڈرامے سے یہ تو بہر حال ہو گا کہ ولی صہیب خان سے اس کی جان بخشی واقعی ہو جائے گی۔ ولی اس کے پاس آغا جان کی اجازت سے یہ پلان لے کر آیا ہے یا یہ اس کے اپنے سازشی ذہن کی کرشمہ ساز سوچ ہے، وہ نہیں جانتی تھی لیکن یہ ضرور جانتی تھی کہ ممی اور آغا جان کے بیچ جو یہ عجیب وغریب اور تکلیف دہ انا کی جنگ چھ برسوں سے چھڑی ہے اور جس میں وہ دونوں ہی اسے اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، وہ اس سے بری طرح عاجز ہے، تنگ آ چکی ہے، تھک چکی ہے۔

اور ان چھ سالوں میں سے جو پچھلے چھ سات مہینے گزرے ہیں، وہ تو اذیب اور تکلیف میں گزشتہ ہر اذیت سے بڑھ کر ثابت ہوئے ہیں۔

چھ سات مہینوں سے جو اذیت وہ سہہ رہی ہے، جس درد اور جس کرب سے وہ گزر رہی ہے، وہ نا قابل بیان حد تک تکلیف دہ، سخت اور کڑی ہے۔

اس کا اٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا پینا، سکون، چین آرام سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہے۔

ممی تو محض پندرہ روز پہلے اسے چھوڑ کر گئی ہیں مگر ان کے جانے سے قبل بھی اس کی زندگی اسی بے سکونی اور بے اطمینانی میں گزر رہی تھی۔ وہ رات سوتی تو اول تو نیند ہی نہیں آتی اور اگر آ جائے تو کئی اذیت بھرے احساس لئے اس کی آنکھیں بند ہوتیں۔ صبح جاگتی تو نئے دن کی کوئی خوشگواری نہیں بلکہ مستقبل کے اندیشے و تفکرات اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

چھ سال پہلے اس کی زندگی کا فیصلہ کچھ لوگوں نے اس سے اس کی مرضی پوچھنے کی زحمت کئے بغیر کر دیا تھا اور آج بھی اس کی زندگی کا فیصلہ کچھ دوسرے لوگ ہی اپنی اپنی اناؤں کو سر بلند رکھنے کی کوشش کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ دوسروں کے ہاتھوں میں کیوں ہے؟

اسے ولی صہیب خان سے آزادی چاہئے، کسی بھی قیمت پر۔ چاہے ممی کی انا سرخرو ہو یا آغا جان کی، اسے مطلق پروا نہیں۔ جب وہ دونوں اپنے اپنے مفادات کے لئے اسے بے جان شے کی طرح استعمال کر سکتے ہیں تو وہ کیوں کسی کی پروا کرے۔

دماغ کی تمام تاویلوں، اندیشوں، تفکرات، تحفظات اور ڈراووں کو اس نے آناً فاناً مسترد کر کے اپنے سامنے رکھا وہ کاغذ اٹھالیا۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔''

وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسے مڑ کر پیچھے دیکھنا تھا نہ کچھ سوچنا تھا۔

ولی چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر فوراً ہی ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کرتا کرسی پر سے اٹھ گیا۔ کپ میں اس نے شکر ملائی ضرور تھی، پر کافی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔

''تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم گھر پر سے اپنا جو سامان لینا چاہتی ہو، ایک گھنٹہ کے اندر لے لو۔'' اسی بے تاثر سے سنجیدہ انداز میں اس نے اسے معاہدہ کی اہم ترین شق سے آگاہ کیا۔

اس کے چہرے سے کوئی بھی تاثر پڑھنا ناممکن تھا۔ وہ فارہ کی آمادگی پر خوش ہے، اپنی چالاکی پر نازاں و مغرور ہے۔ اس کے چہرے سے اس کی کوئی بھی اندرونی کیفیت بالکل ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر آ گئی اور وہ اس کے پیچھے اپنی گاڑی میں جسے ایک درمیانی عمر کا آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہ باہر گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ اندر تیز رفتاری سے اپنا ضروری سامان بیگوں اور سوٹ کیس میں ٹھونس رہی تھی۔ اس کام کے دوران مسلسل اس کے ذہن میں جو ٹینشن سوار تھی، وہ ممی کو فون کرنے کی تھی۔ پندرہ دن پہلے جب وہ گئی ہی اس سے شدید ناراض ہو کر تھیں تو وہاں پہنچ کر یا بعد میں بھی اسے فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رہ گئی فارہ خود تو اسے پہلے یقین تو آ جاتا کہ اس کی ماں اسے بالکل بے سہارا و تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے، تب وہ انہیں فون کرنے اور ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے کا سوچتی تھی۔

ہاں ان کے ٹورنٹو پہنچنے کے بعد اس کی خالہ کا فوراً ہی فون ضرور آیا تھا، اسے ممی کی بخیریت آمد کی اطلاع دینے نہیں بلکہ ماں کی نافرمانی اور اس کا دل دکھانے پر خوب سخت سست سنانے۔ وہ انہیں بڑا جان کر چپ چاپ ان کی ساری پھٹکار خاموشی سے سن لیتی۔ اگر وہ اس ساری گفتگو میں اس کے ڈیڈی کا ذکر نہ لاتیں۔

''صحیح کہتے ہیں لوگ جس شخص سے کوئی خوشی، کوئی فیض نہ پہنچا ہو تو اس کی اولاد سے کسی فیض، کسی بھلائی کی توقع کوئی کیسے رکھے۔ جب تمہارے باپ نے میری بہن کو کوئی سکھ اور خوشی نہ دی تو تم بھی تو اسی کی اولاد ہو۔''

تب وہ خاموش نہ رہ پائی تھی۔

کوئی اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو کچھ کہے اور وہ خاموشی سے سن لے؟ وہ ایسی بیٹی نہ تھی، یہ ممی کی دی ہوئی شہ تھی کہ خالہ، ماموں، ممانی جس کا جو جی چاہے اس کے ڈیڈی کو کہہ دے مگر وہ ممی ہوں گی جو شوہر کے متعلق کوئی بھی بات اطمینان سے سن لیا کرتی ہوں گی۔ فارہ کو اپنے ڈیڈی سے چاہے بہت سی شکایتیں ہوں مگر وہ کسی دوسرے کو یہ اجازت نہ دے سکتی تھی کہ وہ اس کے مرحوم باپ کی توہین کرے۔ اس نے پھر جواب میں خالہ کی اس بات کا خاصا سخت جواب دے کر ریسیور بہت زور سے کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔

اس روز کے بعد اس کا ٹورنٹو کوئی رابطہ نہ ہوا تھا اور اب اس وقت اسے وہاں فون کرنا تھا۔ اس نے اپنے موبائل سے ممی کا موبائل نمبر ملایا۔ وہ خالہ یا کسی کزن سے نہیں ممی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے، یہ وہ انہیں خود بتانا چاہتی تھی مگر ممی نے اس کا نمبر دیکھ کر خود کال ریسیو نہ کی تھی، ان کے بجائے کال نورین خالہ ہی نے ریسیو کی تھی۔

''وہ سو رہی ہے۔'' یقیناً وہ اس کی آواز سننے کی بھی روادار نہ تھیں مگر خالہ کو شاید یہ بات اسے بتاتے آج کچھ رواداری آڑے آ ہی گئی تھی، تب ہی مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لیا گیا تھا۔

''آپ انہیں یہ بتا دیجئے گا کہ فارہ اپنے دادا کے پاس پشاور جا رہی ہے اور اب دو تین مہینے وہیں رہے گی۔ وہ اگر اس دوران مجھ سے رابطہ کرنا چاہیں تو وہیں کریں۔'' ماں کے اس رویے پر اس کی آنکھیں یک دم ہی بھر آئی تھیں اور لہجہ بھی بھرآنے لگا تھا۔

اس کی ماں کو اپنی اکلوتی اولاد سے بڑھ کر اپنی انا کیوں عزیز ہے۔ وہ اسے سمجھتی کیوں نہیں۔ اس کی ماں ایسی کیوں ہے۔ ساری دنیا میں واحد رشتہ ایک ماں اور وہ اتنی بدظن، اتنی دور، اس قدر بدگمان، اس درجہ اجنبی۔

اس کی ماں ایسی نہیں تھی، وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ اسے ایسا کس نے بنایا، وہ انسان جس کے پاس وہ آج جا رہی ہے۔ چند منٹ لگے تھے اسے اذیت و تکلیف دیتے ہوئے ہر احساس سے باہر نکلنے میں۔

بے دردی سے آنکھیں رگڑ کر صاف کرتی وہ بہت تیز رفتاری سے سارا گھر جلدی جلدی لاک کرنے لگی۔

ایک اداسی بھری نگاہ اپنے گھر کے خالی در و دیوار پر ڈالتی وہ گیٹ سے باہر نکلی۔ گیٹ کو تالا لگایا اور پھر پاس زمین پر رکھے سوٹ کیس اور دونوں بیگز اٹھا کر مستحکم اور فیصلہ کن انداز میں اعتماد کے ساتھ چلتی اس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی جس میں ولی صہیب خان سکون سے بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

✿✿✿

وہ آج زندگی میں تیسری بار اس عالیشان گھر میں آئی تھی، پہلی بار وہ دل میں خوف و ہراس لئے یہاں آئی تھی اور دوسری بار غموں کا بھی نہ ختم ہونے والا احساس لئے درد، غم اور آنسو لئے۔

ڈیڈی کی میت کو ساتھ لئے اسے اپنا دوسری بار کا یہاں آنا یک بارگی یاد آنے لگا۔ اسے ڈیڈی یاد آنے لگے۔ آج ڈیڈی کیوں نہیں۔ وہ ہوتے تو وہ یوں تنہا تو نہ ہوتی پھر ممی بھی اب جیسی نہ ہوتیں اور پھر اس کی زندگی بھی بالکل مختلف ہوتی۔

یا اس کی آنکھیں رونا بھول گئی تھیں یا ایک ہی دن میں آج دوسری بار اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی تھی۔ خود کو سرزنش کرتے اس نے فوراً ہی اپنی کمزوری پر قابو پایا۔

اجنبیوں کے سامنے رونا، آنسو بہانا، اپنی کمزوری دکھانا، یہ اس کی سرشت میں نہ تھا اور اس وقت وہ ایک اجنبی ہی کے ساتھ تھی۔ دو سگے بھائیوں کی اولادیں ہونے کا جو رشتہ اس کے ساتھ ہے، اسے وہ اہم سمجھتی نہیں اور دوسرا جو نام نہاد کاغذی رشتہ ہے، اسے وہ مانتی نہیں اور جب وہ کسی بھی رشتے کو نہ اہم سمجھتی ہے نہ سرے سے مانتی ہے تو برابر کھڑا یہ شخص اجنبی ہی ہوا نا۔

جس طرح ان دونوں نے سارا سفر خاموشی سے طے کیا تھا، اسی طرح وہ دونوں طویل روش بھی خاموشی سے عبور کرتے گھر کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

یہ گھر کتنا بڑا، کتنا عالیشان اور محل نما ہے۔ وہ یہاں پہلی بار نہ آئی تھی جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تعجب سے بلند چھتوں، بیش قیمت لکڑی کے منقش دروازوں، کھڑکیوں، قیمتی فانوسوں، فرنیچر، قالین اور دیگر نایاب اشیاء کو دیکھتی۔ وہ ان سب چیزوں پر بے نیازی سے بھری اچٹتی نگاہ تک ڈالے بغیر سر اٹھا کر بالکل سیدھ میں دیکھتی اس طرف چلتی رہی، جہاں وہ جا رہا تھا۔

ولی نے ایک کمرے کے آگے رک کر اس کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اسے آنے کا اشارہ کرتا وہ اندر داخل ہوا۔ وہ اس سے ایک قدم کا فاصلہ رکھتی اس کمرے میں داخل ہوئی۔

چھ سالوں میں یہ کمرہ اور اس کا منظر کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ سامنے وہ عالیشان بیڈ اسی طرح رکھا تھا اور اس پر وہ پرغرور شخصیت اسی طرح لیٹی تھی۔

چھ برس قبل بھی وہ یہاں اس بیڈ پر اسی طرح لیٹے تھے، بس فرق صرف اتنا تھا کہ تب ان کے پیروں کے قریب، پیر دباتے اس کے ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی بیٹی اور بیوی سے بالکل لاتعلق، صرف آغا جان کے بیٹے بنے ہوئے۔

اور پھر یہیں اس کمرے میں اس بستر لیٹی اس شخصیت ہی نے ایک جابرانہ اور حاکمانہ فیصلہ فارہ بہروز خان کی زندگی کا کیا تھا، اسے اس کے ڈیڈی سے منوایا تھا اور ڈیڈی کے ذریعے وہ فیصلہ اس پر مسلط کروایا تھا۔

وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ واقعی کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ ڈیڈی کی اجنبیت، ان کی دوری، ممی کا غم وغصہ اور اپنی سراسیمگی، خوف، بے اختیاری و بے بسی اسے سب کچھ یاد تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے اور ان کے بیڈ کے بالکل پاس ہی کرسی ڈالے زرینہ صہیب خان بیٹھی تھی۔ دروازہ بے آواز کھولا گیا مگر پھر بھی اس نے نجانے کس احساس کے تحت گردن گھما کر دیکھا اس کی نظریں بھائی پر شاید پل بھر کو ٹھہری تھیں، اس کے بعد وہ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔

اسے دیکھ کر ان نگاہوں میں حیرت تو ابھری تھی مگر تنفر بھری۔ نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھی، نہ ہی کچھ کہا۔ وہ بس نفرت بھری نگاہوں سے فارہ کو دیکھتی رہی۔ وہ ولی کے ساتھ چلتی بیڈ کے قریب آ گئی۔

ولی نے آغا جان کو بغور دیکھتے زرینہ سے اشارے میں پوچھا کہ آیا وہ سو رہے ہیں یا یونہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کے جواب سے قبل ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ شاید ان کی حسیات بہت تیز تھیں۔ تب ہی بغیر کسی آواز کے بھی انہیں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ولی کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی اور انہوں نے اسے فوراً ہی دیکھ لیا تھا۔

"فارہ...... فارہ آئی ہے...... ولی! یہ تمہارے ساتھ فارہ ہی ہے نا...... یا میں......" ان کے لبوں سے بڑی نحیف اور کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

ان کی آنکھیں حیرت، بے یقینی اور خوشی کا تاثر ایک ساتھ ظاہر کر رہی تھیں اسے حیرت اور بے یقینی سے دیکھتے وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش

کرنے لگے۔ ولی نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیٹھنے میں انہیں مدد دی۔ ان کی کمر کے پیچھے تکیے اور کشن ٹیک کے لئے رکھ دیئے۔

''تم کیسے آ گئیں بیٹا! کس کے ساتھ آ ئیں؟ کیا روحی بھی آئی ہے؟ فارہ بہت گہری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

ان کی حیرت کتنی سچی ہے، وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ یعنی اسے یہاں بلا کر ممی کو شکست دینے کا یہ منفرد آئیڈیا آغا جان کا نہیں، ولی کا اپنا ایجاد کردہ تھا اور وہ اس سے بالکل بھی آگاہ نہیں تھے۔

دادا کی جائیداد کے والی وارث اور سیاہ وسفید کے مالک نے غالباً انہیں جیت کی خوشی فراہم کرنے کو یہ سارا پروگرام ومنصوبے بنائے تھے۔ یہ بھانپ لینے کے بعد کہ چاہے وہ کتنا بھی عرصہ اسے اپنے نام کے ساتھ لٹکا کر رکھ لے، اسے اپنے ساتھ رہنے پر تو کبھی آمادہ نہ کر پائے گا۔ تو کیوں نہ اس سارے معاملے کو کچھ اس انداز سے انجام تک پہنچایا جائے جس میں آغا جان کی اخلاقی فتح اور اس کی ممی کی شکست کا تاثر بھرپور انداز میں اجاگر ہو کر سامنے آئے۔

اسے چہرے پڑھ لینے کا کوئی بہت زیادہ دعویٰ تو نہیں تھا لیکن یہاں قدم رکھتے ہی زرمینہ اور آغا جان کے بے تحاشا حیرت لئے چہروں نے اسے یہ اچھی طرح بتا دیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی آمد سے آگاہ و واقف نہیں تھا آغا جان اس کی سوچ اور اس کی نگاہوں سے انجان اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔

''وہاں کیوں کھڑی ہو میری جان! ادھر آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ میں یقین تو کر لوں میری فارہ میرے پاس آئی ہے۔'' ان کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑی والہانہ خوشی چھلک رہی تھی۔ یوں جیسے ان کا بس نہیں چل رہا خود اٹھ کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آ جائیں اور اسے اپنے گلے سے لگا لیں۔

پوتی کو اپنے پاس دیکھ کر بکھرتی یہ بے تحاشا خوشی اپنی جیت کی تھی یا بہو کو شکست دے دینے کی یا ان دونوں کی؟ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ ایک پل کچھ سوچا پھر وہ ان کے قریب آ گئی۔

زرمینہ اس دوران کمرے سے نکل کر جا چکی تھی اور اب اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ وہاں بیٹھنے لگی، تب وہ بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو، میں اپنی بیٹی کو جی بھر کر دیکھنا اور پیار کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے انداز میں ان کے بیڈ پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

وہ اپنے جھریوں زدہ کانپتے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

''یہ ولی لایا ہے نا تمہیں؟ بڑا بدتمیز ہے یہ لڑکا۔ مجھے بتا کر بھی نہیں گیا کہ میں فارہ کو لینے جا رہا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو سفر میں تھک گئی ہو گی۔''

وہ اس سے محبت کرتے ہیں، وہ جانتی تھی۔ ہاں ان کی محبت کا اپنا ایک الگ انداز تھا۔ وہ جن سے محبت کیا کرتے تھے، ان کی زندگی بھی خود جینے کی کوشش کرتے تھے، انہیں ان کی زندگی کا ایک پل، ایک گھڑی اور ایک ساعت بھی اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے جینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

جس سے محمد بختیار خان محبت کا دعویٰ کرتے تھے، ان کی آتی جاتی سانسیں بھی ان کی مرضی کے تابع ہوا کرتی تھیں۔ اگر دوسروں پر اپنے من چاہے فیصلے مسلط کرنے کا نام محبت ہے تو وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ اگر بے تحاشا پیسہ اور دولت لٹانے کا نام محبت ہے تو وہ اس محبت کرتے تھے

اور اگر دوسروں کی پوری زندگی خود جی لینے کا نام محبت ہے تو وہ اس سے محبت کرتے تھے۔

وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی پیہم خاموشی ماحول کو بہت اکورڈ بنا رہی ہے، وہ جانتی تھی وہ جب یہاں آ گئی ہے تو اب اسے کچھ بولنا بھی ہے۔ ان گزرے چھ سالوں میں ہر دو تین مہینے بعد جب بھی وہ اسے ایک مختصر سی فون کال کرتے تھے، تب وہ ان سے باادب لہجے میں پر تکلف اور رسمی سی باتیں کر لیا کرتی تھی۔

باتیں کیا کرتی تھی جو وہ پوچھتے تھے، اس کا جواب دے دیا کرتی تھی۔

جتنی شدید نوعیت کا جنگ و جدل سے بھرپور ماحول ان دو گھرانوں کے بیچ بالکل اعلانیہ اور کھلم کھلا پچھلے چھ سات ماہ سے چل رہا تھا۔ اس میں اس کی آمد کوئی عام سی اور روٹین کی بات نہ تھی۔

وہ اس کی آمد کا سبب نہیں پوچھ رہے تھے۔ ''اسے اس کی ممی نے یہاں کیونکر آنے کی اجازت دے دی؟'' جیسا بنیادی اور اہم ترین سوال بھی نہیں۔ وہ جیسے اسے دیکھ کر ہی بہت خوش ہو گئے تھے۔ ان کے جملے یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ یہ سمجھ رہے ہی کہ وہ ان کی بیمار کا سن کر بھاگی بھاگی ولی کے ساتھ آ گئی ہے۔

وہ بیمار ہیں، یہ ان کا کمزور نحیف وجود بستر پر دراز دیکھ کر ہی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ چھ سال پہلے اسی گھر کے اسی کمرے میں جب زندگی میں پہلی بار ان سے ملی تھی، وہ تب بھی بیمار ہی تھے۔ وہ تب بھی یونہی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تھے۔ اس نے ان سے ان کی طبیعت کی خرابی کا سرسری تذکرہ گزرے برسوں میں کئی بار سنا تھا۔

ولی انہیں ٹیک دلوا کر بٹھانے کے بعد سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کا چہرہ اور نگاہیں جو سفر کے دوران تمام وقت بالکل بے تاثر رہے تھے، اب آغا جان کی سمت مرکوز اتنے بے تاثر نہیں رہے تھے۔ اسے یکسر فراموش کئے وہ یک ٹک آغا جان کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اسے بولنے کے لئے یہی مناسب لگا کہ ان کی طبیعت پوچھ لے۔

''طبیعت ٹھیک ہے بیٹا! اس عمر میں چھوٹی موٹی تکلیفیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے کے بچے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں تو ہماری تو اب عمر ہے۔ کبھی آنکھ دکھ رہی ہے تو کبھی داڑھ ہل رہی ہے، کبھی گھٹنے جواب دے جاتے ہیں تو کبھی دل، گردے، جگر شرارتوں پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپا نام ہی بیماریوں کا ہے۔'' اس کے چہرے کو محبت سے تکتے ہوئے انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

اس کی نظریں ان کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی فریم شدہ تصویر پر جم گئی تھیں۔ چھ سال قبل پہلی بار جب وہ اس کمرے میں آئی تھی، تب یہ تصویر یہاں موجود نہیں تھی، اس لئے کہ تصویر کھینچی ہی اس دن گئی تھی۔

خوفزدہ ہراساں نظریں جھکا کر زبردستی کی دلہن بنا کر بٹھائی گئی وہ خود اس کے برابر میں جینز ٹی شرٹ میں ملبوس زبردستی کا دولہا، دولہا کے برابر دولہا کے کندھے کے گرد محبت سے بازو پھیلائے اداسی بھری مسکان چہرے پر سجائے اس کے ڈیڈی اور دلہن کے برابر میں بیمار کمزور اور لاغر سے آغا جان۔

آغا جان کے برابر سنگل صوفے پر بہت ناراض، بہت خفا، بہت غصے میں اس کی ممی اور ڈیڈی کے برابر کے سنگل صوفے پر آنکھوں میں

ڈھیر سارے آنسو لئے زرینہ.....اس تصویر کے ساتھ ایسی کوئی بھی تو خوشگوار یاد نہ جڑی تھی جسے یاد کر کے وہ خوش ہو پاتی۔

وہاں چھ اور تصاویر بھی تھیں۔وہ ایک دیوار پر آویزاں اور دو ایک یہاں وہاں مختلف جگہوں پر سجی۔

آغا جان کی اس کی دادی، اس کے ڈیڈی اور اس کے چچا صہیب خان کے ساتھ ان کی جوانی کے دنوں کی تصویر۔

آغا جان اور اس کی دادی بہت ینگ اور ڈیڈی اور صہیب خان چھوٹے چھوٹے بچے۔

اس کے ڈیڈی کے کنووکیشن کے دن کی سیاہ روب اور ڈگری ہاتھ میں لئے تصویر اور صہیب خان کی کالج یا یونیورسٹی میں کوئی میڈل وصول کرتے وقت کی تصویر۔وہاں ولی اور زرینہ کی ان کے والدین کے ساتھ بچپن کی ایک تصویر رکھی نظر آ رہی تھی۔

تصاویر سے نگاہیں ہٹا کر وہ دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی جو اسے پیر اوپر کر کے آرام سے بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔وہ کمبل پیروں پر ڈال لے، اسے سردی تو نہیں لگ رہی۔

وہ لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز پشاور آئی تھی، تب بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں سفر سے تھک نہ گئی ہو۔یوں جیسے اس نے لاہور سے پشاور تک کا راستہ پیدل طے کیا ہو۔

کسی جسمانی تھکن کا تو خیر اسے کیا شکار ہونا تھا۔ہاں اعصابی،نفسیاتی اور ذہنی طور پر وہ کافی تھکی ہوئی تھی اور دباؤ میں بھی تھی۔

جس جگہ وہ آ گئی تھی، وہاں آنا کوئی عام بات نہ تھی۔لاکھ وہ خود کو پر اعتماد اور بہادر ظاہر کر رہی تھی مگر اندر سے کچھ نروس تو تھی۔

"تم آکر فریش بھی ہوئیں یا یہ ولی تمہیں اٹھا کر سیدھا میرے پاس لے آیا؟ یہ زرینہ کہاں ہے؟ کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔اس سے کہو، صدو سے کھانا لگوائے۔"

وہ خاصے خوش اور پر جوش سے نظر آ رہے تھے۔یوں جیسے کوئی بہت خاص الخاص اور غیر معمولی اہمیت کا حامل مہمان ان کے گھر آ گیا تھا اور ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ اس کی کس طرح خاطر مدارت کریں۔

"کھانا لگواؤ بیٹا! اور صدو سے پوچھو، کچھ ڈھنگ کی چیز اس نے پکائی بھی ہے کہ نہیں، میری بیٹی آئی ہے۔اس کے شایان شان نہایت شاندار ڈنر ہونا چاہئے۔"

ولی، زرینہ کو بلا کر لے آیا تھا اور یہ تمام کلام اسی سے ہو رہا تھا۔

"آپ ڈائننگ روم تک جانے میں تھک جائیں گے آغا جان! میں کھانا یہیں لگوا دوں؟" زرینہ، بیٹی اور شایان شان ڈنر دونوں کے ذکر کو مکمل نظر انداز کرتی صرف کھانا لگوانے کی بات کے جواب میں بولی۔

فارہ، آغا جان کے بالکل برابر میں بیٹھی تھی مگر وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے وہاں آغا جان کے علاوہ اگر کوئی ہے تو اسے نظر نہیں آ رہا۔

"لگوا لو لیکن پھر سب کا یہیں لگواؤ۔میں آج اپنے بچوں کے ساتھ کھانا کھانا چاہتا ہوں۔میرے تینوں پوتی، پوتا میرے دائیں بائیں موجود ہوں۔ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ایک پرفیکٹ فیملی ڈنر۔"

تھوڑی ہی دیر میں ان کے کمرے میں صوفے کے سامنے رکھی لکڑی کی خوبصورت میز پر تمام کھانا چن دیا گیا تھا۔ وہ بیڈ سے ولی کی مدد کے سہارے اٹھے اور انہیں صوفے تک بھی کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ چلاتا وہی لایا۔ آج تو وہ سہارے سے چل رہے تھے اس نے جب زندگی میں پہلی بار انہیں دیکھا تب وہ وہیل چیئر پر بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے تھے۔ بیٹھنے کے بعد انہوں نے فارہ کو ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا۔

"وہ دونوں شریر کہاں ہیں؟" آغا جان ابھی زرینہ سے پوچھ ہی رہے تھے کہ ولی جو چند سیکنڈ قبل ہی کمرے سے باہر گیا تھا، واپس آ گیا۔ اپنی گود میں دائیں بائیں دو خوبصورت بچوں کو اٹھائے ہوئے انہیں گدگدا کر ہنساتا اور کچھ بولتے ہوئے۔

زرینہ کے غصے بھرے خوب پھولے ہوئے منہ پر اس منظر کو دیکھ کر لحظہ بھر کو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔ زیادہ حیران ہونے یا سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ یقیناً زرینہ کے بچے تھے۔

تقریباً پانچ برس قبل اس کی شادی کا بلاوا جو آغا جان نے فون پر دیا تھا اور ولی کے ہاتھ شادی کا کارڈ معہ لاہور سے پشاور ریٹرن ہوائی ٹکٹ کے بھجوایا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا۔

"زرینہ کی شادی ہے، میں ولی کے ہاتھ کارڈ اور تمہارا اور روحی کا جہاز کا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ تم لوگ آؤ گے تم مجھے اور زرینہ کو بہت خوشی ہوگی۔"

شادی میں تو خیر ان لوگوں کا کیا جانا تھا لیکن وہ بلاوا اسے یاد تھا اور تب کا اپنا افسوس بھی۔ ولی سے چار سال چھوٹی اور اپنی ہی ہم عمر لڑکی چاہے اس کا اس سے کوئی تعلق تھا یا نہیں لیکن اتنی کم سنی کی اس کی شادی پر اسے بہت افسوس ضرور ہوا تھا۔

پتہ نہیں بے چاری کو کچھ پڑھنے لکھنے بھی دیا تھا آغا جان نے کہ نہیں۔ تب غالباً فارہ کے میڈیکل کے پہلے سال کا اختتام چل رہا تھا اور اتنا تو طے تھا کہ اگر اسے بھولے بھٹکے اسکول کالج کی شکل دیکھنے کی آغا جان نے اجازت دے دی تھی، تب بھی وہ اس وقت تک گریجویٹ تو ہرگز نہیں ہوئی ہوگی۔

اس خاندان میں عورتوں کو دبا کر اور محکوم بنا کر رکھنے کی روایت تھی۔ یہاں مردوں کو حاکمیت حاصل تھی۔ فیصلے وہ کریں گے اور عورتیں، بیوی، بیٹی، بہن اور پوتی وغیرہ وغیرہ کے مختلف حیثیتوں میں سر جھکا کر بغیر اف کئے انہیں قبول کریں گی۔

اس خاندان میں بچپن کی منگنیوں اور نکاح و شادیوں کا بہت رواج تھا۔ اس کے ڈیڈی کی بھی ایسی ہی بچپن میں منگنی کی گئی تھی جسے توڑنا بعد میں ان کا جرم بنا تھا۔ زرینہ کی شادی کی اطلاع دیتے ہوئے آغا جان نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی منگنی کچھ سال قبل اس کے والدین کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔ اٹھارہ، ساڑھے اٹھارہ سال کی لڑکی کی اگر چند برس قبل بھی منگنی ہوئی ہوگی تو بھلا اس وقت کیا عمر رہی ہوگی اس کی؟ اور خود اس کا نکاح...... سترہ اٹھارہ سال کی عمر منگنیوں، نکاحوں اور شادیوں کی کوئی مناسب عمر تو نہیں ہوتی۔

ولی ان دونوں بچوں کو گود میں لئے آغا جان کے برابر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں بچوں کی عمروں کا زیادہ درست اندازہ وہ لگا نہیں سکی۔ دیکھنے میں لڑکی ذرا زیادہ صحت مند اور بڑی نظر آ رہی تھی۔ شاید ساڑھے تین چار سال کی اور لڑکا نسبتاً کچھ کمزور، دبلا اور چھوٹا لگ رہا تھا۔ زرینہ ابھی تک بیٹھی نہیں تھی۔

ولی صوفے کے کونے پر بیٹھا تھا۔اس کے برابر آغا جان تھے اوران کے برابر فارہ۔صوفے پر جو واحد جگہ بچی تھی وہ فارہ کے برابر تھی اور وہ لڑکی اس سے اتنا بغض وعناد تو رکھتی ہی تھی کہ اس کے برابر میں نہ بیٹھ سکے۔وہ مڑ کر بیڈ کے پاس سے اپنے لئے کرسی اٹھالائی اور اس کرسی کو میز کے سامنے رکھ کر اس پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل چاہا، وہ اسے بتادے کہ زیادہ فکر مت کرو، میں کسی طویل قیام وطعام کے لئے یہاں ہرگز نہیں آئی جیسے تم مجھ سے بے زار ہو، ایسے ہی میں بھی تم لوگوں سے بے زار ہوں۔ویسے نفرت وعداوت اپنی جگہ اس لڑکی نے خود کو دو بچوں کے بعد بھی مین ٹین بہت اچھی طرح کر کے رکھا ہوا تھا۔

وہ اتنی دبلی پتلی اور نازک سی تھی جیسے فارہ۔نیلے رنگ کی کڑھائی والے شلوار قمیص کے ساتھ سر پر دوپٹہ لئے وہ اتنی ہی فریش، ینگ اور سمارٹ لگ رہی تھی جتنی کوئی بھی غیر شادی شدہ لڑکی۔اگر اس میں موجود خاندانی غرور وتکبر ہٹا کر اسے دیکھا جاتا تو وہ کافی زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔

پتہ نہیں وہ یہاں مستقبل رہتی تھی یا صرف ملنے آئی ہوئی تھی۔اس نے لمحہ بھر سوچنے سے زیادہ اس بات پر کچھ خاص غور وتفکر کیا نہیں۔

ماں کو فارہ کے برابر بیٹھنا نہ تھا مگر بیٹی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔وہ ماموں کی گود سے اتر کر صوفے کی اس خالی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

پلاؤ میں سے بوٹیاں ہٹوا کر اس نے ماں سے صرف چاول اپنی پلیٹ میں ڈلوائے تھے اور اب ان چاولوں کو بڑے سلیقے اور مزے میں کھا رہی تھی جبکہ اس کے بھائی صاحب کے منہ میں زبردستی نوالے ٹھونسے جا رہے تھے۔ولی خود کھانا کھاتے بھانجے کے منہ میں بھی نوالے زبردستی ڈال رہا تھا۔

''لالہ! یہ آپ کو کھانا نہیں کھانے دے گا۔لائیں، اسے مجھے دے دیں۔'' زرینہ نے ولی سے کہا۔

''نہیں ٹھیک ہے۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بھانجے کے ساتھ مگن رہا۔

''تم نے اس کی عادتیں خراب کی ہوئی ہیں زرینہ! بچہ اپنے ہاتھ سے خوشی ورغبت سے کھائے تو صحت بھی اچھی ہو۔تب ہی دیکھ لو، یہ کتنا کمزور ہو رہا ہے۔'' آغا جان کے سامنے ان کا پرہیزی کھانا موجود تھا اور وہ اسے اپنی پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔

''میں کیا کروں آغا جان! یہ کچھ کھاتا ہی نہیں ہے۔نوالے لے کر پورے گھر میں اس کے پیچھے بھاگوں، تب کہیں جا کر محترم کے پیٹ میں چند لقمے جائیں گے۔دودھ، انڈے اور فروٹس سے وہ بے زاری ہے کہ اللہ اللہ Junk food میں پھر بھی کبھار دلچسپی لے لیں گے مگر صحت بخش تو کوئی چیز حلق سے نہیں اترتی۔''

یہ واقعی ایک پرفیکٹ فیملی ڈنر ہو سکتا تھا اگر اس میں وہ موجود نہ ہوتی وہ یہاں آؤٹ سائیڈر تھی۔اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی بے تکلف سے گھریلو ڈنر میں وہ زبردستی شامل ہو گئی ہے۔

دادا، پوتا، پوتی، پوتی کے بچے، وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟

''تم کچھ بھی نہیں لے رہیں بیٹا؟ کیا کھانا اچھا نہیں لگ رہا؟ تم رات کے کھانے میں کیا لیتی ہو، بتادو، زرینہ وہ بنوا کر لے آئے گی۔'' اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے ہوئے تھے اور انہیں چمچہ سے یہاں وہاں گھما رہی تھی۔آغا جان کے کہنے پر وہ فوراً چونکی۔

''میں لے رہی ہوں آغا جان! کھانا بہت مزے کا ہے۔'' اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن اور سلاد بھی جلدی سے شامل کر لیا۔

دو مہینے قبل آپ جن لوگوں سے صاف صاف اور بالکل واضح ان کے منہ پر یہ کہہ چکے ہوں کہ آپ ان سے شدید نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے پھر ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا، بے تکلف سے گھریلو قسم کے ماحول میں اسے یہ سب بہت عجیب اور خاصا آکورڈ لگ رہا تھا۔

دو مہینے قبل اس نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں ممی، تجمل ماموں اور معیز کی موجودگی میں آغا جان اور ولی کے منہ پر صاف صاف کہا تھا۔

''مجھے طلاق چاہیے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔''

آغا جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بالکل بے خوف وخطر ہو کر اس نے ان کے پوتے اور ان کے جوڑے اس زبردستی کے رشتے دونوں کو ایک ساتھ اور بڑی شدت سے رد کر دیا تھا۔ اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

یہ ایک کھلی سچائی اور واضح حقیقت تھی کہ وہ ولی صہیب خان سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی جتنی اس کی ممی وہ آغا جان کے جوڑے اس زبردستی کے رشتے سے اتنی ہی بے زار تھی جتنی اس کی ممی اور معیز کا ساتھ اگر کسی بھی سبب اسے نہ مل پاتا، اگر دنیا میں اس کے لئے آخری مرد ولی صہیب خان بچا ہوتا تو وہ ہمیشہ کنواری رہنے اور تنہا زندگی گزار لینے کو اپنے لئے منتخب کرتی۔

اس روز ان کے گھر آنے کے غالباً تین یا چار دن بعد آغا جان کی فون کال آئی تھی۔

''میری صحت ٹھیک نہیں، میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں، فارہ سے ایک بار میری بات کرا دو۔'' اس کے صاف صاف جواب دے دینے کے باوجود نجانے وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتے تھے۔

کال ممی نے ریسیو کی تھی اور انہوں نے ان کی فارہ سے بات کروانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''فارہ آپ سے بات نہیں کرے گی۔ اسے جو کہنا تھا، وہ آپ سے بالکل صاف کہہ چکی ہے۔ اب برائے مہربانی یہاں فون کرنے کی زحمت نہ کریں۔''

وہ وہاں موجود تھی، تجمل ماموں اور زہرا مامی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی طرف سے خلع کا قانونی مطالبہ پہنچ جانے کے بعد، اس کے منہ سے براہ راست اس رشتے سے انکار سن لینے کے بعد نجانے وہ اس سے مزید کیا کہنا چاہتے تھے۔

ممی نے ان کی بات پوری سنے بغیر لائن کاٹ دی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ پھر آغا جان کے ہاں سے کسی بھی طریقے کا رابطہ لاہور ان کے گھر نہیں کیا گیا تھا۔ دو مہینے پہلے ان کا اور ولی کا اس کے گھر آنا اور پھر تین روز بعد ان کی فون کال اس کے بعد پھر یہاں سے ہر طرح مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔ مگر یہ خاموشی ایسی ہی تھی جیسی طوفان سے قبل کی خاموشی ہوتی ہے۔

پچھلے چھ سات مہینے اگر اس نے سخت اذیت اور مشکل میں گزارے تھے اور آج وہ یہاں موجود تھی۔ جن لوگوں سے وہ نفرت کرتی ہے، ان ہی کے بیچ۔

واقعی انسان اپنے بارے میں، اپنی زندگی تک کے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا، کیا آج صبح تک اس نے سوچا بھی تھا کہ آج رات کا کھانا وہ کہاں اور کس کے ساتھ کھا رہی ہوگی۔

آغا جان نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا تھا اور وہ زیادہ دیر صوفے پر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے، ولی انہیں سہارا دے کر دوبارہ بیڈ پر لے گیا تھا۔ اسے تو کچھ کھانے کی رغبت ہی نہ تھی لیکن ولی اور زرینہ بھی بہت تھوڑا سا کھا کر جلدی کھانا ختم کر چکے تھے۔ آغا جان نے فارہ کو دوبارہ اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا تھا۔

''ابھی ہو نا میرے پاس؟ ابھی جاؤ گی تو نہیں؟''

ولی کی طرف اس کی پشت تھی اور ولی کی طرف دیکھے بغیر ہی اس نے ان کے سوال کا اثبات میں سر ہلا کر جواب دے دیا تھا۔

''لیکن تمہاری ہاؤس جاب؟ تمہارے کام حرج تو نہیں ہوگا بیٹا؟'' انہوں نے متفکر سے لہجے میں اگلا سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آغا جان! آج کے لئے اتنی باتیں کافی ہیں۔ آپ کو زیادہ بولنا نہیں ہے پتہ ہے نا آپ کو؟'' زرینہ اٹھ کر ان کے پاس آ گئی اور تنبیہی لہجے میں اس طرح بولی جیسے انہیں نہیں اسے سنا رہی ہو۔

''اب یہاں سے دفع ہو جاؤ، یہ میرے آغا جان کے سونے اور آرام کرنے کا ٹائم ہے۔''

بعض باتیں کہی نہ جائیں، رویوں سے سمجھا دی جاتی ہیں۔ وہ یہاں سے اٹھ کر جائے کہاں؟ اس نے پل بھر سوچا۔

''فارہ بھی تھک گئی ہوگی۔ اسے اس کا کمرہ دکھا دو۔ اپنے پورشن میں اکیلے شاید اسے ڈر لگے، ایسا کرو بہروز کا کمرہ فارہ کے لئے ٹھیک کروا دو۔'' انہوں نے نام لے کر کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا مگر کہہ یقیناً زرینہ سے رہے تھے، اس نے جیسے ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔

وہ سائیڈ ٹیبل کے پاس کھڑی ان کی دوائیں نکال رہی تھی۔ اور ان کی بات سن لینے کے بعد بھی اپنا یہی کام دل جمعی سے کرتی رہی۔ دوائیں نکالنے کے بعد وہ گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

''میں فارہ کے لئے کمرہ ٹھیک کروا کر آتا ہوں آغا جان!'' ولی جو کھانے کے بعد سے صوفے ہی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نظر زرینہ کو دیکھتا صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اگلے سیکنڈ کمرے سے باہر تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ اندر آیا تو براہ راست اسی سے مخاطب ہوا۔

''آجاؤ فارہ!'' اس کا لہجہ تکلفات کا حامل ہونے کے باوجود اخلاق لئے ہوئے تھا بالکل ایسا ہی جیسے آپ کسی مہمان کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اخلاق بھی شاید اس ایگریمنٹ کا حصہ تھا۔

''جاؤ بیٹا! آرام سے جا کر سو جاؤ۔ اب انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔

اس وقت یہ ہٹلر کی نانی مجھے زیادہ بولنے نہیں دے رہی۔ کل صبح ہم دادا، پوتی خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔''

بستر پر لیٹے انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ خود آگے بڑھ کر ان کے قریب جھک گئی۔ لیٹے لیٹے انہوں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں

ہاتھوں میں تھاما اور اس کے ماتھے کو بڑی محبت سے چوما۔

''میری بیٹی میرے پاس آ گئی ہے۔'' آج رات مجھے بہت سکون کی نیند آئے گی۔'' وہ خاموشی سے ان کے پاس سے ہٹ گئی۔

زرینہ دوا لئے ان کے قریب کھڑی تھی جبکہ ولی دروازے کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

الجھے ہوئے سے انداز میں وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ولی کے ساتھ زینہ طے کیا، وہ ایک کمرے کے سامنے آ کر رک گیا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹر کام پر گل خان سے کہہ دینا۔'' وہ دروازے سے واپس پلٹنے لگا تھا۔

''ایک منٹ ولی!'' اس کے پکارنے پر وہ متعجب سے انداز میں مڑا۔'' آغا جان سمجھ رہے ہیں، میں ان کی بیماری کا سن کر تمہارے ساتھ آئی ہوں۔''

''اور انہیں سمجھتے بھی یہی رہنا چاہئے۔ تمہیں ان کے سامنے یہی ظاہر کرنا ہے کہ تم صرف ان کی بیماری کا سن کر سب کچھ بھلا کر یہاں آ گئی ہو۔''

''اور تین مہینے بعد؟ ابھی انہیں یقین دلا دوں اور تین مہینے بعد کیا کہوں گی ان سے؟'' وہ اس حکمیہ لہجے و انداز پر بری طرح جھنجھلائی۔

وہ جھوٹ بولنے اور محبت کے ڈرامے کرنے یہاں نہیں آئی تھی۔ کیا ان کی بیماریوں کے آڑ لے کر اسے کسی طرح کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار بنایا جانے والا تھا؟

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں۔ تمہارا کام تین مہینے یہاں آغا جان کے پاس رہنا ہے۔ تین مہینے بعد کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے یہ میرا کام ہے۔ تمہارے پاس میرا دیا ثبوت موجود ہے۔

پھر بھی تمہاری تسلی کے لئے آج پہلی بار اور آخری بار تمہیں یقین دہانی کروا رہا ہوں کہ تین مہینے سے اگلا ایک دن بھی تمہیں نہ یہاں رہنا پڑے گا اور نہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو جوڑے رکھنا پڑے گا اور میں اپنے لفاظ سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں۔'' وہ اس کے بالکل قریب آ کر سرگوشی نما آواز میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

وہ پر اخلاق اور مہمان نوازی والا انداز جو آغا جان کے سامنے اختیار کیا گیا تھا اب ندارد تھا۔ اب انداز بارعب و حکمیہ ہونے کے ساتھ مکمل کاروباری و پروفیشنل نوعیت کا تھا۔

''اب اس موضوع پر تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ جو بات میرے اور تمہارے بیچ ہے، وہ اب کسی بھی اندا میں دُہرائی نہ جائے۔ یہ تمہیں میری پہلی اور آخری وارننگ ہے۔''

بہت سخت اور بے لچک لہجے میں وہ آواز دبا کر اس انداز میں بولا، گویا اسے یہ خدشہ ہو کہ کہیں اس کی آواز کسی اور تک نہ پہنچ جائے وہ فوراً ہی واپس مڑ گیا تھا۔

وہ اس کی بات مان کر یہاں کیوں آئی؟ اس کے اندر یک دم ہی پچھتاوے سر ابھارنے لگے۔

''فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔'' پہلی بار اس بات پر عمل کیا تھا اور پہلی ہی بار منہ کے بل گر پڑی تھی۔

وہ بے شک کسی بھی قیمت پر اس ناپسندیدہ ترین اور زندگی پر عذاب کی طرح مسلط رشتے سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی مگر محبت کے جھوٹے ڈرامے کر کے ہرگز نہیں یہ اس کے معیار سے بہت کم تر درجہ کی بات تھی۔ یہ بڑی گھٹیا اور بیچ سی بات تھی۔ وہ اتنی جرأت رکھتی تھی کہ جن سے نفرت کرتی ہو، علی الاعلان ان سے اظہار نفرت کر سکے اور جن سے محبت ہو تو بہ بانگ دہل اس کا بھی اعلان کر سکے۔

"تمہیں تین مہینے آغا جان کے ساتھ ایک بہت محبت کرنے والی پوتی بن کر رہنا ہے۔"

اسے ولی کے الفاظ یاد آئے۔ تب اس نے ان لفظوں پر اس سوچ کے پیش نظر زیادہ غور نہیں کیا تھا کہ یہ سب یونہی ایک دکھاوا اور جھوٹ ہے۔ دراصل تو آغا جان بھی اس سارے منصوبے سے واقف ہیں، ہاں اس کے سامنے ضرور لاعلمی کا ڈھونگ رچائیں گے۔ بہت بری طرح الجھی ہوئی اور مضطرب وہ کمرے میں آ گئی۔

برسوں پہلے، اس کی پیدائش سے بھی بہت پہلے، کبھی یہ اس کے ڈیڈی کا کمرہ رہا تھا۔ یہاں وہی فرنیچر اور وہی سب سامان رکھا تھا جو برسوں پہلے اس کے ڈیڈی کے زیر استعمال رہا تھا۔

یہیں اسی کمرے میں ممی اور ڈیڈی کے بیچ جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس جھگڑے کی عینی شاید تھی، خوف سے تھر تھر کانپتی اس جھگڑے کے دوران وہ بھی تو یہیں موجود تھی۔ یہی کوئی چھ، سوا چھ سال پہلے کی ایک شام تھی۔ یہاں اس بیڈ کے قریب ممی کھڑی تھیں۔

"کیا فارہ کا نکاح؟ بہروز! آپ ہوش میں تو ہیں؟" اور ان سے دو قدم دور ڈیڈی۔

"ہاں۔ اب ہی جا کر تو ہوش میں آیا ہوں۔ پوری زندگی باپ کی نافرمانی کر لی، اسے بہت دکھ پہنچا دیے۔ بھائی سے ناجائز قربانیاں مانگ لیں اب کوئی ایک کام تو ان کی خوشی اور رضا سے بھی کر جاؤں۔" اور وہ خود اس بیڈ پر بیٹھی ان دونوں کو ہراساں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ممی، ڈیڈی پر چلا رہی تھیں، ناراض ہو رہی تھیں اور وہ چلا تو نہیں رہے تھے مگر وہ ممی پر خفا بہت ہو رہے تھے۔ بہت برہم لہجے میں ناگواری اور غصے سے بول رہے تھے۔ ممی اگر غصے سے چلا رہی تھیں تو وہ بالکل قطعی اور دوٹوک انداز میں اپنا حکم سنا رہے تھے۔

"میں اپنی بیٹی کے ساتھ یہ زبردستی کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ کیوں دوں میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس خاندان کے کسی شخص کے ہاتھ میں جس نے آج تک کبھی مجھے اس گھر کی بہو تسلیم نہیں کیا۔"

"اگر فارہ تمہاری بیٹی ہے تو میری بھی بیٹی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے۔" ان دونوں کا جھگڑا سمٹنے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ ابتدائی بحث و تکرار شدید غصے اور ناراضی میں تبدیل ہو چکا تھی۔

"بہروز! میں ایسا کبھی بھی نہیں ہونے دوں گی۔" ممی روتے ہوئے بہت زور سے چلائی تھیں۔

"بس۔" ڈیڈی نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کرنے والے انداز میں انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔

"مجھے بحث نہیں چاہیے۔ جو فیصلہ میں کر چکا، میں نے اس سے تمہیں آگاہ کرنا تھا سو کر دیا۔ میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی۔ میں فارہ کا باپ اپنی بیٹی کا نکاح اپنے بھائی صہیب خان کے بیٹے ولی صہیب خان کے ساتھ آج شام اب سے ایک گھنٹہ بعد کر رہا ہوں اور یہ میرا اٹل اور

آخری فیصلہ ہے۔" سختی اور برودت لیا یہ حاکمانہ اور جابرانہ لہجہ اس کے ڈیڈی کا تو ہرگز نہیں تھا۔

ہاں شاید یہ آغا جان کا لہجہ تھا صرف پندرہ دن میں وہ آغا جان کی زبان اور ان کا انداز سیکھ گئے تھے۔ اس حکمیہ اور سخت لہجے میں بولتے اس نے ڈیڈی کو کبھی بھی نہ سنا تھا۔

وہ تو خیر سترہ، اٹھارہ سال کی ناسمجھ اور ناتجربہ کار لڑکی یا شاید بچی سمجھی جاتی تھی۔ اس سے کچھ کہنے سننے یا پوچھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر یہاں تو اس کی ماں کو بھی کسی رائے یا مشورے کے بغیر ایک سیدھا حکم سنا دیا گیا تھا۔ سخت اور قطعی لہجے میں۔ ممی روتے ہوئے کمرے سے چلی گئی تھیں۔

وہ ممی اور ڈیڈی کے بیچ تناؤ، بدگمانی اور جھگڑے کی فضا دیکھ کر بری طرح سہمی ہوئی بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے وہ میاں بیوی آپس میں یوں جھگڑ کیوں رہے تھے۔ کاش کسی طرح وہ سب کچھ پہلے جیسا کر دے۔ اس کے ماں باپ کو لڑوانے والے محمد بختیار خان سے اسے نفرت ہو رہی تھی۔ اسے اس دن کا وہ ایک ایک پل یاد تھا۔

اس ایک دن نے اس کی زندگی کو کس قدر آزمائشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس ایک دن نے اس کی زندگی کو پورا کا پورا بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ یہاں اس کمرے میں وہ تنہا تھی، وہ رو سکتی تھی اور رو رہی تھی۔

ڈیڈی کی زمانہ طالب علمی کی ایک تصویر کو اٹھا کر اس پر ہاتھ پھیرتے اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اور بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ تمام بتیاں بجھا کر۔ جب زندگی اندھیروں اور آندھیوں کی زد میں تھی تو کمرے میں نمائشی روشنی کس کام کی تھی۔

✿✿✿

اپنے ماں، باپ کی محبت بھری چھاؤں میں خوش باش اور بے فکری زندگی گزارتی، درد و غم کے معنوں سے نا آشنا، کم سن نوعمر فارہ بہروز خان کی زندگی اس روز تک خوشگوار اور بہترین تھی جب تک اس میں محمد بختیار خان، محمد صہیب خان اور ولی صہیب خان نام کے لوگ داخل نہ ہوئے تھے۔

اس کی اٹھارہویں سالگرہ میں چار مہینے باقی تھے، وہ اے لیول کے امتحانات سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ زندگی میں سب کچھ بدل گیا۔ اس کے ممی، ڈیڈی کی پسند کی شادی تھی جسے ان کے گھر والوں نے قبول نہ کیا تھا اور اس کے ڈیڈی نے باپ کے گھر کے امیرانہ ٹھاٹ باٹھ سے منہ موڑ کر اپنی دنیا آپ بسائی تھی۔

یوں لگتا کہ جیسے ان کے سامنے ان کی فیملی کا نام بھی زبان پر لانا سنگین غلطی ہوگی۔ مگر پھر ایک روز ان سب لوگوں کا ان کے گھر میں ذکر ہوا اور وہ فارہ بہروز خان کی خوشگوار زندگی کا آخری دن تھا۔ ڈیڈی کے چھوٹے بھائی صہیب خان کا انتقال ہو گیا تھا۔

برسوں کی قطع تعلقی کے بعد آغا جان نے انہیں بھائی کی موت کی اطلاع بھجوائی تھی۔ وہ بھائی کے آخری دیدار اور اس کی تدفین میں شرکت کے لئے پشاور چلے گئے تھے۔ وہاں پندرہ روز قیام کے دوران انہوں نے صرف ایک بار لاہور اپنے گھر بیوی اور بیٹی کو فون کیا۔ وہ بھی صرف یہ بتانے کے لئے وہ ابھی پشاور ہی میں کچھ روز رہیں گے کیونکہ ان کے والد بہت بیمار ہیں۔

فارہ اور ممی یہاں ان کے لئے پریشان ہوتی رہیں اور وہ وہاں رہتے رہے۔ پھر پندرہویں دن انہوں نے فون کر کے فارہ اور ممی دونوں کو

اپنے پاس اپنا ورآنے کو کہا۔ انہیں ائیر پورٹ پر لینے آنے والا دراز قامت اور مضبوط جسامت والا اکیس بائیس سالہ لڑکا تھا جس کی نیلی آنکھیں بالکل اس کے ڈیڈی جیسی تھیں۔

وہ لڑکا چند گھنٹوں بعد اس کی زندگی پر کسی عذاب کی طرح مسلط ہونے والا ہے، وہ جانتی نہ تھی۔ اگر جانتی ہوتی تو شاید ائیر پورٹ سے آغا جان کے گھر آنے کے بجائے واپس لاہور کی فلائٹ پکڑتی۔ ممی اور وہ آغا جان کے عالیشان اور محل نما گھر پہنچیں، جہاں بستر پر دراز بیمار پڑے آغا جان سے ان دونوں کی زندگی میں پہلی ملاقات ہوئی۔ ''آ گئے میرے بچے۔'' وہ انہیں دیکھتے ہی فوراً بولے۔

''فارہ! اپنے دادا کے پاس نہیں آؤ گی؟ روحی بیٹا! تم وہاں کیوں رک گئیں؟ یہاں آؤ۔ کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟ دیکھو تو صہیب کیسے مجھے چھوڑ گیا۔'' وہ لیٹے لیٹے ہی ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنے پاس بلاتے ہوئے بولے۔

فارہ انہیں نہیں دیکھ رہی تھی، وہ اپنے ڈیڈی کو دیکھ رہی تھی، شاید ممی بھی ان ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ پندرہ دن کی دوری کے بعد وہ بیٹی یا بیوی کی طرف نہیں بلکہ اپنے باپ ہی کی طرف متوجہ تھے۔ ان کے پیر دباتے ہوئے، اسے اور ممی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے۔ وہ اسے بہت بدلے ہوئے، بہت اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اسے اور ممی کو ایک دوسرے کمرے میں لے آئے تھے اور وہاں ان کی زبانی سب بات سننے کے بعد پتہ چلا تھا کہ اسے اور ممی کو یہاں بلوایا کیوں گیا ہے۔

وہ اس کا نکاح اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے کے ساتھ فوراً کر دینا چاہتے تھے۔ جس بھائی سے وہ برسوں سے ملے نہیں تھے، اس کے جس بیٹے کو وہ پندرہ روز پہلے جانتے تک نہیں تھے، وہ اس کے ساتھ آناً فاناً بغیر کسی سے پوچھے، صلاح مشورہ کئے اپنی بیٹی کی زندگی وابستہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ممی اور ڈیڈی کے بیچ شدید جھگڑے کے بعد جب ممی کمرے سے روتی ہوئی چلی گئیں تب ڈیڈی بیڈ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت انہوں نے ممی سے تند لہجے میں کہا تھا کہ وہ بیٹی کے دشمن نہیں اور کچھ سوچ کر ہی انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور وہ انہیں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ واقعی اس کے ڈیڈی اس کے دشمن کبھی نہیں ہو سکتے، وہ کبھی اس کے لئے کچھ برا نہیں سوچ سکتے لیکن پھر آج کیوں وہ اس کے لئے برا سوچ رہے ہیں۔

پر وہ اس کے ڈیڈی کہاں رہے تھے۔ وہ تو بالکل اجنبی لگ رہے تھے۔ وہ اتنے بدلے ہوئے، اتنے مختلف لگ رہے تھے، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ڈیڈی کے اس ہم شکل سے پہلی بار مل رہی ہو۔

اس کے ڈیڈی تو اتنے نرم خو، صلح جو اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ سختی، تلخی، غصہ اور حکم چلانا، یہ سب تو ان کی فطرت ہی میں نہ تھا۔ اس نے انہیں کبھی حکم چلاتے نہ سنا تھا، ان کے گھر میں آج کیا پکنا ہے سے لے کر گھر کے فرنیچر و دیگر سامان کی خریداری، چھٹیاں کہاں گزاریں، فارہ کی برتھ ڈے کیسے سیلیبریٹ کریں؟ فارہ کو عید کی شاپنگ کہاں سے کرائیں؟ جیسے معاملات تک بھی ممی اور ڈیڈی کی باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور اس روز اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی کا سب سے بڑا، سب سے اہم فیصلہ وہ اپنی بیوی، اپنی بیٹی کی ماں کی مرضی کے خلاف جبراً مسلط کر رہے تھے۔

یہ اس کے ڈیڈی نہیں تھے۔ یہ اس کے ڈیڈی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

''فارہ! تمہیں کیا لگتا ہے، تمہارے ڈیڈی تمہارے ساتھ کیا کبھی کچھ برا کر سکتے ہیں؟'' اس کے برابر بیڈ پر آ کر بیٹھتے ہی ڈیڈی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے آہستگی سے پوچھا۔

ممی سے بات کرتے وقت جو سختی اور تلخی ان کی زبان اور آنکھوں میں تھی، اس سے بات کرتے وقت اس کی جگہ نرمی، محبت اور شفقت نے لے لی تھی۔

''فارہ! مائی سویٹ ہارٹ، تمہارے ڈیڈی نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ اب ان کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ نہ دو گی؟ ان کی بات نہ مانو گی؟'' وہ رو رہے تھے۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ واقعی وہ ڈیڈی نہیں رہے تھے جنہیں وہ جانتی تھی مضبوط اعصاب کے مالک، بڑی سے بڑی بات پر ٹینشن میں نہ آنے والے اور آج وہ کیوں اس طرح رو رہے تھے۔ گران کا چھوٹا بھائی مر گیا ہے تو اس کی موت کا یہی وقت مقرر ہوگا۔ بھائی کی موت میں ان کا کہاں قصور ہے؟ جسے وہ اپنی غلطی گروان رہے ہیں۔

برسوں بعد اس گھر میں آئے ہیں تو اتنے برسوں سے ان پر اس گھر کے دروازے اس گھر کے مالک نے بند کر رکھے تھے۔ ان کے باپ نے انہیں گھر بدری کی سزا دی ہوئی تھی۔ اپنا گھر وہ تو نہیں چھوڑ کر گئے تھے جسے اپنی غلطی قرار دے رہے تھے۔ تو کیا ممی سے پسند کی شادی، آغا جان کی حکم عدولی انہیں اپنا گناہ نظر آ رہی تھی؟

بھائی کی موت، آغا جان کی بیماری، برسوں بعد اپنے گھر میں واپسی پر اگر انہیں ممی سے شادی اپنی غلطی نظر آنے لگی تھی تو یہ ان کی وہ سوچ تھی، وہ احساس جرم وندامت تھا، جو آغا جان نے بستر پر بیمار پڑ کر ان کے دل میں پیدا کیا تھا ورنہ پسند کی شادی نہ جرم ہے نہ گناہ۔

وہ بھی اس صورت میں جب مطلق العنان اور جابر شہنشاہوں کا سا مزاج رکھنے والا باپ آپ سے یہ چاہے کہ آپ اس کی طے کردہ کسی بچپن کی منگنی کو قبول کریں نہ کہ اپنی زندگی کا ساتھی خود چننے کی جسارت کر بیٹھیں اور اگر یہ جسارت کر بیٹھیں تو آپ کو آپ ہی کے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا دیا جائے۔

اپنی جائیداد سے آپ کو عاق کر کے سب کچھ چھوٹے بیٹے کے نام کر دیا جائے اور اپنی ضد پوری کرنے کے لئے اپنی انا کو سر بلند رکھنے کے لئے چھوٹے بیٹے کی اپنی اس بھانجی سے فوراً شادی کروا دی جائے جس سے منگنی توڑنے کا گناہ آپ سے سرزد ہوا ہے۔

''یہ میرے مرنے والے بھائی کی خواہش تھی فارہ کہ تم اس کی بہو بنو اور ہمارا ٹوٹا رشتہ، اس مضبوط رشتے کی بدولت پھر سے جڑ جائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جائے وہ روتے ہوئے اس کا سر سینے سے لگائے اس سے مخاطب تھے۔

ایک مرے ہوئے انسان کے لئے وہ اپنی زندہ جیتی جاگتی، کم عمر بیٹی کی زندگی بھینٹ چڑھانے کو تیار تھے۔ کسی مرے ہوئے انسان کی خواہش پر ایک زندہ انسان کی قربانی دی جا رہی تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا۔

آغا جان جو بیٹے کی موت اور اپنی بیماری کو ہتھیار کی طرح اس کی ممی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ایک کل کی لڑکی جو برسوں پہلے ان

سے ان کا بیٹا چھین کر لے گئی تھی، اس لڑکی کو اس جسارت اور گستاخی کی سزا تو دینی ہی تھی۔ وہ بظاہر فارہ اور ممی دونوں کے ساتھ بہت اچھے بنے ہوئے تھے مگر کیا انہیں یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ جبراً جو رشتہ وہ ڈیڈی کے ذریعے مسلط کروا رہے ہیں، ممی اس پر خوش نہیں، فارہ اس پر خوش نہیں۔

ممی اور ڈیڈی کے جھگڑے کے ایک گھنٹے بعد اسے ایک سرخ جوڑا اور کئی طرح کے بھاری بھرکم زیورات پہنا کر جو آغا جان نے اپنی سیف سے نکال کر دیئے تھے اور جو سارے ان کے خاندانی اور بہت قیمتی زیورات تھے، اسے زبردستی دلہن بنا کر دلی صہیب خان کے برابر بٹھا دیا گیا تھا۔

مختصر سے مہمان تھے، صرف خاص خاص اور قریبی رشتے دار و احباب کوئی دھوم دھام اور ہنگامہ نہ تھا کہ پندرہ دن قبل اس گھر میں ایک موت ہو چکی تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا، فیصلہ سنایا جا چکا تھا اس کا کام تو فقط اب صرف گردن اقرار میں ہلا کر سامنے رکھے کاغذوں پر دستخط کرنا تھا۔

خود پر اترے جبر کے اس لمحے کے لئے وہ ڈیڈی اور آغا جان کو کبھی معاف نہیں کر سکے گی، کانپتے ہاتھوں سے نکاح نامے پر دستخط کرتے اس نے سوچا تھا۔

"آغا جان! مجھے اجازت دیں، میں لاہور میں اپنے سارے ادھورے بکھرے کام سمیٹ لوں، ملازمت سے استعفیٰ دے دوں، روحی، اپنا اور فارہ کا سارا ان سامان پیک کر لے، بس پھر ہم واپس یہیں آ جائیں گے۔ ہم اب ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے آغا جان! آپ سے وعدہ کرتا ہوں اب زندگی بھر آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، آپ کے قدموں میں ساری زندگی گزار دوں گا۔"

تیسرے دن جب ڈیڈی نے لاہور واپسی کی بات کی تب آغا جان آنکھوں میں آنسو لے آئے تھے اور ڈیڈی نے فوراً انہیں واپسی کی وجہ سے آگاہ کر کے ہمیشہ کے لئے یہاں آ جانے یقین بھی دلا دیا تھا، جبکہ آغا جان اس کے اور ممی کے ساتھ اچھا بننے کا ڈرامہ کرتے رہے تھے۔

"روحی بیٹا! سارے گلے اور رنجشیں اور پچھلی ہر بات بھول جاؤ۔ تم میرے لئے میری بہو نہیں میری بیٹی ہو۔"

وہ لوگ ہمیشہ کے لئے پشاور واپس جانے کے لئے لاہور لوٹ آئے تھے۔ تین دن پہلے کے شدید جھگڑے کے بعد سے ممی اور ڈیڈی میں بات چیت مکمل بند تھی۔ جس طرح ان تین دنوں میں ممی نے ان سے کوئی بات نہ کی تھی، اس طرح سارے راستے بھی نہ کی تھی اور لاہور واپس آ کر ممی شدید غم وغصے میں گھری اپنے گھر میں قدم رکھنے کے بجائے بالکل برابر والے گھر میں جوان کے سگے بھائی کا تھا چلی گئی تھیں۔

ڈیڈی کو جس طرح ان کی ناراضی اور غصے کی کوئی پروا نہ تھی، اسی طرح انہیں ان کے ناراض ہو کر بھائی کے گھر چلے جانے سے بھی کچھ فرق نہ پڑا تھا۔ ممی کی ناراضی سے لاتعلق و بے نیاز فارہ کو ساتھ لئے اپنے گھر میں آ گئے تھے۔ ہاں وہ کچھ بجھے بجھے اور خاموش سے ضرور تھے، وہاں پشاور میں آغا جان اور اپنے بھتیجے بھتیجی کے ساتھ بہت زیادہ باتیں کرنے والے ڈیڈی یہاں آتے ہی بالکل چپ چپ سے ہو گئے تھے۔

وہ اسی اداسی بھرے انداز میں لاؤنج میں فارہ کے ساتھ بیٹھے اس سے کچھ باتیں کرتے رہے تھے۔ پشاور میں بھی اچھے تعلیمی اداروں کی کوئی کمی نہیں، وہ فارہ کو میڈیکل کی تعلیم وہاں سے دلوائیں گے، وہ وہاں پڑھنے میں بھی اتنا ہی انجوائے کرے گی جتنا یہاں کرتی ہے، نئی سہیلیاں بنانے میں کچھ وقت ضرور لگے گا، مگر بہت جلد وہ وہاں بہت اچھی طرح خود کو ایڈجسٹ کر لے گی، جیسی چند باتیں، تھوڑی دیر بعد وہ اس کے پاس سے کھڑے ہو گئے۔

"فارہ بیٹا! اپنا سارا ضروری سامان پیک کرلو۔" وہ اس سے یہ جملہ کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تھے اور وہ مضطرب اور پریشان لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

ممی اور ڈیڈی کے اس جھگڑے میں وہ کس کا ساتھ دے؟ ممی ناراض ہو کر تجمل ماموں کے گھر چلی گئی ہیں، وہ پشاور آغا جان کے گھر مستقل رہائش اختیار کرنے کسی قیمت پر نہیں جائیں گی۔ یہ بالکل واضح تھا اور ڈیڈی اب وہاں جانے کے علاوہ کہیں اور رہائش اختیار کریں گے نہیں، وہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے؟ کس کی بات مانے گی، کس کی حکم عدولی کرے گی؟ ماں یا باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب یہ کس طرح ممکن تھا، یہ کس طرح ہو سکتا تھا؟ وہ بہت الجھن اور بے چینی کے عالم میں گم صم سی بیٹھی تھی، اس دوران دوپہر سے شام، شام سے رات اور رات سے اگلی صبح ہوگئی۔

نہ ممی تجمل ماموں کے گھر سے واپس آئیں اور نہ ڈیڈی اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ اب کیا ہونے والا تھا، زندگی اب نجانے کیا رخ دکھانے والی تھی مگر یہ تو واضح نظر آرہا تھا کہ زندگی اب دوبارہ کبھی پہلے جیسی نہ ہو پائے گی اور واقعی زندگی پھر دوبارہ کبھی پہلے جیسی ہو بھی نہ پائی تھی۔

صبح جب کافی دیر ہوگئی اور ڈیڈی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے تب وہ ان کے کمرے کے دروازے پر آئی۔ دستک کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہاں ڈیڈی کا صرف جسم تھا، ان کی روح ایک دوسری دنیا کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل پر ان کے ہاتھوں کا ٹائپ شدہ وہ استعفیٰ رکھا تھا جس پر ان کے دستخط تھے۔

اسی دن کی تاریخ تھی جس کی صبح وہ اس دنیا میں موجود ہی نہ تھے کہ اگر زندہ رہتے تو آج انہیں یہ استعفیٰ اپنے آفس جا کر دینا تھا۔ اس استعفیٰ کے ساتھ کمرے میں الماریوں میں سے بھی تمام سامان نکال کر سوٹ کیسوں اور بیگز میں بھر کر رکھا ہوا تھا۔

کچھ وہ سامان بھی تھا جسے پیک کرنے کی شاید انہیں مہلت نہ مل پائی تھی، وہ سب کارپٹ، صوفوں اور بیڈ پر بکھرا پڑا تھا، یہ ساری پیکنگ یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ دوپہر سے رات تک یہی کام کرتے رہے تھے، اپنے آغا جان کے پاس جانے کی تیاری کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ رات کے آخری پہر کسی وقت ان کا انتقال ہوا تھا۔ نجانے کس کس ناکردہ گناہ کا بوجھ اپنے دل پر لئے وہ یوں خاموشی سے رخصت ہوگئے تھے۔

کل دوپہر لاؤنج میں اس کے پاس سے اٹھنے والے ڈیڈی اب دوبارہ کبھی اس کے پاس نہ آئیں گے، اس سے بات نہ کریں گے۔ وہ صدمہ سے بدحواس ہوگئی تھی، وہ پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکراتی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ڈیڈی سے اپنے اس جبری نکاح اور ممی سے جھگڑا کرنے پر وہ دل ہی دل میں ناراض تھی اور وہ اسے منائے بغیر ہی چلے گئے تھے۔

اب وہ کس سے ناراض ہو؟ کس سے شکوہ کرے؟ ڈیڈی سے شدید ناراض اور بدگمان، بھائی کے گھر چلی جانے والی ممی سر پر بیوگی کی چادر لئے صدمے سے بدحال اپنے گھر واپس آگئی تھیں۔ ان کی ہنستی مسکراتی زندگی میں آگ لگا دینے والے، ان سے ان کا سہاگ چھین لینے والے، ان کی بیٹی کو یتیمی کا دکھ دینے والے محمد مختار خان کو وہ کبھی معاف نہیں کریں گی، وہ روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

پھر آغا جان وہاں آگئے تھے، وہ ڈیڈی کی میت پشاور لے جانا چاہتے تھے، ممی انہیں اس بات کی اجازت کبھی بھی نہ دیتیں مگر تجمل ماموں کے سمجھانے بجھانے پر وہ بحالت مجبوری اس بات کے لئے آمادہ ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کی آخری رسومات پشاور میں ان کے آبائی گھر میں ادا کی گئی تھیں،

انہیں ان کی ماں اور بھائی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔

تجمل ماموں نے ممی اور فارہ کو سنبھالا تھا، وہ لوگ تدفین کے بعد وہاں ایک پل نہ رکے تھے۔ ان کی زندگی اجڑ گئی تھی، ان کا گھر بکھر گیا تھا، ممی سے ان کا سہاگ چھن گیا تھا، فارہ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا، محمد مختار خان سے شدید نفرت لئے ممی اور فارہ واپس لاہور اپنے گھر آ گئی تھیں۔ ڈیڈی کے انتقال کے مہینہ بھر بعد آغا جان، ولی کے ساتھ ان کے گھر آئے تھے۔

وہ اسے اور ممی کو اپنے گھر اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ ممی نے ان کے ساتھ جانے سے قطعی انکار کر دیا تھا پھر بھی وہ اصرار کئے جا رہے تھے۔

''میں نے تمہیں بحیثیت بہو قبول نہ کر کے ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔ میں اعلیٰ ظرف نہ تھا بیٹا! تم اعلیٰ ظرف ہو جاؤ۔ اپنے گھر چلو۔ تمہارا گھر تمہارا منتظر ہے۔ تم وہاں کی بہو ہو۔'' وہ ممی سے محبت جتا رہے تھے، فارہ پر والہانہ چاہت نچھاور کئے جا رہے تھے۔

اس سے اس کے باپ کو چھین کر، ممی سے ان کے شوہر کو جدا کروا کر اب وہ یہاں کیا لینے آئے تھے، کیوں یہ جھوٹی محبتیں جتا رہے تھے، وہ انہیں دیکھتے ہوئے دل میں شدید غم و غصہ محسوس کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ممی نے ان کے ساتھ جانے سے قطعی اور واضح الفاظ میں انکار کر دیا تھا پھر بھی وہ ہمت نہ ہار رہے تھے۔ وہ مسلسل انہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے کئی ماہ سے ان کے گھر آ رہے تھے، فون پر فون کر رہے تھے۔

فارہ کو ان سے اور ان سے جڑی ہر شے سے نفرت ہوتی اسے ولی صہیب خان سے نفرت ہوتی، جو لاہور آمد پر ہر بار ان کے ساتھ ہوتا اور اس سے یہ یاد دلاتا کہ مرنے سے پہلے ہی وہ لوگ اس کے ڈیڈی کو اس سے چھین چکے تھے۔ ممی سے چھین چکے تھے۔

ان دنوں ممی، آغا جان اور ولی کے بار بار اپنے گھر کے چکروں سے سخت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ کہیں آغا جان اس نکاح کو مضبوط دلیل بنا کر، حق جتا کر فارہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کریں۔ فارہ بھی گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس کرتی تھی کہ کہیں ممی کے مسلسل انکار سے ضد میں آ کر آغا جان اسے ولی کے ذریعے اغوا نہ کروالیں۔ اسے زبردستی پشاور نہ لے جائیں۔

وہ راتوں کو خوف کے مارے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی۔

دکھوں اور خوف سے بھرے ان دنوں میں میڈیکل کالجز میں داخلے شروع ہو گئے تھے اور داخلے شروع ہوتے ہی آغا جان ولی کو ساتھ لئے ایک بار پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ یہ کہتے کہ ممی پشاور جانے پر آمادہ نہیں تو ٹھیک ہے وہ فارہ کا یہیں میڈیکل کالج میں داخلہ کروا دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کی بہو اور پوتی اب مکمل طور پر ان کی ذمہ داری ہیں، لہٰذا فارہ کے تعلیمی اخراجات ہوں یا ان کے گھریلو اخراجات، وہ سب پورا کرنا اب ان کے ذمہ ہے۔

ممی، ابتداء میں ان سب سے انکاری ہوئی تھیں، انہوں نے پیسے کے حوالے سے بھی آغا جان سے کوئی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا تھا مگر پھر تجمل ماموں نے انہیں سمجھایا تھا کہ وہ اس ضد اور اکڑ میں اپنی بیٹی کو اس کے جائز اور قانونی حق سے محروم کر رہی ہیں۔

محمد بختیار خان کی دولت، جائیداد پر کیا صرف صہیب خان اور اس کے بچوں کا حق ہے۔ فارہ کا بھی اس پر پورا پورا حق ہے بلکہ صہیب خان کے بچوں سے زیادہ ہی ہے کہ آغا جان نے برسوں اس کے ڈیڈی کو ان کے ہر جائز اور قانونی حق سے محروم رکھا تھا۔

آغا جان فارہ کی پڑھائی کا خرچہ اٹھائیں یا ان کے گھریلو اخراجات کی ذمہ داری لیں تو یہ کوئی احسان نہیں بلکہ صرف ان کا فرض ہے۔

آخر کار ممی، تجمل ماموں کی بات مان گئی تھیں، پھر ان کے تجمل ماموں کی موجودگی ہی میں آغا جان سے بہت طویل مذاکرات ہوئے تھے۔ اور پھر اس سے اگلے روز آغا جان اسے میڈیکل کالج کے داخلہ فارم دلوانے اور اس کے نام ایک بینک اکاؤنٹ کھلوانے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ولی ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اسے داخلہ فارم دلوایا خود ساتھ بیٹھ کر اس کے ساتھ فارم بھروایا۔ وہ اس کے ساتھ انتہا سے زیادہ محبت اور شفقت سے پیش آ رہے تھے، وہ صرف ممی کے کہنے پر ان کے ساتھ آئی تھی مگر ان کی محبتوں کا یہ مظاہرہ اس کے دل کو کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔

''جس روز تم ڈاکٹر بن جاؤ گی نا فارہ! بہروز کی روح بہت خوش ہوگی۔ تمہیں ڈاکٹر بنانے کی اسے بہت خواہش تھی۔'' پھر وہ اسے اپنے ساتھ بینک لے آئے تھے۔

وہ اس کا اور ولی کا ایک جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا رہے تھے اور اس عمل کی اسے یہ توجیہ دے رہے تھے کہ ایک اکیلے آدمی کے مقابلے میں جوائنٹ اکاؤنٹ زیادہ بہتر رہتا ہے اور پھر ابھی وہ بہت چھوٹی بھی ہے، بینکنگ سے متعلق معاملات تنہا سنبھالتے شاید گھبرا جائے۔

وہ اس وقت تو کچھ بھی نہ سوچ سکی تھی کہ ان کی محبتوں کے حصار میں جکڑ گئی تھی مگر گھر آ کر اس نے جب سنجیدگی سے سوچا تو خیال آیا کہ جوائنٹ اکاؤنٹ ہی کھلوانا تھا تو وہ اپنا اور فارہ کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا سکتے تھے یا اس سے بھی بہتر تھا کہ ممی کا اس کے ساتھ اکاؤنٹ کھلوا دیتے اور سب سے بڑی بات کسی نئے اکاؤنٹ کے کھلوائے جانے کی ضرورت کیا تھی۔

ممی کا اپنا پہلے ہی سے ایک بینک اکاؤنٹ موجود ہے اگر وہ بہو اور پوتی کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، خود کو ان کا سرپرست قرار دیتے ہیں تو وہ ممی کے اس اکاؤنٹ میں ہر ماہ ان کے اخراجات کے لئے رقم ڈلوا دیا کرتے۔ بہو کے ہوتے پوتی کو فوقیت دے کر کیا وہ ممی کو ان کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کر رہے تھے، انہیں ذلیل و بے عزت کرنا چاہتے تھے۔

''پوتی میرا خون ہے اور تم بالکل غیر، میری نگاہوں میں تمہاری کوئی حقیقت نہیں۔'' وہ اس روز کے بعد بھی مسلسل اس سے ملتے رہے تھے، اس کے داخلے سے متعلق تمام امور ولی کے ذریعے انجام دلواتے رہے تھے۔

اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ پانچ لاکھ روپیہ رکھنے والا بینک اکاؤنٹ جس میں مزید پیسہ ڈلوائے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ان کی اس کے لئے بک کروائی نئے ماڈل کی گاڑی، وہ ان محبتوں اور پیسوں کی برسات سے متاثر ہو جاتی اگر اسے اپنی ماں کی کوئی پرواہ نہ ہوتی یا وہ ایک خود غرض بیٹی ہوتی۔

اس کی ماں کو ذلیل کر کے کیا وہ سمجھتے تھے کہ اس کی محبت جیت لیں گے؟

اس کا داخلہ کرا دینے کے بعد وہ واپس چلے گئے تھے اور پھر وہ خود تو نہیں آتے تھے البتہ ان کی فون کالز اس کے پاس ہر دو تین مہینے بعد

ضرور آتی تھیں، جن میں اس کی خیریت پوچھی جاتی، پڑھائی کا احوال دریافت کیا جاتا، کچھ چاہیئے تو نہیں اور ادھر اُدھر کی کچھ مختصر گفتگو ہوتی۔

وہ ان سے تہذیب و شائستگی سے مگر بہت فاصلہ رکھ کر بات کرتی۔ جتنا وہ پوچھتے صرف اتنا جواب دیتی۔ ان فون کالز کے ساتھ وہ ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں خطیر رقم ڈلوایا کرتے۔

وہ کالج جاتی تھی مگر پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ وہ پہلے سی زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی بھی نہ رہی تھی۔ وہ خود کو بڑی مشکلوں سے کتابوں، پڑھائی اور کالج میں گم کرنے کی کوشش کرتی۔ یہ سوچ کر کہ اسے ڈاکٹر بنانا اس کے ڈیڈی کا ایک بہت بڑا خواب تھا۔

یہ خواب کبھی اس کا بھی تھا مگر اب وہ صرف ڈیڈی کے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے دن، رات پڑھتی اور محنت کرتی۔ ممی، ڈیڈی کے انتقال کے بعد سے جو بیمار رہنے لگی تھیں تو ان کی طبیعت سنبھلتی ہی نہ تھی۔

وہ پہروں اداس اور خاموش بیٹھی رہتیں، وہ گھنٹوں روتی رہتیں۔ وہ ان کی بیٹی تھی، وہ ان کے دکھوں کو سمجھ سکتی تھی۔ ساری زندگی اپنے جس شوہر کا ساتھ انہوں نے اتنی محبت اور پوری وفاداری سے نبھایا، وہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کے قریب کیوں نہیں تھیں؟

ان کا شوہر ان سے خفا، کچھ کہے سنے بغیر کیوں اس دنیا سے چلا گیا۔ کیا وہ اچھی بیوی نہیں تھیں؟ کیا وہ شوہر کی وفادار نہ تھیں؟ پھر ان کے حصے میں یہ کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ اور پچھتاوا کیوں آیا؟ کس کے سبب آیا؟ کس کی وجہ سے آیا۔ صرف اور صرف ایک شخص۔

ممی یا کمرہ بند کر کے روتی رہتیں یا ایک دم اتنی بیمار پڑ جاتیں کہ تجمل ماموں اور معیز انہیں لئے اسپتال بھاگتے۔ وہ خوف زدہ اور پریشان جب اپنی روتی اور بیمار ماں کو دیکھتی تو فون پر خود سے محبتیں جتاتے دادا سے اسے مزید شکایتیں اور گلے پیدا ہو جاتے۔ دکھوں سے بھرے ان روز و شب میں تجمل ماموں اور ان کی فیملی نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔

اس کے ایک ماموں اور ایک ہی خالہ تھیں۔ خالہ شادی ہو کر برسوں سے کینیڈا میں مقیم تھیں، یہاں واحد قریبی رشتہ دار تجمل ماموں ہی تھے۔ انہوں نے اور اس کے ڈیڈی نے برسوں پہلے برابر برابر واقع یہ دو پلاٹ ایک ساتھ خرید کر ان پر آگے پیچھے ہی اپنے اپنے گھر بنوا کر یہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔

ڈیڈی کے انتقال کے بعد بہن اور بھانجی کی تنہائی اور اکیلے پن کو دیکھتے تجمل ماموں نے دونوں گھروں کے بیچ کی دیوار میں ایک حصہ تڑوا کر اس میں ایک چھوٹا سا گیٹ لگوا دیا تھا جو ہر وقت کھلا رہتا، تاکہ وہ اور ممی خود کو تنہا محسوس نہ کریں اور انہیں تحفظ کا احساس بھی رہے۔

وہ دادا کا تجمل ماموں کے ساتھ موازنہ کیا کرتی۔ تجمل ماموں اور معیز جو ممی کی ایک آواز پر ان لوگوں کے پاس موجود ہوتے تھے، وہ ہر لمحہ ان کی خبر گیری کو موجود رہا کرتے تھے۔

معیز تقریباً ہر رات اپنے گھر کا اپنا کمرہ چھوڑ کر ان کے گھر سونے آجاتا، اس کے ہونے سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ کسی مرد کے سہارے کے بغیر وہ ماں بیٹی تنہا کیسے جئیں گی، ممی اکثر اس بات پر روتیں، اللہ سے شکوے کرتیں کہ اس نے انہیں بیٹی کے ساتھ ایک بیٹا بھی کیوں نہ دیا۔

ان کی ایسی ہی باتوں پر معیز بارہا انہیں یقین دلاتا کہ وہ ان کا بیٹا ہے اور وہ انہیں زندگی میں کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ وہ

ممی کے لئے بھتیجے سے بیٹا بن گیا تھا۔ وہ ان کا احترام بھی کرتا اور ہر مشکل میں ان کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا۔

ممی کا تارک الدنیا ہو جانا، ان کی گوشہ نشینی، بیماری اور ان کے بے حساب آنسو ان سب کے ساتھ ممی کے مزاج میں گزرتے وقت کے ساتھ مزید کچھ اور تبدیلی بھی آ گئی۔ وہ حد سے زیادہ حساس اور زود رنج ہو گئی تھیں، وہ معمولی معمولی باتوں پر چڑ جاتیں، ناراض ہو جاتیں، رونا شروع کر دیتیں اس کی کسی چھوٹی سی بات پر بھی جو انہیں ناگوار گزرتی چیخنا چلانا شروع کر دیتیں، اس سے خفا ہو جاتیں، اپنا بی پی بڑھا لیتیں۔

ان سے اختلاف رائے تو کیا وہ کسی عام سے گھریلو معاملے پر اظہار رائے ہی کی جرأت کر بیٹھتی تو وہ غصے میں آ جاتیں اور اس پر چلانے لگتیں۔ وہ اپنے دادا کی دولت سے متاثر ہے اور انہیں چھوڑ کر دادا کے پاس چلے جانا چاہتی ہے وہ ہر دم اس پر شک کیا کرتیں، اس سے مشکوک رہا کرتیں کہ وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر دادا کے پاس چلی جائے گی۔

وہ انہیں اپنی محبت کا کیسے یقین دلائے، وہ اکثر اکیلے میں رو پڑتی۔ ممی کو انتہائی سخت غصہ آنے لگا تھا اور ان کے غصے کو اگر کوئی قابو کر پاتا تو صرف معیز، فارہ اپنی ہر بات اور ہر کیفیت ممی تک پہنچانے کے لئے معیز سے مدد لیتی۔ وہ اس کی مدد کرتا۔ ممی سے دوری، اپنے گھر کی تنہائی، کسی دوست، کسی ہمدم، کسی کی شدید کمی کے ان ہی ماہ و سال میں اس کی معیز سے دوستی ہو گئی۔

اپنے سے سات سال بڑے ماموں زاد کزن سے وہ دل کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ڈیڈی کی زندگی میں صرف اس کا کزن تھا مگر ان کے بعد تنہائیوں اور آزمائشوں کے سالوں میں اس کا دوست بن گیا۔ وہ اپنی ہر پریشانی، ہر مشکل اور ہر الجھن اس سے شیئر کرنے لگی۔ ممی تک کوئی بات پہنچانی ہے تو معیز کا سہارا لیتی اور خود کو کوئی مشورہ درکار ہے تو معیز سے رجوع کرتی۔

وہ اس سے سات سال بڑا تھا، اس لئے جب وہ انیس بیس سال کی امیچور عمر سے گزر رہی تھی تب وہ تعلیم مکمل کر کے اپنا کریئر بنا چکا تھا، خود کو اسٹیبلش کر چکا تھا۔

وہ اس کے خاندان کا سب سے لائق اور قابل لڑکا تھا۔ معاشیات اور شماریات میں ڈگریز لینے کے بعد بھی اس کا تعلیمی سفر ختم نہ ہوا تھا، وہ ہر آن کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے میں مصروف رہا کرتا تھا۔

آغا جان کا باقاعدگی سے پیسے بھجوانا اور دو، تین ماہ بعد کی فون کالز ان دو معمولات سے ہٹ کر انہوں نے اس کے نکاح یا رخصتی کے حوالے سے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ مگر وہ اس نکاح کو یاد کر کے روز اول ہی کی طرح ڈر جایا کرتی تھی۔ آگے کیا ہوگا، اسے شدید خوف محسوس ہوتا۔

اس سے بات بے بات ناراض رہنے اور غصہ کرنے والی ممی کو بھی اس بات کی بے حد فکر رہتی کہ فارہ کے مستقبل کا ہوگا کیا؟ وہ اپنی بیٹی محمد بختیار خان کے خاندان میں نہیں دیں گی۔ یہ تو طے تھا۔

فارہ کی طلاق یا خلع ایک بالکل طے شدہ بات تھی مگر انہیں اس بات کی فکر لاحق ہوتی کہ طلاق کا داغ لگنے کے بعد ان کی بیٹی کا مستقبل ہوگا کیا؟ اس کی شادی کہاں ہوگی؟ کیسے ہوگی؟ ایسے ہی ایک موقع پر جب ممی اس کے مستقبل کے حوالے سے سخت پریشان اور آزردہ ہو رہی تھیں تب تجمل ماموں نے انہیں تسلی دی کہ وہ فارہ کے مستقبل کی طرف سے بے فکر رہیں، فارہ کو وہ اپنی بہو بنائیں گے اور ان کی خواہش سے بھی بڑھ کر یہ

خود معیز کی خواہش ہے۔

ممی نے بے حد خوشی کے ساتھ تجمل ماموں کے دیئے معیز کے اس رشتے کو قبول کرلیا تھا۔ فارہ اس بات پر حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ وہ معیز کے لئے کزن اور دوست سے بھی بڑھ کر کچھ خاص مقام حاصل کرگئی ہے یہ تو اس کے کہے بنا ہی وہ سمجھتی تھی مگر یہی بات تجمل ماموں کے ذریعے باضابطہ ممی تک پہنچ جانا اور اس کا قبول بھی کرلیا جانا۔

وہ خوش ہونا چاہتی تھی کیونکہ معیز میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کوئی بھی لڑکی اپنے شریک سفر میں چاہ سکتی ہے، مگر وہ کیسے خوش ہوتی۔ پرواز کی خواہش سے پہلے ہی اس کے پر کاٹ دیئے گئے تھے، خوشی کا احساس پانے سے پہلے ہی اس سے خوشیاں چھین لی گئی تھیں۔

اگر ولی صہیب خان کا خوف کسی آسیب کی طرح اس کے وجود پر مسلط نہ ہوتا تو وہ بے خوف وخطر معیز کے خواب دیکھتی، خوشیوں کے خواب دیکھتی مگر اب تو خواب دیکھتے بھی ڈر لگتا تھا۔ کیا ولی صہیب خان کبھی اس کا پیچھا چھوڑے گا؟ کیا کبھی وہ اس جبر کے رشتے سے نجات حاصل کر پائے گی؟ وہ سوچتی اور بہت روتی۔

گھر کا سربراہ نہ رہے تو گھر کا شیرازہ کس طرح بکھرتا ہے، وہ اپنے گھر کو دیکھتی تو بہت اداس ہوتی۔ بہت کڑھتی، ڈیڈی کے بعد بتدریج تبدیل ہوتا ان کے گھر کا ماحول اس کے میڈیکل کے آخری سالوں کے آتے آتے مکمل طور پر تبدیل ہوگیا تھا۔

ممی نے زہرا مامی کے ساتھ ایک این جی او جوائن کرلی تھی وہ سوشل ورک میں مصروف رہنے لگی تھیں، گھر کو مکمل طور پر نوکروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ڈیڈی کی زندگی میں جس گھر میں سوائے صبح سے رات تک کام کرنے والی ایک اکلوتی ملازمہ کے کوئی نوکر نہ تھا، ممی نے وہاں نوکروں کی فوج جمع کر ڈالی تھی۔

آغا جان کے جس پیسے کو ابتداء میں وہ ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھتی تھیں اور وہ صرف فارہ کی تعلیم یا پھر انتہائی ناگزیر گھریلو اخراجات کے لئے استعمال ہوتا تھا، انہوں نے اسے بے دریغ خرچ کرنا شروع کردیا تھا، وہ ہر دوسرے دن اس سے چیک کٹواتیں، کبھی پچیس ہزار، کبھی پچاس ہزار، کبھی ستر ہزار، کبھی اسی اور کبھی لاکھ۔

کبھی گھر کا سارا فرنیچر بدل دیا تو کبھی تمام قالین، کبھی سارے پردے، کبھی گھر پر کوئی پارٹی رکھ لی تو کبھی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں دوست احباب کی گیٹ ٹو گیدر ارینج کر ڈالی۔

کبھی کسی رشتے دار یا دوست کو تحفے میں کچھ قیمتی چیزیں دے دیں تو کبھی کہیں ڈونیشن دے آتیں اور کبھی ان کی مرضی انہوں نے کہاں خرچ کیا، وہ فارہ کو بتانے کی پابند تو نہیں۔ سادہ گھریلو عورت سے بدل کر وہ امیر طبقے کی بلکہ نو دولتی طبقے کی نمائندہ بے حساب پیسے کی نمائش کرنے والی عورت بن گئی تھیں۔

یوں لگتا جیسے وہ پانی کی طرح اس پیسے کو لٹا کر اسے تباہ وبرباد نہیں کررہیں بلکہ محمد بختیار خان کو تباہ وبرباد کر ڈالنا چاہتی ہیں۔ روز روز کے ان بڑے بھاری رقوم کے چیک کاٹنے پر ایک بار وہ ممی سے تھوڑا سا اختلافی انداز گفتگو اختیار کر بیٹھی تو انہوں نے وہ واویلا مچایا، وہ چیخیں، چلائیں اور

روئیں کہ اسے اپنے اعتراض پر شرمندہ نادم ہونے اور پچھتانے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔

"میرا شوہر نہیں رہا محتاج ہو گئی ہوں اپنی اولاد کی۔ بختاور خان نے مجھے ایسا لاچار بنا دیا ہے کہ آج مجھے اپنی ہی بیٹی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور یہ پھر یہ بختیار خان کی پوتی کی مرضی ہے کہ وہ ماں کو پیسہ دے یا نہ دے۔" رو رو کر اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتے وہ اسی وقت اپنا ATM کارڈ نکال کر لائی تھی اور اسے پن کوڈ سمیت ممی کے حوالے کر دیا تھا۔

تجمل ماموں، زہرا مامی معیز کوئی کتنا بھی کہتا رہے یہ پیسہ تمہارا حق ہے، بالکل جائز حق، یہ کوئی احسان یا بھیک نہیں پھر بھی وہ اپنی تعلیمی ضروریات کے لئے اس پیسے کو استعمال کرنے کے علاوہ کسی انتہائی شدید اور ناگزیر ضرورت ہی کے تحت اپنے اکاونٹ سے خوب سوچ سمجھ کر اور بس ضرورت ہی کے مطابق رقم نکالا کرتی تھی مگر اس کے باوجود بھی ممی ہر مہینے اکاونٹ تقریباً تقریباً خالی کر دیا کرتی تھیں۔

ممی پر افسوس، ترس اور ہمدردی کے بعد اب اسے ان پر غصہ آنے لگا تھا، جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔

اس کے فائنل ایئر ہی کے دوران معیز نے اسے باقاعدہ پرپوز کیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب وہ میچور ہو چکی ہے، اس کی تعلیم بھی مکمل ہونے والی ہے لہٰذا اب یہاں سے کسی اچھے وکیل سے مشورہ کیے جانے کے بعد جلد ہی وہاں پر طلاق کا مطالبہ کر دیا جائے گا۔ معیز کا پرپوزل خوشی کی بات تھی مگر اس کی طلاق؟ گزشتہ چار سالوں میں اس کے نکاح یا رخصتی کے متعلق کچھ نہ کہنے والے آغا جان اب اس کے فائنل ایئر کے دوران اکثر باتوں باتوں میں ایسی کوئی بات ضرور کہہ جاتے جو اس کی رخصتی اور شادی سے متعلق ہوتی۔

فارہ یہ شادی کرنا بھی چاہتی ہے یا نہیں، یہ جاننے کی زحمت گوارا کیے بغیر وہ اس کی اور ولی کی شادی کی باتیں کیا کرتے۔ زبردستی کا نکاح اور زبردستی کی شادی۔ واقعی آغا جان کی محبت مطلق العنانی والی محبت تھی۔ ان کے من چاہے اور زبردستی مسلط کردہ فیصلوں کو قبول کیے جاؤ اور بدلے میں ان کی محبت پائے جاؤ۔

شادی دل کی خوشی کا نام ہے یا زبردستی مسلط کردہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو نباہنے کا؟ وہ آنے والی قیامت جواب بہت نزدیک آ چکی تھی کو سوچ سوچ کر خوفزدہ ہوتی، خود کو دباؤ میں محسوس کرتی، ہر وقت ٹینشن میں رہتی، اس صورتحال کا منفی اثر اس کی پڑھائی پر یہ پڑا کہ بے تحاشا محنت کے باوجود فائنل میں اس کا ویسا رزلٹ نہ آیا جس کی اسے امید تھی اور جس کی اس نے دن رات لگا کر محنت کی تھی۔ اس کا اکیڈمک کیریئر اس کا پروفیشنل کیریئر سب ایک شخص کے سبب تباہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

اسے اس شخص ولی صہیب خان سے کچھ اور بھی شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کے رزلٹ کا پوچھنے آغا جان کا فون آیا تھا اور یہاں ممی نے تجمل ماموں اور معیز کے مشورے سے ایک بہت اچھے وکیل سے رابطہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اس کے پاس ہو جانے کا سن کر اس کے لئے کئی بیش قیمت تحائف لے کر ان کے گھر کئی برسوں بعد آئے تب ممی نے اس روز ان سے اعلانیہ فارہ کی طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

پانچ سالوں بعد اگر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اپنی دولت کی خیرہ کن چمک دمک دکھا کر اور محبتیں جتا کر ان کے اور فارہ کے فیصلے کو تبدیل کروا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے تو آج اپنی تمام خوش فہمیاں دور کر لیں۔

فارہ اور اس کی ماں کا پانچ سال بعد بھی وہی فیصلہ ہے جو پانچ سال پہلے تھا۔ ممی کے اگر الفاظ نہیں تو لہجہ ضرور یہی سب کہہ رہا تھا اور پھر اس روز سے ممی اور آغا جان کے بیچ چھڑی غیر اعلانیہ سرد جنگ باقاعدہ اور باضابطہ اعلانیہ جنگ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ممی کے جارحانہ پالیسیوں کے جواب میں آغا جان کا انداز دفاعی حکمت عملی رکھنے والا تھا۔

''اچھا رخصتی کچھ عرصہ کے لئے مؤخر کر دیتے ہیں۔ فارہ کا ہاؤس جاب ہو جائے۔ اگر وہ پوسٹ گریجویشن میں انٹرسٹڈ ہے تو وہ کر لے، رخصتی چند سالوں بعد'' جیسی میٹھی میٹھی، صلح صفائی والی باتیں۔

طلاق کے مطالبے کے ساتھ ہی ممی نے ان سے جائیداد میں فارہ کے حصے کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ طلاق کی بات درست تھی مگر جائیداد؟ اسے اس شخص ولی صہیب خان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا تھا، یہ طے تھا مگر اسے کسی جائیداد میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جائیداد کے اس مطالبے پر اس کا ممی سے اختلاف ہوا تھا۔

''کہہ دو'' میں غلط ہوں۔ تمہارے آغا جان صحیح ہیں۔''

''جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ اپنے دادا کے پاس۔ کروالو ان کے پوتے سے رخصتی۔''

''چھین لی اس ظالم انسان نے مجھ سے میری بیٹی۔ کر دیا اسے ماں سے باغی۔'' وہ ان کے ان عجیب وغریب الزامات و نا راضیوں سے خائف ہو کر مجبوراً چپ تو ہوگئی تھی مگر یہ بات اس کے دل کو بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اپنی زندگی اور گھر کی الجھنوں کا انتہائی منفی اثر اس کی ہاؤس جاب میں خراب ترین کارکردگی کی صورت سامنے آ رہا تھا۔ وہ روز کسی نہ کسی سنیئر ڈاکٹر سے خود کو نااہل، غیر ذمہ دار اور غیر پیشہ وارانہ رویے کا حامل سن کر آتی یہاں سے شدومد سے طلاق کا مطالبہ اور وہاں سے مسلسل ٹال مٹول، اس کا اضطراب اور بے چینی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ممی اور آغا جان اپنی اپنی انا کی جنگ لڑ رہے ہیں، اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے لئے بیٹی یا پوتی نہیں بلکہ ان کی انا، ان کی ضد اور ان کی جیت ہے۔ وہ جس کی طرف ہو جائے وہی جیت جائے گا۔ اس کے اندر ان دونوں کے لئے شدید ناراضی اور خفگی پیدا ہونے لگی تھی۔ ان کے طلاق کے مطالبے کو وہاں سنجیدگی سے نہ لیا جاتا دیکھ کر آخر کار مجبوراً ان لوگوں کو خلع کی طرف جانا پڑا۔

اسے اس کا رخصتی سے قبل کا آدھا حق مہر جو کہ طلاق کی صورت میں مذہبی لحاظ سے اسے لازمی ملنا تھا اس سے دستبرداری کے بعد مجبوراً خلع کا مطالبہ کرتے ممی اب جائیداد میں فارہ کے حصے کے مطالبے سے تو ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔

ان کے وکیل کی طرف سے خلع کا قانونی مطالبہ ان تک پہنچنے کی دیر تھی۔ آغا جان، ولی کے ساتھ اگلے ہی روز ان کے گھر موجود تھے۔ آغا جان کی وہی صلح صفائی والی میٹھی میٹھی باتیں اور ولی کا اشتعال اور غصہ۔

''فارہ کو بلائیں۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔'' ممی جو آغا جان کو کافی ٹھیک ٹھاک سنا رہی تھیں ولی نے ان کی بات کاٹ کر بہت گستاخی سے کہا تھا۔

''فارہ کے بڑے یہاں موجود ہیں، تمہیں جو کچھ کہنا ہے ان سے کہو۔'' ممی کے بجائے معیز نے اسے جواب دیا تھا۔ وہ معیز کی بات کے جواب میں حقارت اور تنفر سے فوراً بولا تھا۔

''اپنے پرسنل معاملات میں کسی تھرڈ پرسن کی شرکت میں پسند نہیں کرتا۔ تمہارے والد بزرگوار کو میں فارہ کے ماموں ہونے کے ناطے یہاں برداشت کرسکتا ہوں مگر تمہاری یہاں موجودگی کا تو سرے سے کوئی جواز ہی نہیں ہے اور ویسے میں یہاں کسی بڑے سے نہیں اپنی بیوی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ لوگ اسے یہاں بلائیں گے یا میں اندر جا کر خود اس سے مل لوں۔''

ولی کی اس بدتمیزی پر ممی اسے ڈرائنگ روم میں بلا لائی تھیں، وہ خود آ کر اپنا جواب ان دونوں دادا پوتے کو دے دے تا کہ انہیں تسلی ہو سکے اور پھر وہیں آ کر اس نے آغا جان سے پہلی بار بالکل صاف اور واضح اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔

''مجھے طلاق چاہئے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہی وہ وہاں سے واپس آ گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اپنے دل کی بات آغا جان تک پہنچا کر اس کا بے چینی و اضطراب ختم ہو جائے گا مگر ان تک اپنا انکار پہنچا دینے کے بعد تو اس کی بے چینی، اضطراب اور بے قراری مزید کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی، اس کا رہا سہا چین، سکون اور آرام سب کچھ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی پہلے اگر بدتر تھی تو اب بدترین ہو گئی تھی۔ ان کے گھر سے جا کر تیسرے دن آغا جان کا فون آیا تھا۔

''میری صحت ٹھیک نہیں، میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں۔ فارہ سے میری بات کرا دو۔'' وہ ممی سے بولے تھے۔

وہ وہاں موجود تھی، ممی اگر ان کی اس سے بات نہیں کروانا چاہتی تھیں تو وہ خود بھی ان سے بات کرنے سے کترا رہی تھی۔ وہ ان سے کیا بات کرے گی، کیا کہے گی۔ یہاں سے طلاق کا مطالبہ کئے جانے کے بعد آغا جان نے اسے اس کے موبائل پر تین چار بار کال کی تھی جو اس نے نمبر دیکھ کر ریسیو ہی نہ کی تھی۔

وہ ولی سے شادی کے لئے راضی نہیں، یہ جاننے کے باوجود وہ اسے اس شادی کے لئے راضی کرنے کی کوشش کریں گے، اس سے محبت کا اظہار کریں گے، وہ ان کے پاس ہمیشہ کے لئے آ کر رہ جائے یہ ان کی شدید خواہش ہے، جیسی باتیں کہیں گے اور وہ جواب میں کیا کہہ پائے گی۔

اپنے زبردستی کے نکاح اور ڈیڈی کی اتنی تکلیف دہ انداز میں موت کے لئے وہ آغا جان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی مگر وہ اس کے دادا تھے، اس کے ڈیڈی کے والد، وہ ان سے کوئی گستاخی یا بدتمیزی تو ہرگز نہیں کر سکتی تھی، اس لئے بہتر یہی تھا کہ ان کی کالز نہ اٹینڈ کی جائیں۔

اس کی بے کلی اور بے قراری میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا ممی کی ریسیو کی اس آخری فون کال کے بعد ان کی کوئی کال نہ آئی تھی۔ ممی نے نہ کبھی اس کی سنی تھی اور نہ سننے پر آمادہ تھیں ہاں اس نے معیز سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ ممی کو سمجھائے، انہیں بتائے کہ فارہ کو جائیداد میں اپنا حصہ نہیں صرف طلاق چاہئے۔ وہ اس جھگڑے کو مزید الجھا کیوں رہی ہیں۔

معیز نے بجائے اُن کے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔ وہ آخر ولی صہیب خان نام کے اس گھمنڈی انسان کے آگے کیوں جھک رہی ہے، کیوں اپنے ہر حق سے دستبردار ہو رہی ہے۔ پہلے ہی وہ خلع کا مطالبہ کر کے اپنے حق مہر سے دستبردار ہو چکی ہے، اب اس لالچی اور دولت پرست

انسان کو جواسے طلاق دیتا ہی صرف اس لئے نہیں کہ اسے جائیداد میں بٹوارا گوارا نہیں کیوں جائیداد سے دستبرداری کا اعلان کر کے جیت کی ایک اور خوشی فراہم کر رہی ہے۔

طلاق اور خلع کے مطالبے کے باوجود وہاں سے پابندی سے اس کے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈلوایا جا رہا تھا، غالباً اس پر اپنی اچھائی، بڑائی اور اعلیٰ ظرفی ثابت کرنے کے لئے اور ممی ATM کے ذریعے اس میں سے بے دریغ پیسہ نکلوا نکلوا کر آدھے ہی مہینے میں اکاؤنٹ میں محض چند ہزار روپوں کا بیلنس چھوڑ رہی تھیں۔ اسے اپنی ممی پر شدید افسوس ہوتا۔ اس کی ماں کی غیرت اور خودداری کہاں جا سوئی ہے، جن سے اتنی شدید نفرت ہے، جن سے ہر رشتہ توڑ دینے کا مصمم عزم ہے، ان کا پیسہ استعمال کرتے کیا ان کی انا اور غیرت نہیں جاگتی؟

پھر اس روز جب اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروائے گئے تازہ ترین پیسوں میں سے ممی نے ہمیشہ کی طرح دھڑا دھڑ پیسے نکلوا کر یہاں وہاں خرچ کرنا شروع کئے تب اس کا ممی پر افسوس خود پر سخت غصے میں تبدیل ہو گیا۔

ممی نے روتے اور طعنے دیتے جو بھی کہا تھا اسے ATM کارڈ ان کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی ایک بار دے کر اب واپس مانگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس روز اپنا بیلنس پتہ چلنے پر اپنا ATM کارڈ ممی کے سپرد کرنے والی جذباتی حرکت پر انتہائی پچھتائی۔

وہ اس کا اور ولی کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا۔ وہ ہر مہینہ پیسہ ڈلواتے وقت جب بیلنس دیکھتا ہوگا تو اس کے متعلق کیا سوچتا ہوگا۔ اسے ولی کے سامنے اپنے کسی امپریشن کے بننے یا بگڑنے کی پروا نہیں تھی۔ وہ اسے جو مرضی سمجھتا ہو مگر پھر بھی اس کی انا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کا دشمن اسے بے غیرت اور خودداری سے عاری سمجھے۔ خرچ وہ پیسہ ممی کرتی ہیں مگر اس میں شامل تو وہ بھی سمجھی جاتی ہوگی۔ اس روز اس نے اپنی اے ٹی ایم سروس منقطع کرا دی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ممی کو کوشش کر کے تحمل اور بردباری سے ایسا کرنے کی وجوہات سے ضرور آگاہ کرے گی مگر ایسا کچھ بھی ہونے کی نوبت ہی نہ آسکی تھی۔ ممی نے شاید اس روز پیسہ نکلوانے کی کوشش کی تھی اور ناکامی کی صورت میں یہ جان گئی تھیں کہ اس نے اپنی اے ٹی ایم سروس کا خاتمہ کرا دیا ہے تب ہی وہ اسپتال سے گھر پہنچی تو ممی شدید غصے کے عالم میں اس کی منتظر تھیں۔

وہ معاملے کو سنبھالنے، ممی کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ زہرا مامی کی آمد نے اس کی ہر کوشش پر پانی پھیر دیا۔

بیچ کا وہ گیٹ کافی عرصہ سے اس کے لئے عذاب بنا ہوا تھا۔ زہرا ممانی یا اس کا کوئی بھی کزن وقت بے وقت جب موڈ ہوتا ان کے گھر اٹھ آتا، ایک تو ان کے اپنے گھر کی پرائیویسی متاثر ہوتی جو اسے بدمزہ کرتی۔ دوسرے زہرا مامی کی موقع بے موقع آمد اور ان کے گھریلو معاملات میں غیر ضروری اور بے جا مداخلت۔

اپنے گھر کے ذاتی معاملات میں اسے ان کی ضرورت سے زیادہ مداخلت کھلتی تھی مگر تجمل ماموں اور پھر معیز کی وجہ سے وہ مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیا کرتی انہوں نے۔

”فارہ! ماں سے ایسے بات کرتے ہیں۔“

”ماں وہ ہے تمہاری یا تم اس کی؟ اب تم اسے بتاؤ گی کہ صحیح کیا ہے؟“ جیسی باتیں کر کے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔

ممی تو پہلے ہی غصے سے بے قابو تھیں ان ہمدردانہ جملوں کے بعد تو پھر وہ کسی صورت کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہ تھیں۔ مزید قصور اس سے یہ سرزد ہو گیا کہ وہ ممی کے جائیداد کے مطالبے کے متعلق ناپسندیدگی بلکہ اپنی مخالفت ظاہر کر بیٹھی اور یہ اس کی کھلی نافرمانی اور بغاوت تھی۔

ان کی ہر غلط بات پر سر جھکا نا فرمانبرداری اور غلطی پر کچھ بولنے کی جسارت بغاوت تھی۔ پھر اس کے ساتھ انہوں نے وہی سلوک کیا جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے کیا جاتا ہے۔

دو ڈھائی سال قبل انہوں نے نورین خالہ کے کہنے پر کہ بڑی عمر کے افراد کو کینیڈا کی امیگریشن نوجوان افراد کے مقابلے میں آسانی سے مل جاتی ہے، لہٰذا وہ بھی امیگریشن کے لئے اپلائی کریں، اپنی درخواست داخل کی تھی۔ وہ سب ایک کھیل جیسا تھا۔ ممی نے محض تفریحاً امیگریشن کے لئے اپلائی کر دیا تھا مگر خوش قسمتی سے انہیں ڈیڑھ دو برس کے اندر ہی کامیابی نصیب ہوئی اور وہاں کی امیگریشن مل گئی تھی۔

وہ پانچ ماہ قبل ممی کا کینیڈین ایمبیسی میں ہونے والا انٹرویو اور اس میں کامیابی، ان کا میڈیکل، ان کی کینیڈا کی امیگریشن سب کچھ بھول چکی تھی۔

اس کے خیال سے وہ سب ممی کی ایک تفریح تھی۔ بس یونہی کہ موڈ بننے پر وہ شاید بہن سے ملنے اور کینیڈا گھومنے پھرنے وہاں چلی جاتیں مگر وہ اپنی کینیڈا کی اس تفریحی امیگریشن کو بیٹی کو سزا دینے کے لئے استعمال کریں گی ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پانچ ماہ سے اپنی اس امیگریشن کا کوئی ذکر بھی نہ کرنے والی ممی نے اپنی گستاخ اور باغی بیٹی کو سزا دینے کے لئے فوراً کینیڈا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ نورین خالہ اپنی بہن کے پاس جا رہی تھیں۔ انہیں فارہ سے ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہا تھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر اپنے دادا کے پاس چلی جائے گی مگر اس کے دل میں تو کبھی معمولی سا شک بھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ اس کی ماں اسے بالکل اکیلا چھوڑ کر، اس سے ناراض ہو کر بھی کہیں جا سکتی ہے۔

✿✿✿

اس کا خیال تھا کہ پوری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دے گی اور اسے نیند نہیں آئے گی۔ ان دنوں جب رات کی تنہائیوں میں اکیلے پن کے دکھ اور خوف کو ساتھ لئے اپنے گھر میں نیند نہیں آتی تھی تو اس جگہ تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ جگہ تو مرکز و منبع تھا اس کے تمام دکھوں اور خوفوں اور ٹینشن کا مگر سوچتے الجھتے بے تحاشا روتے نجانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

ایسی گہری نیند کہ جس کروٹ وہ سونے لیٹی تھی اسی کروٹ جاگی تھی۔

بند پردوں اور کھڑکیوں کے اس پار ایک نیا دن طلوع ہو چکا ہے، پردوں کی جھریوں سے ہلکا ہلکا جھانکتا اجالا خبر دے رہا تھا۔ شاید گزشتہ کئی راتوں کی ادھوری، نامکمل نیند اسے یوں غافل کر گئی کہ وہ بے فکری سے سو گئی۔ اپنے دونوں بیگ اور سوٹ کیس اسے سامنے رکھے نظر آ رہے تھے، وہ بیڈ سے اٹھی۔

سوٹ کیس میں سے اپنا ایک جوڑا نکالا اور فریش ہونے باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر لباس تبدیل کر لیا، بال سکھا لئے، بنا لئے، کٹے ہوئے بالوں کو بنانا کیا تھا انہیں کیچر میں جکڑ لیا۔ اب پردے کھول کر کھڑکی سے باہر جھانکتے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔

اس گھر سے اس کا ایسا تعلق نہ تھا کہ بے تکلفی سے گھومنا شروع کر دے۔اس کے کمرے کی کھڑکی سے گارڈن پورا کا پورا بہت واضح نظر آ رہا تھا،صبح کا صاف شفاف منظر،ہرے بھرے پیڑ،پتے پھول،پھلوں سے لدے درخت،اس قدرتی منظر کی یہ رعنائی اس کے دل و دماغ کو سکون بخشنے لگی۔

وہ رات کے مقابلے میں اس وقت خود کو زیادہ پرسکون اور زیادہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔اپنے یہاں آنے کے فیصلے پر پچھتانے اور الجھنے کے بجائے اس وقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ صحیح یا غلط جب وہ یہاں آنے کا فیصلہ کر کے یہاں آ چکی ہے تو اب اسے باوقار انداز میں اپنے اس فیصلے کو نبھانا چاہئے۔

وہ آغا جان سے کوئی جھوٹ نہیں بولے گی،فی الحال ولی کے ساتھ طے کی اپنی بات نبھاتے خاموش رہے گی مگر ان تین مہینوں کے آخر تک آتے آتے وہ آغا جان کو یہ ضرور باور کرا دے گی کہ جو رشتہ برسوں پہلے انہوں نے جوڑا تھا وہ اس سے ناخوش ہے اور اس کا خاتمہ چاہتی ہے۔لڑائی جھگڑے اور بدمزگی کے ساتھ نہیں بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ۔وہ اس کے دادا ہیں،اس کے بزرگ اور اس کے لئے قابل احترام بھی ہیں اور وہ ہمیشہ ان سے ملا بھی کرے گی اگر وہ اس رشتے کو باوقار اور مہذبانہ انداز میں ختم ہونے دیں۔

اگر یہ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے تو یہ تین مہینے کوئی لمبا عرصہ تو نہیں۔دروازے پر دستک دی گئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک ملازمہ کھڑی تھی،باادب سے انداز میں اسے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دینے۔کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتی وہ نیچے آ گئی۔

ڈائننگ روم کس طرف تھا اسے معلوم تھا۔اس گھر میں دوسری بار کے آنے پر تو نہیں۔ہاں پہلی بار آمد پر وہ کئی مرتبہ اس جگہ کھانا کھانے ڈیڈی کی ہمراہی میں آ چکی تھی۔

ڈائننگ روم میں داخل ہونے پر اسے وسیع و عریض میز کے سامنے ولی،زرینہ اور اس کی بیٹی بیٹھے نظر آئے۔زرینہ اسے آتا دیکھ لینے کے باوجود نہ دیکھنے کا تاثر دیتی اپنی بیٹی کی طرف متوجہ رہی۔فارہ یہاں آ چکی ہے،وہ میز سے کچھ دور رک گئی ہے اور یہ میزبانی اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ اسے ناشتے کی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی جائے،وہ ایسے کسی بھی طرح کے میز زسے قطعاً عاری نظر آ رہی تھی۔

"آؤ فارہ!" زرینہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ولی نے اس سے سنجیدگی سے کہا۔

وہ خاموشی سے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچن سے گرم گرم آملیٹ کی پلیٹ لا کر میز پر رکھی ملازمہ نے جسے وہ لوگ کلثوم کے نام سے پکار رہے تھے،ولی کے اشارہ کرنے پر میز پر موجود ناشتے کے لوازمات میں سے کئی اشیاء فارہ کے آگے رکھ دیں۔

سنجیدہ تاثرات کے ساتھ ان لوازمات کو دیکھے بغیر اس نے کیتلی اٹھا کر ایک کپ میں چائے ڈالی اور آہستہ آہستہ اس کے سپ لینے لگی۔

میز پر موجود وہ تینوں افراد ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔رات آغا جان موجود تھے اور اپنی گفتگو سے ماحول کو خوشگوار بھی بنائے ہوئے تھے تب ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانا اتنا مشکل لگ رہا تھا اس وقت تو دل چاہ رہا تھا یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

ولی اپنی پلیٹ پر نظریں مرکوز کیے آملیٹ کھانے میں اور زرینہ اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھی بیٹی کو ناشتہ کروانے میں مصروف تھی۔ اس بچی کی معصومانہ و بچکانہ باتوں کے سوا ڈائننگ روم میں مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی میں وہاں رکھے فون کی بیل ذرا زیادہ ہی زور سے گونجی تھی۔

''ہیلو''۔ ولی نے اٹھ کر کال ریسیو کی تھی۔

''تمہارا فون ہے۔'' دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس کی بات سن کر کچھ بھی جواب دیے بغیر یہاں تک کہ ہولڈ کیجیے تک بھی کہے بغیر ریسیور ایک سائیڈ میں رکھتے ولی نے اسے اطلاع دی۔

اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا، وہ اندازہ نہیں لگا پائی کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر پیچھے خوبصورت سی چھوٹی میز پر رکھے فون کے درمیان چند قدموں سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔

''فارہ! میرے خدا! تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟'' وہ معیز تھا۔ اس کے ہیلو کے جواب میں وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

''پھوپھو نے مجھے فون پر بتایا کہ تم ان کی اجازت کے بغیر پشاور چلی گئی ہو تو مجھے یقین نہیں آیا۔ مجھے لگا کہ ضرور انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے لیکن اس وقت یہاں اس گھر میں تمہاری آواز سن کر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کیا کہوں۔ میں رات بھر اتنا بے چین اور پریشان رہا ہوں۔ تمہارا سیل فون کہاں ہے؟ میں نے اس پر تمہیں کانٹیکٹ کرنے کی کس قدر کوشش کی ہے۔'' وہ ایک سانس میں بولے چلا گیا۔

کل اس سے فون پر بات کرنے کو راضی نہ ہوتی ماں کو اس کی اتنی پروا تو تھی کہ اس کی تازہ ترین بغاوت سے چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی معیز کو جاپان میں مطلع کر دیا گیا تھا۔ ایک تلخ اور دکھ بھرا تاثر اس کی آنکھ میں در آیا۔ یہ پروا اس کی تھی یا اپنی انا کی شکست۔ اس نے سوچا نہیں کہ سوچنے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔

معیز کی ناراضی بھری باتوں کا جواب دینے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک نظر ولی اور زرینہ کو دیکھا۔ ولی اپنی نظریں پلیٹ پر مرکوز رکھے بالکل پہلے سے بے تاثر انداز میں ناشتہ کر رہا تھا جب کہ زرینہ لاتعلقی کا تاثر دینے کے باوجود اسے دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں کی موجودگی میں وہ معیز سے کیا کہے۔

''سیل فون میرے پاس ہی ہے۔ آغا جان بیمار ہیں، اس وجہ سے مجھے ایمرجنسی میں ولی کے ساتھ یہاں آنا پڑ گیا۔'' وہ ہر ممکن حد تک آواز ہلکی رکھ کر بولی۔

اس نے معیز کو یہ نہیں بتایا کہ کل اپنے گھر سے نکلتے وقت اس نے موبائل آف کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ وہ جب یہاں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو پھر اسے تحمل ماموں ہوں یا زہرا مامی یا نورین خالہ کسی کی بھی نصیحتوں سے پر اور لیکچر دیتی فون کالز کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''فضول باتیں مت کرو آغا جان بیمار ہیں۔ تمہارے کب سے وہاں ایسے تعلقات ہو گئے جو بیماریوں کا سن کر دوڑ پڑو۔ اس طرح کسی سے بھی کچھ پوچھے اور کہے سنے بغیر تم وہاں چلی کس طرح گئیں۔ پھوپھو اور میں لاہور میں نہیں تھے لیکن ممی اور پاپا تو وہاں تھے۔ تم نے پوچھنا یا اجازت لینا تو دور انہیں بتایا بھی نہیں اور یہاں آ گئیں۔ تم سے اس حماقت کی مجھے بالکل امید نہیں تھی فارہ۔'' وہ انتہا سے زیادہ جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ جواباً خاموش رہی۔

''تمہارا وہاں خلع کا جھگڑا چل رہا ہے، میں نہیں مان سکتا کہ تم وہاں اپنی خوشی سے گئی ہو۔ تم مجھے سچ سچ بتاؤ فارہ! تمہیں اس سو رمانے ڈرایا یا دھمکایا تو نہیں ہے۔ کہیں تم اس کی کسی بھی طرح کی دھمکیوں سے ڈر کر تو وہاں نہیں چلی گئیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صرف ہاں کہہ دو، باقی سب پھر میں دیکھ لوں گا۔ مجھے پتہ ہے، وہ پیچھے کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ تمہیں ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ زبردستی تمہیں وہاں رکھ نہیں سکتے۔'' وہ اس کے لئے حد درجہ تشویش اور فکر میں مبتلا لگ رہا تھا۔

اب وہ ولی اور زرینہ کی موجودگی میں اس سے کیا کہے۔ وہ محتاط سے انداز میں آواز کو پہلے سے بھی زیادہ دھیما اور پست کر کے اس سے بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے معیز! آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ پلیز مطمئن رہیں۔

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو تم فوراً لاہور واپس جاؤ۔ میں شام میں لاہور تمہارے گھر پہ فون کروں گا اور وہاں میری کال تم ریسیو کرو گی۔''

معیز نے غصیلے لہجے میں کہتے، خدا حافظ کہے بغیر ریسیور پٹخ دیا۔ وہ جیسے اس کی اس بے وقوفانہ حرکت پر اس سے شدید ناراض ہو گیا تھا۔

''رات آغا جانی کا بی پی چیک کر لیا تھا؟'' ریسیور بڑی بے دلی سے کریڈل پر رکھتے اس نے ولی کی آواز سنی چائے کے سپ لیتا وہ زرینہ سے مخاطب تھا۔

''جی لالہ! رات بھی دیکھا تھا اور ابھی صبح جوس لے گئی تھی تب بھی چیک کیا تھا۔ وہی 90 اور 60 ہے۔'' ٹیلی فون کی میز سے کھانے کی میز تک واپس آتے اس نے ان دونوں بھائی بہن کی بات چیت سنی۔

غالباً اسے باور کرایا جا رہا تھا کہ اس فون کال کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں بلکہ ان کے نزدیک تو اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ کرسی پر واپس بیٹھ کر اپنی چائے کے بے رغبتی سے سپ لیتی وہ معیز کو سوچ رہی تھی۔ کل کتنے غیر متوقع انداز میں ولی اس سے ملا، جتنی غیر متوقع اور حیرت انگیز بات اس سے کی اس سب کے دوران وہ واقع معیز کو بالکل فراموش کر گئی تھی۔

اب کسی وقت بالکل تنہائی میں وہ اس سے فون پر بات کرنا چاہتی تھی۔ ولی نے اسے کسی کو بھی کچھ بتانے سے منع کیا تھا۔ وہ اس سے کئے وعدے کی پابند تو تھی مگر پھر بھی وہ معیز سے بات کر کے اس کا غصہ اور ناراضی ختم کرنا چاہتی تھی۔

وہ ذہین اور معاملہ فہم ہے اور اس کے لئے بہت کیئرنگ بھی۔ ممی کے اسے چھوڑ کر کینیڈا چلے جانے کا الزام دوسروں کی طرح معیز نے اس پر عائد نہیں کیا تھا وہ فارہ کو سمجھتا ہے اور وہ اسے اگر کچھ سمجھانا چاہے گی تو وہ سمجھ لے گا۔ وہ اپنے ایک اچھے دوست کو خود سے ناراض تو ہرگز نہیں رہنے دے گی۔

✿✿✿

''السلام علیکم۔'' اس کے لئے مکمل اجنبی ایک خاصا ہینڈسم مرد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ سلام کی اس بلند آواز پر اپنی سوچوں سے چونک کر نکلتے اس نے دیکھا۔

''وعلیکم السلام۔'' آؤ عباد بیٹھو۔'' ولی نے کرسی پر سے کھڑے ہو کر بڑی خوش دلی سے بے تکلفی اور گرم جوشی سے نو وارد کا استقبال کیا۔

استقبال کا یہ محبت بھرا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ آنے والا کوئی بہت ہر دل عزیز اور خاص الخاص بندہ ہے۔ آنے والا کون ہے؟ اسے سمجھنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں لگے۔

زرینہ کے برابر بیٹھی اس کی بیٹی کرسی پر سے فوراً ہی پاپا کہتی آنے والے کی طرف دوڑ کر گئی تھی۔ بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتا وہ ولی کی طرف بڑھا، اس سے ہاتھ ملا کر وہ ڈائننگ ٹیبل کے آگے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زرینہ کے اکڑے ہوئے مغرورانہ تاثرات کے حامل چہرے پر شوہر صاحب کو دیکھ کر کچھ تھوڑی بہت مسکراہٹ اور نرمی نمودار ہوئی تھی۔

''میں کل بھی آیا تھا۔ تم تھے نہیں۔''

''ہاں کل میں۔'' اسے جواب دیتے دیتے ولی فارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

آنے والا پہلے ہی فارہ کو کافی حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تک تو نہیں مگر بیٹی کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس کی نگاہ فارہ پر پڑی تھی اور وہ سر جھکائے ہوئے لاتعلقی سے میز کو گھورنے کے باوجود جانتی تھی کہ وہ بندہ مسلسل اور ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا ہے، غالباً اس کی اس حیرت اور اچنبھے کو بھانپتے ہی ولی کو تعارف کروانے کا خیال آیا تھا۔

''میں تم لوگوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ عباد الرحمٰن ہمارا کزن بھی ہے اور زرینہ کا شوہر بھی اور عباد! یہ فارہ......''

عباد الرحمٰن خالی عباد الرحمٰن نہ تھا، اس کے تعارف میں باقی سب کچھ بتایا جانا بھی ضروری تھا۔ ہاں وہ صرف فارہ تھی اس کی شہرت کے شاید یہاں ڈنکے پٹے ہوئے تھے۔ ایک مشہور اشتہار کی طرح ''فارہ۔ نام ہی کافی ہے۔'' کہہ دیا جائے۔

لاتعلقی و بے نیازی کا چولا اتار کر اسے اس تعارف کے بعد اس بندے کی طرف دیکھنا پڑا۔

پتہ نہیں وہ پہلے سے اس کے متعلق کیا کیا جانتا تھا یا کیا اس کی اس اکھڑ بیوی نے اسے بتا رکھا تھا، یقیناً کچھ اچھا اور مثبت تو بتایا نہیں گیا ہوگا بہر کیف اسے رسمی انداز میں سلام دعا تو کرنا تھی۔ وہ فارہ کے سلام کے جواب میں خوش اخلاقی سے مسکرایا۔

''میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں لیکن آپ کو شاید یاد نہیں ہوگا۔'' شاید یہ حوالہ اس کے نکاح کے دن کا تھا۔ وہ خود پر جبر کر کے قصداً مسکرائی۔

جو بھی تھا، وہ بندہ مہذب بھی نظر آ رہا تھا اور خوش اخلاق و ملنسار بھی، میاں بیوی ایک دوسرے کی اتنی ضد۔

''بہت اچھا کیا فارہ! آپ نے کہ آپ یہاں آ گئیں۔ آغا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' فارہ کو دیکھ کر جو حیرت اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی وہ اس پر قابو پا چکا تھا۔

اتنے جنگ و جدل کے بعد یہ لڑکی یہاں کیسے آ گئی۔ یہ شاید وہ بعد میں اکیلے میں اپنی بیوی سے پوچھے گا۔

''حذیفہ کہاں ہے؟'' وہ زرینہ سے مخاطب ہوا۔

"سو رہا ہے۔ آپ ناشتہ کریں گے؟"

"نہیں، ناشتہ میں کر کے آیا ہوں۔ ہاں چائے اگر پلا رہی ہو تو پلا دو۔ بس کھڑے کھڑے آغا جان کو دیکھنے آیا ہوں۔ دیکھتے ہی پھر آفس بھاگوں گا۔" زرینہ اس کے لئے چائے نکالنے لگی اور وہ ایک مرتبہ پھر فارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"آغا جان آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔ کل بھی جب میں آیا تھا تو سارا وقت وہ مجھ سے آپ ہی کی باتیں کرتے رہے۔"

اس کی نگاہیں زرینہ کی طرح الزام دیتی تو نہیں تھیں مگر یہ ضرور بتا رہی تھیں کہ آغا جان کی بیماریوں کا سبب کہیں نہ کہیں وہی ہے۔ آخر یہ سب لوگ اسے یہ کیوں باور کرانا چاہتے ہیں کہ ایک شخص جس سے وہ جب زندگی میں پہلی بار ملی تھی تب بھی اسے بستر پر ہی پڑا دیکھا تھا۔ وہ اگر آج صاحب فراموش ہے تو اس کے سبب۔ وہ بہت بری طرح جھنجھلائی۔

عباد کو چائے دے کر زرینہ کچن میں چلی گئی۔ وہ اپنا چائے کا کپ کب کا خالی کر چکی تھی مگر مروتاً بیٹھی ہوئی تھی جبکہ عباد اب بڑی سنجیدگی سے ولی کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ وہ کسی ڈاکٹر کے متعلق ولی کو بتا رہا تھا۔ آغا جان کا جو علاج چل رہا ہے وہ تو چل ہی رہا ہے لیکن ایک سیکنڈ Opinion (مشورہ) کے لئے اگر کسی دوسرے ماہر ڈاکٹر سے بھی ان کا تفصیلی معائنہ کرا لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ ان کے بیچ بہت دوستی اور انڈر سٹینڈنگ ہے یہ ان دونوں کے بات کرنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ زرینہ کچن سے ایک ٹرے لے کر نکلی تھی۔

"زرینہ! آغا جان کا ناشتہ فارہ لے جائے گی۔" ولی اپنی گفتگو کو درمیان میں روک کر زرینہ سے بولا جس کے چہرے پر یک دم ہی ناگواری سے بھرپور تاثر پھیل گیا۔

بھائی کی قطعیت بھرا انداز دیکھ کر وہ کچھ کہہ تو نہیں سکی مگر اس کا غصہ اور جھنجھلاہٹ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ وہ کب سے یہاں سے اٹھنے کا کوئی بہانہ چاہ رہی تھی، اسے یہ تجویز اتنی بھائی کہ جھٹ کرسی پر سے اٹھ کر زرینہ کے ہاتھ سے ٹرے لے کر فوراً ڈائننگ روم سے نکل گئی۔ اس جگہ اور اس ماحول سے نکلتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا۔

"آہا آج تو مزے آ گئے محمد بختیار خان کے۔ ڈاکٹر فارہ بہروز خان کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ مل رہا ہے انہیں۔" وہ جاگے ہوئے تھے، اسے دیکھتے ہی کمزور سی آواز میں خوش دلی سے بولے۔

ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔ خوشیوں سے بھری مسکراہٹ۔

"یہ میں نے نہیں زرینہ نے بنایا ہے آغا جان!" اس نے ٹرے سائیڈ کی میز پر رکھتے فوراً تصحیح کی۔

اس نے کل دیکھا تھا کہ وہ خود اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتے اس لئے اٹھ کر بیٹھنے میں انہیں مدد دی۔ وہ بیٹھ چکے اور اس نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی تب انہوں نے اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پر بیٹھنے کو کہا۔

بیٹھنے کے بعد اس نے انہیں دیکھا تو وہ بہت بھرپور سے انداز میں مسکرائے ہوئے نظر آئے۔ اسے ان کی بوڑھی اور بیمار آنکھیں کسی شرارت سے مسکراتی نظر آئیں۔

''اگر تمہاری شکل بہروز سے نہ ملتی ہوتی تب بھی اسے جاننے والا کوئی بھی شخص تم سے مل کر فوراً بتا دیتا کہ تم بہروز کی بیٹی ہو۔ضدی، اکھڑ اور چہرے پر یہ اونچی، لمبی ناک صرف دکھانے کے لئے نہیں سجی ہوتا بلکہ اصل میں ہر معاملے میں ناک اور انا کے مسئلے حائل ہوتا۔اب اگر ناشتہ ہم نے نہیں بنایا تو ہم ناشتہ بنانے کا کریڈٹ کیوں لیں، چاہے ہمارے اس کریڈٹ لے جانے سے دادا کو خوشی ہی حاصل ہوتی ہے کہ پوتی دادا کے لئے ناشتہ بنا کر لائی ہے ہم تو ٹرے اٹھا کر لانے کا کریڈٹ بھی نہیں لیں گے۔'' ان کا کہنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ یک دم ہی جھینپ سی گئی۔

کوئی اس کی کسی حرکت، کسی عادت کو اس طرح جانچ کر اسے ڈیڈی کے مماثل قرار دے سکتا ہے؟

وہ اسے کل سے بڑے مختلف لگ رہے تھے بلکہ وہ اسے ہمیشہ سے مختلف لگ رہے تھے۔وہ ان سے ان برسوں میں جتنی بار بھی ملی ان سب سے مختلف۔بیمار نظر آنے کے باوجود وہ بہت خوش، بہت مطمئن اور کافی زندہ دل سے لگ رہے تھے۔

''تم نے ناشتہ کرلیا؟'' ناشتہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے اس سے پوچھا۔

''تھوڑا سا میرے ساتھ بھی کھالو۔یہ بیماروں والا بدمزہ سا پرہیزی ناشتہ کیا کروگی۔یہ بسکٹ لے لو۔''

انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا بسکٹس کا ایک ٹن کا ڈبہ اٹھا کر اسے پکڑا دیا جس میں کئی طرح کے بسکٹس موجود تھے۔وہ بسکٹ کھانے لگی۔

پتہ نہیں کب سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب اسے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔

''تم میرے پاس یہاں آئیں، تمہارا بہت شکریہ بیٹا!'' روحی ناراض ہوئی ہوگی ناں تمہارے یہاں آنے پر؟ اس کی اجازت سے آئی ہو یا اجازت کے بغیر؟'' ایک پل کے لئے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔وہ دلیہ کھاتے بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

''میں ممی کو بتا کر آئی ہوں آغا جان!'' اسی وقت عباد، ولی اور زرینہ کمرے میں داخل ہوئے۔

''پوتی کو دیکھتے ہی آغا جان تو بالکل تندرست ہوگئے۔'' عباد انہیں سلام کرنے کے بعد شوخی وشرارت سے بولا۔

''ہاں میری یہ پوتی میرے لئے ملٹی وٹامن کی ٹیبلٹ، کیپسول اور انجکشن سب کچھ ہے۔اسے دیکھتے ہی جسم کی ساری کمزوری غائب ہوگئی اور بیماری کا پتہ نہیں چل رہا کہ کبھی تھی بھی کہ نہیں۔'' عباد کے ساتھ ان کی شوخ وشریر گفتگو چل رہی تھی۔

ولی صوفے پر بیٹھا ان دونوں کو دیکھ زیادہ رہا تھا اور بول بہت کم رہا تھا اور زرینہ کل ہی کی طرح آغا جان کو زیادہ بولنے سے منع کرتی، دوا کھلاتی، بی پی دیکھتی بڑی مصروف سی تھی۔آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھ کر جب عباد جانے کے لئے اٹھا اور اسے رخصت کرنے زرینہ اور ولی بھی ساتھ چلے گئے تب وہ اس سے آہستگی سے بولے۔

''بیٹا! آج کسی وقت ممی کو فون کر لینا۔ان سے کہنا ناراض نہ ہوں، میں جلدی واپس آجاؤں گی۔'' اتنی دیر میں اسے لگا تھا کہ جو بات ان کے بیچ ادھوری رہ گئی ہے وہ اسے بھول گئے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔

اسے لگا اب وہ ممی کا ذکر نکالتے، ان کے خلاف کچھ کہتے اس کی طلاق کے مسئلے پر کچھ کہیں گے۔شاید اپنی بیماری کو وجہ بنا کر جذباتی انداز اختیار کر کے اسے اس کا خلع کا مطالبہ واپس لینے کو آمادہ کرنا چاہیں گے اپنی بیماریوں کو ہتھیار کی طرح دوسروں کو جذباتی شکست دینے کے لئے

استعمال کرنا تو انہیں بخوبی آتا تھا۔ وہ ایسی کسی بات پر کیا کہے گی، وہ یہ سوچ رہی تھی مگر وہ ممی کے اتنے ذکر کے بعد موضوع تبدیل کر چکے تھے۔

وہ اب اس سے یہ کہہ رہے تھے کہ اگر وہ ان کی بیماری کا سن کر ولی کے ساتھ جلدی جلدی میں یہاں آئی اور اپنی ضرورت کی سب چیزیں نہیں لا سکی ہے تو وہ زرینہ سے کہہ دیتے ہیں، وہ اسے شاپنگ کرا لائے گی۔ وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ بازار چلی جائیں۔

وہ اس سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ وہ جب تک یہاں ہے بالکل بے تکلفی اور پورے حق کے ساتھ رہے۔ خود کو مہمان نہ سمجھے۔ یہ گھر جتنا ولی اور زرینہ کا ہے اتنا ہی اس کا بھی ہے۔ وہ اس گھر کی مالک ہے نہ کہ مہمان اور اجنبی۔ وہ زندگی میں دوسری بار اس طرح ان کے ساتھ بالکل تنہا بیٹھی تھی۔

پہلی بار تب بیٹھی تھی جب وہ اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروانے گئے تھے۔ اس کے ساتھ فارم لینے کے لئے آئے انہوں نے ولی کو کہیں کسی کام سے بھیج دیا تھا اور پھر جب وہ فارم خرید چکی تب وہ اس سے بولے تھے۔

''ولی تو ابھی آیا نہیں ہے۔ چلو، ہم یہیں بیٹھ کر فارم فل کر لیتے ہیں۔'' آج وہ کھڑے کھڑے کئی لوگوں کو داخلے کے فارم بھروا دیتی تب میڈیکل کالج میں داخلے کا وہ فارم اسے بے انتہا مشکل اور پیچیدہ لگا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔

آنکھوں پر ریڈنگ گلاسز لگائے انہوں نے اس کا فارم بھروانا شروع کیا تھا تب اپنے نکاح، ڈیڈی کے انتقال اور پھر انہیں پشاور اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ان کی دو تین بار آمد کے علاوہ یعنی کل چار یا پانچ دفعہ سے زیادہ وہ ان سے ملی نہیں تھی اور ان کے فارم فل کروانے اور روانی سے انگریزی بولنے پر اسے ان کے تعلیم یافتہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔

تب اسے یہ جان کر زیادہ دکھ ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ اتنے جابر اور دوسروں پر اپنے فیصلے مسلط کر دینے والے انسان ہیں۔ گارجین کے طور پر انہوں نے ہر جگہ اپنا نام لکھوایا تھا اور جہاں کہیں فارم پر سرپرست کے دستخط چاہئے تھے وہاں انہوں نے دستخط بھی کئے تھے۔ انہوں نے ہر جگہ بڑے سنبھل سنبھل کر دستخط کئے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی، ایسی لرزش جیسی کسی بہت بیمار اور کمزور ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ بڑے نرم و شیریں، محبتوں میں ڈوبے لہجے میں وہ اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔

''میری خواہش تھی، تم میڈیکل کی تعلیم پشاور سے حاصل کرتیں، میرے ساتھ، میرے پاس رہتیں لیکن خیر جو میرے رب کی مرضی۔''

وہ ان سے ہدایات لیتی فارم فل کر رہی تھی اور وہ یہ دیکھنے کے ساتھ کہ فارم صحیح بھرا جا رہا ہے یا نہیں اس کے ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

''داخلہ تو تمہارا انشاء اللہ ہو ہی جائے گا۔ اب میڈیکل کالج سے بڑے شاندار انداز میں تمہیں ایم بی بی ایس کر کے نکلنا ہے جس روز تم ڈاکٹر بن جاؤ گی ناں فارہ! بہروز کی روح بہت خوش ہو گی۔ تمہیں ڈاکٹر بنانے کی اسے بہت خواہش تھی۔'' تب اس نے بہت چونک کر سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

اس کے اسکول، کالج کا ہر فارم ڈیڈی اسے پاس بٹھا کر بھروایا کرتے تھے وہ اس وقت ان کی شدید کمی محسوس کرتے حد درجہ دل گرفتہ تھی، اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھی آ رہے تھے۔ آغا جان کے لبوں سے ڈیڈی کا نام سنتے ہی اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے ان کی آنکھوں میں

بھی نمی نظر آئی اور پتہ نہیں کیوں لیکن اس کا دل چاہا، وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر ڈیڈی کو یاد کر کے بہت سارو ئے ، بہت آنسو بہائے ۔

جو اس کے باپ کی موت کا سبب بنا، وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رونا چاہتی ہے، اپنی اس عجیب وغریب خواہش کو بمشکل دبا کر خود کو جھڑکتی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر اپنی آنکھوں کی نمی پر قابو پاتے انہوں نے اس سے بھر لئے جانے والے فارم کو دوبارہ چیک کرنے کو کہا تھا اور جب فارم بھر کر وہ ان کے ساتھ بینچ پر سے کھڑی ہوئی تب وہ اس سے بولے تھے۔

''اب ہم بینک چلیں گے۔ وہاں تمہارا اکاؤنٹ کھلوانا ہے جوائنٹ اکاؤنٹ ہوگا تمہارا ولی کے ساتھ لیکن عملاً اسے آپریٹ تم ہی کرو گی۔ چیک بک بھی تمہارے ہی پاس رہے گی۔ یہ مت سمجھنا کہ اس میں موجود پیسے بس صرف تمہاری پڑھائی اور گھر کے روزمرہ کے اخراجات کے لئے ہیں۔ تمہارا جیسے دل چاہے ان پیسوں کو خرچ کرنا۔ ممی سے بھی کہنا وہ ان پیسوں کو استعمال کیا کریں۔ اس کے علاوہ اور بھی پیسے چاہئے ہوں یا کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً مجھے فون کرنا۔ جو بھی چیز چاہئے ہو جو بھی بات ہو جو بھی پریشانی ہو، جیسے بہروز سے کہتی تھیں ایسے ہی مجھ سے کہنا۔ میں نے تمہارے لئے ایک گاڑی بھی بک کروائی ہے۔ گھر پر جو گاڑی ہے، وہ ممی کے استعمال کے لئے چھوڑ دینا۔ تم کالج دوسری گاڑی میں جایا آیا کرنا۔

ممی سے پوچھ لینا اگر وہ مان جائیں تو میں ڈرائیور بھی بھجوا دوں گا۔ ورنہ پھر یہیں سے کوئی ڈرائیور تمہارے لئے تمہاری ممی رکھ لیں گی۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میری فارہ کی کسی ضرورت میں کوئی کمی نہ آئے۔'' پھر اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد وہ اسے گھر واپس چھوڑنے آئے تب ممی سے بولے تھے۔

''روحی بیٹا! تم میرے پاس آکر نہیں رہنا چاہ رہیں، کوئی بات نہیں۔ بس مجھے اتنی اجازت دے دو کہ کبھی کبھار فون پر تم لوگوں سے بات کر لیا کروں۔'' ممی نے بعد میں یہ بات تجمل ماموں کو بتائی تو وہ بولے۔

''کوئی ہرج نہیں فارہ کے ان سے بات کرنے میں۔ فارہ ان کی پوتی ہے اگر وہ اس سے رابطہ رکھنا چاہتے ہیں فون پر بات کرنا چاہتے ہیں تو کرنے دو۔ تم بھلے نہ بات کرو۔''

''رابطہ رکھنے دوں؟ بات کرنے دوں؟ آج ایک دن فارہ ان کے ساتھ گئی تھی تو آکر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ آغا جان اسے آج بہت مختلف لگے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا وہ زور زبردستی سے فارہ کی شادی کی کوشش کریں گے مگر جو پلان انہوں نے بنایا ہے وہ تو میری سوچ سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ زور زبردستی سے وہ میری بیٹی کا دل تو نہیں جیت سکیں گے ناں؟

اپنا پیسہ کھلے ہاتھوں سے خرچ کر کے اور خوب محبت جتا کر وہ میری بیٹی کا دل اور اس کا اعتماد جیت لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کی طرف داری کرتے میرے مقابل کھڑی ہو سکے۔ جیسے انہوں نے میرے شوہر کا دل مجھ سے پھیر کر اسے مجھ سے دور کیا تھا ایسے ہی وہ میری بیٹی سے کروائیں گے۔ مجھ سے ان کی نفرت اور انتقام کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوگی جب تک وہ میری بیٹی کو میری مخالفت میں نہ کھڑا کر دیں۔'' تب ممی کی باتیں چھپ کر سنتی وہ بہت بری طرح شرمندہ ہوئی تھی۔

آغا جان کی لگاوٹ بھری میٹھی میٹھی باتیں اور اس پر خرچ کیا جانے والا ڈھیر سارا روپیہ، وہ کتنی آسانی سے ان کی باتوں میں آنے لگی تھی، یہ

تک بھلا کر کہ انہوں نے اکاؤنٹ اس کے نام کھلوا کر ممی کو بے عزت کیا ہے۔

اس کی ان کے ساتھ بالکل تنہا وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی پھر اس کی میڈیکل کی تعلیم کے دوران وہ بھی لاہور آئے نہیں تھے محض فون پر رابطہ رکھتے تھے اس کے رزلٹ کا سن کر جب وہ لاہور ان کے گھر آئے اس کے بعد جب بھی آئے تو ہر بار ان کی ملاقات میں ممی، تجمل ماموں، زہرا مامی، معیز اور ولی سب موجود ہوا کرتے تھے۔

اتنے برسوں بعد آج وہ زندگی میں دوسری بار ان کے ساتھ یوں اتنے قریب اور تنہا بیٹھی تھی۔ آج وہ اٹھارہ سال کی نا سمجھ و کمسن فارہ بہروز خان نہ تھی جو کسی کی بھی چکنی چپڑی میٹھی میٹھی باتوں میں آجائے مگر پھر بھی اس وقت وہ اپنے دل میں وہی کیفیت پیدا ہوئی محسوس کر رہی تھی جو چھ سال پہلے داخلہ فارم بھرتے وقت اس بینچ پر بیٹھ کر کی تھی۔ اس کے دل میں ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے کی خواہش بڑی شدت سے مچل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر آنسوؤں کا ایک سمندر ہے جو بہہ نکلنے کو بے قرار ہے۔ وہ اپنی اس عجیب و غریب اور نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت سے ہراساں ہوئی۔

وہ کیا جادوگر ہیں، انہیں کیا لوگوں کو اپنے زیر اثر کرنا، ہپناٹائز کرنا آتا ہے۔ وہ کیا کوئی جادوئی اسم پڑھ کر پھونکتے ہیں کہ ان کے مقابل بیٹھا بندہ پھر ان کے سوا ساری دنیا سے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ڈیڈی کے ساتھ بھی تو ایسا ہی کوئی جادوئی عمل کیا تھا۔

ڈیڈی یا تو ان سے اتنے ناراض تھے کہ زندگی بھر کبھی ان کا نام تک اپنے لبوں پر نہ لائے اور جب ان سے ملے تو چند ہی دنوں میں اتنے بدل گئے کہ نہ اس کے ڈیڈی رہے نہ ممی کے شوہر بس صرف محمد بختیار خان کے بیٹے رہ گئے۔

کمرے کا دروازہ بڑے دھماکہ خیز انداز میں کھول کر زرینہ کی بیٹی اندر آئی تھی چونک کر اسے دیکھتے وہ اپنی عجیب و غریب جذباتی کیفیت سے باہر نکلی۔ جتنے دھماکے سے وہ اندر آئی تھی ایسے ہی اچھلتے انداز میں وہ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر اس کے اور آغا جان کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

”فرمایئے بڑی بی کیسی ہیں آپ؟“ آغا جان تکیوں سے کمر ٹکا کر بیڈ پر نیم دراز تھے۔ نیلی جینز جس کے ایک پائنچے پر باریک ڈول بنی ہوئی تھی اس کے اوپر گہرا گلابی رنگ کا خوب موٹا سویٹر اور سر پر سویٹر کا ہم رنگ اونی ٹوپا پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

گول مٹول، خوب صحت مند وہ ویسے ہی تھی، سردی کے سبب جو اتنے ڈھیر سارے لوازمات پہن رکھے تھے ان سے اور بھی موٹی لگ رہی تھی۔ فارہ دلچسپی سے اس بچی کو دیکھنے لگی۔ اس کے سرخ سرخ گال ہولے سے کھینچنے کو بھی دل چاہا۔

”اس کی باتیں سنو بھی۔ ایسی پکی نانیوں، دادیوں جیسی باتیں کرتی ہے۔“ آغا جان اسے بتانے لگے۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”عشنا عبادالرحمٰن!“ اس نے بڑی معصومانہ سی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے اپنے سامنے رکھا بسکٹوں کا ڈبہ اس کے سامنے کیا، اس نے فوراً ہی بے تکلفی سے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

”تم بڑی ہو بھائی سے؟“

”نہیں میں اور حذیفہ Twins ہیں۔ وہ کھاتا نہیں ہے ناں اس لئے بڑا نہیں ہوتا۔“ اس نے فوراً ہی آغا جان کی بات کی تصدیق کرتے

پکے پن کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔

"دیکھا۔ کیا کہا تھا میں نے تم سے۔" آغا جان بلند آواز سے قہقہہ لگا کر ہنسے، وہ بھی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نجانے کتنے مہینوں بعد آج وہ یوں ہنسی تھی۔ اپنی ہنسی اسے خود اجنبی بھی لگی اور بہت اچھی بھی مگر اس کی یہ طویل عرصہ بعد کی ہنسی ولی کو دیکھتے ہی فوراً غائب ہو گئی۔

ڈینمز، کاٹن شرٹ، سویٹر والے عام حلیے کے یکسر برعکس اس وقت وہ خاصی فارمل قسم کی تیاری میں تھا۔ دائیں ہاتھ میں بریف کیس پکڑے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کے منظر کو دیکھ کر اگر اسے کوئی حیرت یا تعجب ہوا بھی تھا تب بھی اس نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے چہرے پر سے مسکراہٹ کا ہر نشان ہٹا کر سنجیدگی طاری کر لی۔

وہ اس پر اور عشنا پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا آغا جان کے پاس آ گیا اور ان کے قریب جھک کر بولا۔

"آغا جان! میں جا رہا ہوں۔" اس نے ان کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوما، وہ بڑی محبت اور چاہت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ان کی طرف دیکھتے ہر بار اس کے چہرے کا بے تاثر اور خشک انداز گہری محبت میں بدل جاتا تھا۔ وہ اس سے اور اپنی بھانجی سے مکمل طور پر لاتعلق آغا جان کی طرف متوجہ تھا۔

"جاؤ بیٹا!" انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

"اور میری فکر میں زیادہ ہلکان ہونے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خوب مزے میں ہوں۔ دو دو ڈاکٹرز میری خدمت کرنے کو موجود ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے اس سے بولے۔

وہ جواباً ہنسا نہیں بلکہ سنجیدگی سے سر ہلاتا ان کے پاس سے ہٹ گیا۔

وہ جس تیز رفتاری اور عجلت میں اندر آیا تھا اسی سے فوراً چلا بھی گیا۔

"بہت فکر رہتی ہے اسے میری۔ آفس چلا بھی جائے تو پیچھے دس دس بار فون کر کے میری خیریت پوچھے گا۔ فون پر میری ہلکی سی کھانسی کی آواز بھی سن لے تو سب کام چھوڑ کر بھاگا بھاگا گھر آ جائے گا۔" اگر یہ جملے اس نیت سے کہے جا رہے تھے کہ ولی صہیب خان کے لئے اس کے دل میں کوئی سوفٹ کارنر پیدا ہو جائے گا تو یہ ایک بے کار اور بے مقصد کوشش تھی۔

"بہت چھوٹی عمر میں بڑی بھاری ذمہ داریاں پڑ گئیں میرے بچے پر۔ نوجوانی کا بے فکری کا زمانہ گزارنے کا موقع بھی نہ مل سکا، وقت سے پہلے بڑی بھاری بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانا پڑ گئیں اسے۔" وہ اپنے بچے کا ذکر ابھی ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان کے ہنستے مسکراتے چہرے پر ایک دم ہی اداسیاں پھیل گئی تھیں۔

"بائیس سال کی عمر اتنی بھاری ذمہ داریاں اٹھانے کی تو نہیں ہوتی۔ میں تو پہلے بھی کاروباری اور زمینوں کے معاملات کم ہی دیکھا کرتا تھا، سب ذمہ داریاں صہیب نے اٹھائی ہوئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے دفتر چلا گیا یا گھر پر بیٹھے بیٹھے ہی زمینوں کا حساب کتاب دیکھ لیا مگر صہیب

نے یوں اچانک جا کر تو میری کمر ہی توڑ دی۔ کوئی کام سنبھالنا تو دور میں تو خود کو سنبھالنے لائق بھی نہیں رہا۔

بہروز نے صہیب کے سوئم والے دن قبرستان سے آتے مجھ سے کہا تھا۔'' آغا جان! آپ کا ایک بیٹا چلا گیا تو کیا ہوا دوسرا بیٹا تو زندہ ہے۔'' اس نے مجھ سے یہاں سارا کاروبار اور سارا کام سنبھالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ولی اور زرینہ کو سینے سے لگاتے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ان بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔'' آج سے میں سمجھوں گا'' میری صرف ایک بیٹی نہیں میرے تین بچے ہیں۔'' اور ہوا کیا؟ مجھ سے اتنے وعدے کرنے والا وہ کسی بھی وعدے کو نبھانے کے لئے زندہ ہی نہ رہا۔'' اپنی آنکھوں کی نمی اس سے چھپانے کے لئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک دو منٹ تک خاموش ہی رہے۔

عشنا کھیلتی کودتی کمرے سے جا چکی تھی۔ کمرے میں اس وقت صرف وہ دونوں ہی تھے۔

'' آمنہ اور صہیب کی زندگی ہی میں ولی امریکہ گیا ہوا تھا پڑھنے۔ وہ وہاں سے گریجویشن کر چکا تھا، لاء اسکول میں اس کا پہلا سال اختتام پر تھا جب صہیب کا انتقال ہوا تب وہ سب چھوڑ چھاڑ کر پاکستان واپس آ گیا۔

صہیب کے بعد بہروز بھی نہ رہا تو وہ اس فکر میں واپس گیا ہی نہیں کہ یہاں بزنس کون سنبھالے گا، زمینوں کے معاملات کون دیکھے گا۔ بعد میں میں نے بہت کہا کہ بچے یہاں سب کام ہوتے رہیں گے تم اپنی پڑھائی پوری کرو۔ مگر وہ واپس جانے کے لئے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میرے بہت کہنے سننے اور ناراض ہونے پر وہاں گیا بھی تو بس اپنا لاء میں گریجویشن مکمل کر کے واپس آ گیا۔

'' اسے Taxation میں ماسٹرز کے لئے ورجنیا لاء اسکول سے اسکالرشپ آفر ہوئی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ایسے موقع زندگی میں روز روز نہیں ملتے Taxlawyer بننا، Taxation میں اعلیٰ ڈگری لینا تو تمہارا خواب تھا کیوں اپنے کیریئر کو اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہو مگر اس نے پھر میری ایک نہ مانی۔ کہنے لگا آپ کی خاطر میں نے اپنا لاء میں گریجویشن پورا کر لیا، بس اب مجھے یہاں سے کہیں جانے کے لئے مجبور نہ کریں۔''

وہ اس ذکر سے نہ تب متاثر ہوئی تھی نہ اب۔ بطور Tax Lawyer شاندار کیریئر، ورجنیا لا اسکول کی اسکالرشپ، وال سٹریٹ کے دلکش بلاوے، ڈالرز کی خیرہ کن چمک دمک، عروج، کامیابیاں، یہ سب یہاں اس کروڑوں کی جائیداد سے زیادہ پرکشش تو نہیں ہو سکتے تھے، ان سب کی قربانی دے کر ٹھکرا کر، انہیں چھوڑ کر واپس پاکستان آ کر اس نے کس پر احسان کیا تھا؟

جس کروڑوں کی جائیداد کا وہ تن تنہا وارث بنا ہوا تھا اس کی ذمہ داریاں سنبھال کر، دیکھ بھال کر کے وہ کس پر احسان کر رہا تھا۔ کاروبار، زمینوں اور باغات کی دیکھ بھال اور تمام امور کی ذمہ داریاں سنبھال کر بوڑھے دادا کا دل بھی جیت لیا، سب کچھ اپنے نام بھی کروا لیا اور آپ کی خاطر کیریئر چھوڑ آیا ہوں کے احسان تلے انہیں دبا بھی لیا۔ وہ ان کا دست راست تھا۔ آغا جان اگر بادشاہ تھے تو وہ ان کا وہ ولی عہد جس نے ان کی زندگی میں ہی میں سارے اختیارات اپنے نام کروا رکھے تھے۔ اسے دولت، جائیداد سے کوئی مطلب غرض نہ تھی لیکن اتنا تو بہر حال اس کے علم میں تھا کہ آغا جان نے اپنی وصیت تیار کی ہے یا نہیں اور باقاعدہ کوئی چیز کسی کے نام کی ہے یا نہیں مگر ولی صہیب خان کو یہ قانونی حق ضرور دے رکھا ہے کہ جہاں جہاں محمد بختیار خان کے دستخط ہو سکتے ہیں وہاں وہاں ولی صہیب خان کے دستخط سے بھی کام ہو سکتا ہے۔

ان کے ہر کاروباری معاملے، جائیداد سے متعلق امور، روپے پیسے کا لین دین اور تمام کے تمام بینک اکاؤنٹس میں ان کے ساتھ جو دوسرے دستخط ہو سکتے تھے چل سکتے تھے اور چل رہے تھے وہ صرف اور صرف ولی صہیب خان کے تھے۔ اب وہ اس سے اس بات پر کیونکہ متاثر ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے قیمتی تعلیمی سال اس کاروبار، جس کا وہ مالک ومختار بنا بیٹھا ہے کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ضائع کیے۔

اس کی ان قربانیوں کو وہ قربانیاں اس وقت مانتی جب وہ اپنا کیریئر اور کامیابیاں چھوڑ کر ایک بے تحاشا امیر کبیر دادا کے لیے نہیں بلکہ ایک غریب، بے آسرا دادا کے لیے واپس آیا ہوتا۔

✪✪✪

''آغا جان! آج لنچ میں کیا لیں گے آپ؟'' زرمینہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''پشاوری بیف تکہ، خوب سارے گھی میں پکا کڑھائی گوشت، خوب تیز مسالوں اور نمک والے چپلی کباب اور میٹھے میں دیسی گھی کی خوشبوؤں سے مہکتا اخروٹ کا حلوہ۔''

انہوں نے بڑی روانی سے اپنا لنچ کا مینیو اس کے گوش گزار کیا اور ساتھ ہی شرارتی نگاہوں سے زرمینہ کو دیکھا ایسے جیسے جانتے تھے وہ اس بدپرہیزی کا سن کر ہی اپنا دل تھام لے گی۔

''ہائے ہائے کیا دن تھے جب بختیار خان ایسے مزے مزے کے کھانے کھایا کرتے تھے۔ اب تو نصیب میں بدمزہ پرہیزی کھانے لکھ دیئے گئے ہیں۔'' شرارتی مسکان ہنوز لبوں پر لئے انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

''تو زرمینہ عبادالرحمٰن! قصہ کچھ یوں ہے کہ آپ جو مرضی ہو اور جو دل چاہے کھلا دیں، بغیر گھی اور نمک کے ہر سالن ایک سا ہی لگتا ہے۔''

زرمینہ شاید ان کے ان کمنٹس پر کوئی بے تکلفانہ تبصرہ کرنا چاہتی تھی اس نے لب کھولے مگر پھر اس کی موجودگی کے سبب سنجیدہ ہی کھڑی رہی۔

''میرے لئے کچھ بھی بنالو بیٹا! ہاں صدو سے کہنا، لنچ میں کوئی نہ کوئی چائنیز ڈش ضرور بنالے۔ یہ جو میری پوتی صاحبہ ہیں نا، انہیں پھیکے سیٹھے بدمزہ، چینی کھانے بہت پسند ہیں۔'' وہ اس کی طرف اشارہ کرتے زرمینہ سے بولے وہ فارہ کی طرف دیکھے بغیر محض سر ہلاتی کمرے سے فوراً واپس چلی گئی۔

اس نے انہیں اپنی پسند ناپسند تو کبھی نہیں بتائی تھی۔ ان سے اس کی فون پر ہمیشہ بہت نپی تلی اور پرتکلف گفتگو ہوتی تھی اور اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے کبھی انہیں کھانے پینے کی اپنی پسند ناپسند سے آگاہ کیا ہو۔

''مجھے بہروز نے بتایا تھا۔ صہیب کے انتقال پر جب تم اور روحی بھی یہاں آ گئی تھیں، پھر اس رات بہروز نے مجھے تمہاری بہت باتیں بتائی تھیں۔'' وہ اس کی حیرت بھانپتے فوراً بولے۔

وہ اس دن کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے نہ کچھ بولی اور نہ خود کو مزید کچھ سوچنے دیا۔

''بیٹا! زرمینہ کے کسی رویے کا برا مت ماننا۔ تھوڑی جذباتی اور غصے کی تیز ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ میری دونوں کی دونوں پوتیاں

ایسی ہی ہیں۔ضدی، جذباتی، غصے کی تیز تھوڑی سی مغرور مگر دل کی بہت اچھی۔"

انہوں نے شاید یہ جان لیا تھا کہ اس وقت اس گھر میں موجود یہ دو لڑکیاں، ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت اور عداوت رکھتی ہیں اور ان کے تعلقات رسم دنیا کا لحاظ رکھتے سرسری، رسمی یا اوپری انداز میں بھی ہرگز اچھے نہیں۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ مگر دل میں اس نے یہ ضرور سوچا کہ جس دوسری پوتی کا ذکر ہے، وہ خود ہے اور اسے زندگی میں پہلی بار کسی نے ضدی اور جذباتی قرار دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔

اپنے متعلق اس نے اچھے بھی اور برے بھی کئی طرح کے کمنٹس سن رکھے تھے مگر ضدی اور جذباتی اسے کسی نے پہلی بار کہا تھا۔ اس کے دل کی اچھائیاں بھی شاید کسی نے پہلی بار دریافت کی تھیں۔ اس کے متعلق سب سے اچھے کمنٹس معیز دیا کرتا تھا۔ وہ اسے سادہ، مخلص، خوش اخلاق، ذہین اور صاف گو قرار دیا کرتا تھا۔ ان میں ذہین اور مخلص وہ تھی۔ سادہ والی خوبی ذرا مشکوک سی تھی اور خوش اخلاق تو وہ ہرگز نہیں تھی۔

یہ وہ خوبی تھی جو معیز اس میں زبردستی دریافت کر کے لاتا تھا۔ وہ خوش اخلاق صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی جو اسے اچھے لگتے تھے اور جو اچھے نہ لگتے پھر وہ مروتاً، رسماً، اخلاقاً مصلحتاً یا دنیاداری کے لئے بھی ان سے اخلاق نہ برتا کرتی تھی۔ اچھے لفظوں میں اسے صاف گو، دل کی صاف، جو دل میں وہی چہرے اور زبان پر، منافقت سے عاری وغیرہ کہا جا سکتا تھا اور برے الفاظ میں بدلحاظ، منہ پھٹ، بداخلاق، بے مروت اور بدتمیز۔

اس خوبی کے ساتھ وہ نڈر اور بے خوف بھی تھی، جو اس کے دل میں ہے وہ زبان پر لاتے کبھی ہچکچاتی نہیں تھی۔ لوگ مصلحت سے کام لیتے ہیں اور وہ ہر بات صاف صاف لوگوں کے منہ پر بول کر دوست کم اور دشمن زیادہ بنا لیا کرتی تھی۔ اسے احساس ہوا آغا جان، زرمینہ اور اس کی عادات کو ایک سا بالکل درست قرار دے رہے ہیں۔

اس گھر میں وہ شاید کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی مگر یہ جرأت صرف زرمینہ عبادالرحمٰن ہی میں ہے کہ وہ منہ پر اس سے نفرت اور بیگانگی کا اظہار کر سکے۔ جو اسے پسند نہیں، وہ اس کے ساتھ مصلحتاً بھی کیوں اخلاق برتے۔ جو اس گھر میں اس کے ساتھ سب سے برا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا وہ اس کے متعلق پہلی مرتبہ کچھ مثبت سوچ رہی تھی۔

اور جو بھی ہے زرمینہ عبادالرحمٰن منافق تو نہیں۔

"ویسے تو ضد، غصہ غرور اور اکڑ ہماری خاندانی صفات ہیں مگر تم دونوں بہنوں میں یہ ذرا زیادہ ہی شدت سے پائی جاتی ہیں۔ نوجوانی میں میں بھی ایسا ہی تھا، بہروز بھی ایسا ہی تھا، ہاں صہیب تھوڑا مختلف تھا اس میں لحاظ، مروت، اخلاق، تدبر اور معاملہ فہمی ذرا زیادہ تھی۔ وہ اپنی ماں پر پڑا تھا اور بہروز مجھ پر۔ تمہاری دادی، صہیب اور ولی ایک طرح کے اور میں، بہروز، تم اور زرمینہ ایک طرح کے۔ خون کا اثر ہے۔ تم دونوں بہنوں کا ان خوبیوں میں نہ کمال ہے نہ قصور۔" آغا جان بڑے پرلطف سے انداز میں مزید گویا ہوئے۔

زرمینہ کے لئے بہن کا لفظ اس نے ذرا مشکلوں سے ہضم کیا جن بدنام زمانہ صفات اور عادات کو وہ ڈیڈی کے خاندان کے ساتھ جوڑتی اور ان سب میں بکثرت موجود قرار دیتی تھی، آغا جان بڑے اطمینان سے انہیں فخریہ قبول کرتے یہ بتا رہے تھے کہ وہ بھی ان ہی خاندانی وموروثی صفات کی مالک ہے۔

لنچ تک وہ یونہی ان کے ساتھ بیٹھی رہی۔ وہ بولتے بولتے تھکنے لگے تو بیڈ پر لیٹتے اس کے ہاتھ میں اخبار پکڑا دیا کہ انہیں پڑھ کر سنائے۔

''مار دھاڑ اور خون خرابے کی خبریں نہ سنانا، کھیلوں کی خبریں سنا دو یا شوبزنس کے چٹ پٹے قصے سنا دو۔'' وہ لوگ دوپہر کا کھانا شروع کرنے والے تھے کہ ولی کا فون آیا۔ وہ آغا جان سے بات کر رہا تھا۔

''وکیل صاحب! تسلی رکھئے۔ ایک ڈاکٹر میرے دائیں بیٹھی ہے اور ایک بائیں۔'' ولی نے نجانے کیا کہا تھا جس پر وہ ہنستے ہوئے بولے تھے۔

''اس مہنگائی کے دور میں لوگوں کو ایک ڈاکٹر بمشکل دستیاب ہوتا ہے میرے پاس تو دو، دو ہیں اور وہ بھی تھوڑی بہت دیر کے لئے نہیں بلکہ راؤنڈ دا کلاک۔'' اسے کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے خوش اخلاق اور خوش مزاج ہیں۔

''خبردار جو میری پوتیوں کی قابلیت پر کوئی شبہ کیا ہو تو۔ آپ نے پریکٹس نہ کی اگر کرتے تو کتنے بڑے وکیل ثابت ہوتے، یہ ایک زمانہ جانتا ہے اور میری پوتیاں، ذہین، قابل، لائق، فائق۔''

سامنے بیٹھی زرینہ بیٹے کے منہ میں نوالے ٹھونسنے میں مصروف تھی، مگر اس کے چہرے پر پھیلے مغرورانہ تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنا ذکر مسلسل اور متواتر اس کے ساتھ لفظ پوتیوں کی صورت ہونے پر ہرگز ہرگز خوش نہیں ہے۔

کل بھی اور آج بھی اس نے زرینہ کو جس ماہرانہ سے انداز میں آغا جان کا بی پی چیک کرتے نبض دیکھتے، دوا دیتے اور خالص ڈاکٹرانہ انداز میں نیند صحیح آئی، بھوک صحیح لگی وغیرہ وغیرہ جیسے سوال کرتے سنا تھا، ان سے اسے ایسا ہی کچھ لگا تھا۔

اسے یاد آیا، آغا جان نے ایک آدھ بار زرینہ کی مشکل پڑھائی اور کالج جانے آنے کا ذکر کیا تو تھا مگر اس نے دھیان دے کر سنا نہیں تھا۔ شادی کے بعد میڈیکل کی ٹف پڑھائی اور ساتھ میں بچوں کی ذمہ داری بھی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اس ہم عمر عم زاد کو ایک اور تعریفی سرٹیفکیٹ عطا کرنا پڑا۔ دشمن میں بھی اگر کوئی خوبی ہے تو اس کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ یہی بڑائی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ فون پر ولی سے مختصر گفتگو کرنے کے بعد آغا جان بھی کھانے میں شریک ہو گئے تھے۔

وہ بیڈ پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور فارہ، زرینہ اور دونوں بچے بھی وہیں قریب ہی کل رات کی طرح صوفے اور میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد زرینہ نے انہیں زبردستی لٹا دیا تھا اور ان کے مزید گفتگو پر پابندی عائد کر دی تھی۔ فارہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ معیز کو فون کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کہ وہ دونوں بچے بے تکلفی سے دروازہ کھولتے اس کے کمرے میں آ گئے۔

تین چار سال کے بچوں کو آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے اسے مسکراہٹ چہرے پر لا کر ان کا استقبال کرنا پڑا۔

سب ہی بچے اتنی متجسس فطرت کے مالک ہوتے ہیں یا یہی جیمز بانڈ شرلاک ہومز کے ثانی، دادا تھے۔ وہ طے نہیں کر پائی بہر حال وہ اپنے نانا کے گھر آئی اس نئی مہمان سے تعارف چاہتے تھے۔

ان کی اماں کو پتہ چل جائے کہ ان کے بچے دشمن کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں تو غالباً زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ تعارف کا مرحلہ تو چند سیکنڈ میں نمٹ گیا تھا، وہ کس کنڈر گارٹن میں پڑھ رہے ہیں بھی فوراً بتا دیا گیا تھا، اب بھائی صاحب اسے کمانڈر انکل، ڈرٹو اور ڈرٹی کے قصے سنا

رہے تھے اور بہن صاحبہ پاور پف گرلز میں سے بلوسم زیادہ اچھی ہے یا ببل سمجھانے میں مصروف تھیں۔

وہ سب ٹینشنز بھول کر اس بچکانہ ماحول کو انجوائے کر رہی تھی۔

✿✿✿
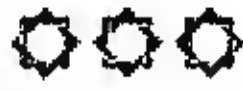
''دل کی بیماری بڑی وفادار ہے، ایک بار زندگی میں شامل ہو جائے پھر عمر بھر ساتھ نبھاتی ہے اور ہم ٹھہرے وفاداری کی قدر کرنے والے، سو ناز اٹھا رہے ہیں اس کے۔'' آغا جان کے کمرے میں داخل ہوتے اس نے سنا۔ وہ کسی سے خاصے پرلطف سے انداز میں محو گفتگو تھے۔

سردیوں کے دن جتنے چھوٹے تھے ایسے میں شام ہونے کا پتہ بھی نہیں چلا تھا۔ خاصی تیزی میں دن گزرا اور شام ڈھلنے لگی تھی۔ مغرب سے قبل انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا وہ اب وہاں آئی تو زرینہ اور ولی تو موجود تھے ہی، مگر ان کے ساتھ سامنے صوفے پر ایک سرخ و سفید خاصی صحت مندی خاتون بیٹھی نظر آئی تھیں۔

ان کے عظیم الشان جثہ کے برابر زرینہ ہمیشہ سے بھی زیادہ دھان پان اور دبلی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں بالکل برابر بیٹھی تھیں جبکہ ولی ذرا الگ رکھے سنگل صوفے پر بیٹھا تھا اور آغا جان بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ولی شاید ابھی ابھی آیا تھا، اس کے لباس میں سے کوٹ اور ٹائی غائب ہو چکے تھے مگر تھا وہ صبح والے ہی لباس میں۔

''آؤ بیٹا۔'' اسے دروازے پر رکتا دیکھ کر آغا جان نے فوراً کہا ''ان سے ملو، کسی زمانے میں یہ میری بھتیجی عاشی ہوا کرتی تھی۔ اب زرینہ کی ساس مسز عائشہ خٹک ہیں۔''

تعارف کے اس انداز پر ہکا بکا سی ہوتے اس نے سامنے بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا جو آغا جان کی بات کا برا منائے بغیر با آواز بلند قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔ ان کی صحت کی طرح قہقہہ بھی نہایت شاندار اور بلند و بالا ہی تھا۔

''جب اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، یہ اپنی ساس کی برائیاں اور چغلیاں مجھ سے آ کر کیا کرتی تھی۔ اب اس کی برائیاں زرینہ مجھ سے کرتی ہے۔ یہ ساسیں بہوؤں کو اتنا تنگ کرتی کیوں ہیں کہ پھر وہ بے چاریاں اپنے چاچا اور دادا کے پاس شکایتیں لے کر پہنچیں۔'' زرینہ ان جملوں پر مسکرا رہی تھی جبکہ ولی اتنا سنجیدہ تھا جیسے آغا جان امریکہ، ایران پر حملہ کرنے والا ہے یا نہیں پر اظہار خیال کر رہے ہوں۔

فارہ احمقوں کی طرح گردن اٹھائے کبھی آغا جان کو اور کبھی زور زور سے ہنستے ان خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم ساس بہو کو لڑوانے کی آپ کی ہر سازش انشاء اللہ ہم دونوں مل کر ناکام بنا دیں گے۔'' انہوں نے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ زرینہ کے گرد رکھ کر اسے اپنے مزید قریب کر لیا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا! یہ ہمارے چچا محترم بے چارے عادت سے مجبور ہیں۔ تم حیران مت ہو۔ اور سناؤ کیسی ہو؟ پشاور کیسا لگ رہا ہے؟ یہاں دل لگا؟'' وہ اب اس کی طرف متوجہ ایک سانس میں کئی سوال کر گئی تھیں۔

اگر زرینہ کی بد اخلاقی موروثی و خاندانی تھی تو عباد کی خوش اخلاقی بھی موروثی و خاندانی ہی ہے، اسے اس کی والدہ سے مل کر چند منٹوں ہی

میں اندازہ ہو گیا۔

گو وہ آغا جان کے برابر بیڈ پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ سلام کرنے اور ان کی خیریت پوچھنے والے سوال کا جواب دینے کے بعد وہ پھر ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ مگر ان کی اور آغا جان کی مسلسل ہوتی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ اسے ان کی خوش اخلاقی اور بہو کی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا پتہ دے رہی تھی۔

وہ آغا جان کی خیریت دریافت کرنے اور عیادت کرنے آئی ہوئی تھیں مگر آغا جان انہیں مسلسل یہ کہہ کہہ کر چھیڑ رہے تھے کہ عیادت اور خیریت تو محض بہانے ہیں، درحقیقت تو وہ اپنے پوتی پوتا سے ملنے آئی ہیں جوان دنوں اپنے ننھیال میں رہ رہے ہیں۔ اکیلے آغا جان کے ساتھ بیٹھنے کی بات دوسری تھی مگر ان کی فیملی کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھنا اسے جتنا ان ایزی اور آکورڈ لگ سکتا تھا لگ رہا تھا۔ وہ چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ مگر بغور اس کا مشاہدہ تو ضرور کر رہی ہوں گی۔

اچھا تو یہ ہے وہ ملکہ حسن جو کروڑوں کی جائیداد کے وارث ولی صہیب خان کو رد کر کے خلع کا مطالبہ اور جائیداد میں اپنا حق مانگ رہی ہے۔''

ان کی تواضع کافی، ڈونٹس، سینڈوچز وغیرہ سے کی گئی تھی۔ انہیں کھانے کے لئے بھی بصد اصرار روکا جا رہا تھا مگر وہ معذرت کرتی اٹھ گئیں۔ آغا جان کی دوا اور آرام، لیٹ نہ ہو اس لئے کھانا کچھ دیر بعد ہی لگا لیا گیا تھا۔

کل کی طرح صوفے پر بیٹھ کر آغا جان کے کمرے ہی میں۔ زرینہ، فارہ کو نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے ہوئے۔ آج کل جیسے بالکل خاموش رہنے کی پالیسی ترک کر کے آغا جان اور ولی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

آج آغا جان کی خیریت دریافت کرنے کس کس کا فون آیا اور پھر اس کس کس سے جڑی، کبھی پہلے کی کوئی بات، کوئی واقعہ۔ ولی سر ہلانے یا سننے کا تاثر دیتے کھانا کھا رہا تھا مگر آغا جان ان تمام باتوں میں خوب دلچسپی لے رہے تھے۔

''بیٹا! ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں کچھ دیر فارہ کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' کھانے اور دوا کے بیچ مناسب وقفہ رکھتے جب زرینہ انہیں دوا دے چکی اور کل کی طرح فوجیوں والے اسٹائل میں انہیں سلانے اور اسے یہاں سے بھگانے کا غیر اعلانیہ انداز اختیار کرنا چاہا تب آغا جان زرینہ سے بولے۔

وہ کوئی اختلافی بات کہنے والی تھی، وہ اپنے پیارے دادا کو ایک دشمن کے ساتھ رات میں اکیلا چھوڑنے کے حق میں نہیں نظر آ رہی تھی مگر اس کے کسی اختلافی فقرے اور اعتراض سے پہلے ولی صوفے پر سے اٹھتا ہوا قطعیت سے بولا۔

''چلو زرینہ! عشنا کو نیند آ رہی ہے۔ اسے جا کر سلاؤ۔''

''لیکن لالہ۔'' وہ دونوں بھائی بہن بالکل قریب قریب کھڑے تھے اور وہ ہولے سے یہ لفظ منمنائی تھی۔

ولی نے جواباً بغیر کچھ کہے صرف اسے گھورا تھا۔ کس قدر سخت اور غصے بھری نگاہوں سے۔

''جو میں نے کہا ہے وہ کرو، لیکن، اگر اور مگر کے بغیر۔''

عورتوں کو دبا کر رکھنا ان پر حکم چلانا تو اس خاندان کے مردوں کی فطرت ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ لڑکی اس کی مخالف میں کھڑی تھی پھر بھی فارہ کو ولی کا حکمیہ انداز سخت زہر لگا۔

زرمینہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی تھی اور اس کے پیچھے حذیفہ اور عشنا کو ساتھ لئے ولی۔ کمرے میں صرف وہ اور آغا جان رہ گئے تب اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ طنز، نفرت، حقارت، دشمنی، پراسراریت، کسی بھی انداز سے نہیں دیکھتے، اس گھر میں کم از کم ان کے ساتھ اکیلے بیٹھ کر کھل کر سانس لی جاسکتی ہے، بغیر کوئی دباؤ اور پریشانی محسوس کئے۔ وہ پہلے ہی بیڈ پر ان کے برابر بیٹھی تھی مگر اس نے ٹانگیں نیچے لٹکا رکھی تھیں۔

''اوپر ہو کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' وہ بیڈ پر نیم دراز تھے، وہ پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھی تو وہ مزید بولے۔

''اتنی دور نہیں، میرے پاس آکر بیٹھو۔ آنکھیں کمزور ہیں۔ اتنی دور سے تو تم مجھے صاف نظر بھی نہیں آرہیں۔'' وہ ان کے مزید قریب ہوگئی تو انہوں نے خود پر پڑا کمبل اس پر ڈال دیا۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے بالکل نزدیک کرلیا۔

ایک ہاتھ انہوں نے اس کی کمر کے گرد رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ہولے ہولے اس کے چہرے کے نقوش پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''فارہ! تمہاری شکل بہروز جیسی ہے۔ ویسی ہی لمبی ستواں ناک، ویسی ہی چوڑی پیشانی اور یہ جو وہ ان کے شانے پر سر رکھنا نہیں چاہتی تھی مگر انہوں نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ ان کے اتنے قریب تھی، وہ ان کے بازوؤں کے حصار میں تھی، وہ ان کی خوشبو محسوس کررہی تھی، وہ ان سے دور ہٹنا چاہتی تھی۔ وہ ہٹ نہیں پارہی تھی۔ انہوں نے اسے زبردستی پکڑا ہوا نہیں تھا۔

ان کے بیمار اور کمزور وجود سے وہ ایک سیکنڈ میں معمولی سی بھی طاقت استعمال کئے بغیر دور ہٹ سکتی تھی مگر وہ ہٹ نہیں رہی تھی۔

اگر وہ جادوگر تھے تو ایک جادوئی حصار اس کے گرد قائم کرچکے تھے۔ رات کی اس خاموشی اور تنہائی میں صرف نائٹ بلب اور لیمپ کی مدھم مدھم سی روشنی میں یہ جادوئی دائرہ اسے زیادہ ہی طاقتور اور بااثر محسوس ہورہا تھا۔ تمہاری ٹھوڑی کا ڈمپل ہے ناں یہ تو بالکل ہی اس کی طرح ہے۔'' انہوں نے اس کے ڈمپل پر اپنی شہادت کی انگلی رکھی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس سے بہروز کی خوشبو آتی ہے فارہ! ایسا لگتا ہے وہ زندہ ہوکر پھر میرے پاس آگیا ہے۔''

اسے لگا وہ رو رہے ہیں۔ انہیں اس کے پاس سے ڈیڈی کی خوشبو آرہی تھی اور اسے ان کے پاس سے کس کی خوشبو آرہی تھی؟ ان دو لوگوں کو جو باہم ایک کرتا تھا وہ ان دونوں کے وجود میں اپنی خوشبو رکھتا تھا۔ ان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتا تھا۔

ایک کا بیٹا، ایک کا باپ، اسے پتہ ہی نہیں تھا وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گرتے ان کے کرتے کو نم کررہے ہیں۔ ان کے شانے پر سے سر ہٹا کر اس نے ان کے سینے میں چہرہ چھپالیا۔

رات اگر انسان کو کمزور کم ہمت اور بزدل بناتی ہے اس سے جذباتی اور احمقانہ حرکتیں کرواتی ہے تو ایسا ہی سہی۔

''فارہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور کسی بات کا نہیں بس صرف اس کا یقین کرلو بیٹا! تم میرے بیٹے کی واحد نشانی ہو، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ بے شک میرے پاس مت رہو، مجھ سے ملو بھی نہیں مگر صرف میری محبت کا یقین کرلو اگر تمہیں اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکا تو سکون سے مر

بھی نہیں سکوں گا میرے لئے موت کو آسان کر دینا فارہ۔'' وہ بہت آہستہ آہستہ آواز میں بول رہے تھے، ان کا لہجہ ان کے آنسوؤں کا پتہ دے رہا تھا۔

''بیٹا! میں تم سے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔''

اس کے آنسو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے بہنے لگے تھے، اس کی ٹھوڑی پر سے انگلی ہٹا کر وہ دوبارہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگے تھے۔ وہ اس کے آنسو صاف کر رہے تھے، وہ اس طرح اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو محسوس کیے جا رہے تھے۔

اسے اپنے چہرے پر گردش کرتی ان کمزور، بوڑھی انگلیوں کا لمس ان کے وجود سے اٹھتی ایک مانوس سی خوشبو کا احساس دلا رہی تھی۔

وہ اس پل صرف اس قربت، اس محبت کی گرمی کو محسوس کر رہی تھی۔ حقیقت اور خواب سب آپس میں گڈمڈ سے تھے۔

جو حقیقت تھی۔ وہ خواب جیسی تھی اور جو خواب تھا، وہ حقیقت جیسا پھولوں کا ایک کنج تھا، اتنے پھول، اتنے پھول۔ وہ جگہ پھولوں سے بھری پڑی تھی۔ قدم جہاں پڑیں راہوں میں پھول ہی پھول دکھائی دیں۔

اور پھولوں کے اس کنج میں اسے ڈیڈی نظر آئے تھے۔ بہت خوش، مسکراتے ہوئے ''ڈیڈی'' کتنے دنوں بعد آج اس نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی ان کے پاس آئی۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ مسکرائے کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

وہ اسے پیار کر رہے تھے۔ کبھی اس کی پیشانی چومتے، کبھی رخسار، کبھی ہاتھ۔ وہ جگہ دنیا نہیں تھی۔ وہ جنت تھی۔ جنت ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ ڈیڈی کے سینے پر سر رکھے، ان کے بازوؤں کو اپنے گرد محسوس کرتے وہ ان سے یہ کہہ نہیں پائی کہ میرے ساتھ واپس ہماری دنیا میں چلیں۔ اپنی جنت چھوڑ کر کوئی واپس جانا چاہتا ہی نہیں ہے۔

کوئی احساس تھا، کوئی مدھم سرگوشی جو اس کے گرد ہو رہی تھی۔ وہ کسمائی، اس نے کروٹ بدلی۔ وہ بازو کہاں گئے جو اس کے گرد تھے، اسے اپنی پناہوں میں لئے، بے چین ہو کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں روشنی تھی، کسی ٹیوب لائٹ، بلب یا فانوس کی نہیں، دن کے اجالے کی۔'' آغا جان کی کمر کے گرد ہاتھ رکھ کر انہیں سہارا دے کر ولی باتھ روم کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ حقیقت اور خواب دونوں کی گرفت میں تھی۔

اس نے آج ڈیڈی کو خواب میں دیکھا ہے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ ان کے انتقال کے بعد کتنی راتوں، کتنے مہینوں اور کتنے سالوں سے وہ خواہش کرتی آئی تھی، دعا مانگتی آئی تھی کہ ڈیڈی کو خواب ہی میں دیکھ سکے۔

اور آج اتنے برسوں بعد جب مایوس ہو کر وہ یہ دعا مانگنا چھوڑ چکی تھی تب۔

آغا جان باتھ روم میں چلے گئے تھے، انہوں نے دروازہ صرف بند کیا تھا اسے لاک نہیں کیا تھا۔ ولی بالکل باتھ روم کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ فارہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ مگر شاید اس کی نگاہوں کا اسے احساس ہوا تھا تب ہی گردن گھما کر ایک پل کو اس کی طرف دیکھا تھا۔

سنجیدہ آنکھیں، خاموش چہرہ، جس پر کوئی تاثر رقم نہیں تھا۔ نہ دوستی نہ دشمنی۔ بالکل بے تاثر اور سپاٹ۔

اچٹتی، اجنبی، لاتعلق سی نگاہ اس پر سے ہٹا کر وہ دوبارہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ تکیے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

اِدھر اُدھر کہیں نگاہ ڈالے بغیر وہ سیڑھیاں چڑھتی سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ اسے یقین کرنے میں خود تامل ہوا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے والوں میں تھی، رات کسی وقت بھی سوئی ہو مگر اس طلسم کدے میں جہاں سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا وہاں ایک عادت کے بدلنے پر کیا تعجب کیا جا سکتا تھا۔ منہ، ہاتھ دھو کر اس نے لباس تبدیل کیا، بال بنائے، ویلوٹ کے سیاہ سوٹ کے اوپر کڑھی ہوئی سیاہ شال لپیٹ کر وہ اپنے کمرے سے باہر تھی۔

اس کا رخ آغا جان کے کمرے کی طرف تھا۔ لاؤنج میں اسے زرینہ، صدو اور کسی دوسری ملازمہ سے پشتو میں کچھ بولتی نظر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ضرور، پر کہا ایک لفظ نہیں۔

دروازہ کھول کر وہ بے دھڑک اندر گھسی۔ آغا جان بیڈ پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا، سائیڈ ٹیبل پر رکھی ناشتے کی ٹرے بتا رہی تھی، وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہیں۔

کل صبح انہوں نے کس وقت ناشتہ کیا تھا اور آج......؟ اس کی نیند نہ خراب ہو، اس لئے وہ جاگ جانے کے باوجود اس کے پاس بیٹھے رہے، اپنا ناشتہ، اپنی دوا، اپنے سارے معمولات ڈسٹرب کر لئے۔

بیڈ پر انہوں نے اپنے پاؤں بالکل سیدھے پھیلائے ہوئے تھے اور ان کے پیروں کے پاس بیڈ پر ولی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کے پیروں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

ان کے پیروں کے نیچے، بیڈ شیٹ کے اوپر ایک چھوٹا سا چوکور کپڑا بچھا تھا، جس پر کٹے ہوئے ناخن گرتے جا رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھلنے پر گردن گھما کر دیکھا ضرور مگر پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''آ جاؤ میری ننھی پری!'' وہ اسے دیکھ کر بہت بھرپور انداز میں مسکرائے۔

چائے کا کپ انہوں نے ٹرے میں رکھ دیا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا کر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ اگر ولی یہاں نہ ہوتا تو وہ واقعی اس وقت دوڑ کر ان کے پاس آتی۔

تب ہی ان کا ملازم گل خان اندر آیا۔ وہ کسی کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔

''اوہو۔'' آغا جان نے قدرے تاسف سے سر ہلایا، پھر اسے بتانے لگے۔

''حجام آیا ہے میری حجامت بنانے۔'' وہ اپنے جملے پر خود ہی ہنسے۔'' ولی کہہ رہا تھا۔ جاپان کی لوک کہانیوں میں جو بونوں کے کردار ہوتے ہیں ناں۔ جتنے لمبے ان کے قد ہیں، اس سے بھی لمبی داڑھی، زمین کو چھوتی ہوئی، آپ کی داڑھی بالکل ویسی ہی لگنے لگی ہے۔ ویسے ہرا تو ارولی میرا یوم صفائی مناتا ہے۔''

ولی، گل خان سے بیڈ کے قریب ایک کرسی رکھوا رہا تھا اور اس گفتگو سے لاتعلق تھا، یوں جیسے جس ولی کی بات ہو رہی ہے، وہ یہ نہیں کوئی اور ہے۔

کرسی رکھوا لینے کے بعد اس نے گل خان سے حجام کو اندر لے آنے کو کہا۔ اب یہاں اس کی موجودگی کا نہ جواز تھا نہ یہ مناسب بات تھی۔

''میں ذرا اپنے یوم صفائی سے فارغ ہولوں پھر تفصیلی بات چیت کرتے ہیں۔ ہم دونوں۔'' اسے واپس پلٹتا دیکھ کر آغا جان بولے۔ وہ سر ہلاتی واپس مڑی تو وہ جلدی سے بولے۔

''فارہ! بیٹا ناشتہ کرلو۔ گل خان! یہ صدو کہاں ہے، فارہ کو ناشتہ بنا کر دے۔'' ولی انہیں بیڈ سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا رہا تھا اور وہ اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔

''آغا جان! فارہ یہاں مہمان نہیں ہے۔ یہ اس کے دادا کا گھر ہے۔ اس کا جو کھانے کا دل چاہے گا، کچن میں خود جا کر کسی بھی ملازمہ سے اپنے لئے بنوالے گی۔'' ولی نے رسانیت سے کہا۔ یہ جملے اسے بولنے چاہیے تھے مگر اس کی خاموشی کے سبب آغا جان کو اطمینان دلانے کی خاطر ولی کو بولنے پڑے تھے۔

''آغا جان بے چارے پرہیزی کھانے کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ ابلے، ابلے، پھیکے، بے رنگ سے کھانے پکا پکا کر میری طبیعت اکتا گئی تو ان بے چاروں کی انہیں مسلسل کھاتے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چکنائی، نمک اور ریڈ میٹ پر ان کے لئے پابندی ہے تو جو چیزیں Allowed ہیں ان ہی میں کچھ جدت، کچھ ذائقہ اور کچھ انفرادیت پیدا کر لی جائے۔ بس آج اس کوشش میں لگی ہوں۔ اسکم (Skim) ملک میں، چینی بھی ذرا کم ہی رکھتے یہ کھیر بنا رہی ہوں اور یہ مچھلی بھی فرائی نہیں کروں گی بلکہ اوون میں بالکل معمولی سا کارن آئل لگا کر رکھ دوں گی۔'' کچن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے زرینہ کی آواز سنی۔

پہلی بار پتہ چلا تھا کہ جب یہ ہنٹر والی اور پھولن دیوی نہیں بنی ہوتی تو خاصے اچھے لہجے اور آواز کی مالک ہے۔

آغا جان اردو بڑی شستہ اور نستعلیق بولتے تھے، یوں جیسے سیدھے علی گڑھ یونیورسٹی سے تشریف لا رہے ہوں مگر اس کے باوجود ان کے لہجے میں پشتو کی ہلکی، بہت معمولی سی آمیزش ہوتی تھی، ایسی آمیزش جو سننے والے پر بڑا خوشگوار سا تاثر ڈالتی تھی مگر ولی اور زرینہ کی اردو بالکل صاف اور کسی بھی دوسری زبان کی آمیزش سے مبرا ہوتی تھی۔ اندر داخل ہونے پر پتہ چلا کہ یہ گفتگو عباد کے ساتھ ہو رہی تھی جو کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی پر بیٹھا حذیفہ کے منہ میں پراٹھے کے نوالے بھی ٹھونس رہا تھا اور اپنے سامنے پھیلا انگریزی اخبار بھی پڑھ رہا تھا اور بیوی کی گفتگو بھی مناسب ہوں، ہاں، اچھا، واقعی اور نہیں جیسے الفاظ کے ساتھ سن رہا تھا۔

یہ الفاظ غالباً بیوی کی تسلی و تشفی کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔ ''میں تمہاری گفتگو پورے دھیان سے سن رہا ہوں۔'' پتہ نہیں یہ بیویاں، شوہروں کو سکون سے اخبار کیوں نہیں پڑھنے دیتیں۔

زرینہ ککنگ رینج اور کاؤنٹر کے گرد متحرک سی پھرتی آغا جان کا لنچ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

''السلام علیکم فارہ۔'' عباد نے سلام میں پہل کی تھی۔

''وعلیکم السلام کیسے ہیں آپ؟'' خالی عباد کہنا بے تکلفی لگ رہی تھی۔ صاحب لگانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور بھائی کہنا زبردستی کا رشتہ

جوڑنا لگ رہا تھا مگر عباد کے خوش اخلاقی والے انداز کے جواب میں وہ ہلکا سا مسکرائی ضرور تھی، زرینہ کی گھورتی، غصیلی نگاہوں کی پروا کئے بغیر۔

''الحمدللہ، بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں؟'' عباد کے خیریت پوچھنے کا جواب دے کر وہ فوراً صدو سے مخاطب ہوئی۔

اپنا ناشتہ کمرے میں لانے کے لئے کہا اور پھر حاضرین کچن خاص کر کچن کی مالک پر نگاہ ڈالے بغیر جلدی سے کچن سے باہر نکل آئی۔

ناشتے کے بعد وہ آغا جان کے کمرے میں آئی۔ بے دھڑک اندر داخل ہونے کے بجائے اس بار اس نے ہلکی سی دستک دی تھی۔

اندر آغا جان نہا رہے ہیں۔'' اسے ان کی تلاش میں نگاہیں گھماتے دیکھ کر ولی سنجیدگی سے بولا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھا، وہ صرف بھڑا ہوا تھا، لاکڈ نہیں تھا اور ولی قریب ہی کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے واپس جانے کے لئے مڑنے لگی تو وہ سنجیدہ لہجے میں اس سے بولا۔

''رات تمہارے ماموں کا فون آیا تھا۔'' وہ بے اختیار ٹھٹک کر رکی، چونک کر بغور اسے دیکھا، وہ اسے یہ اطلاع فراہم کرنے کے بعد دوبارہ باتھ روم کے دروازے کو دیکھنے لگا تھا بالکل لاتعلق انداز میں۔

وہ یہ بھی اندازہ نہیں لگا پائی کہ تجمل ماموں اور اس کے بیچ کیا گفتگو ہوئی ہوگی۔ یقیناً کوئی خوشگوار بات تو ہرگز نہیں ہوئی ہوگی اور یہ فون آیا کب تھا؟

اطلاع دینا تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جب وہ سو چکی تھی تب آیا تھا۔

پہلے تو کبھی نہیں ہاں اس کے خلع کے اعلانیہ مطالبے کے بعد جب ولی، آغا جان کے ساتھ لاہور ان کے گھر آیا تھا تو تجمل ماموں اور معیز سے اس کی کافی زیادہ تلخ کلامی ہوئی تھی۔ وہ تجمل ماموں اور خاص کر معیز سے خار کھاتا بلکہ نفرت کرتا ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ولی اس کی اور معیز کی دوستی اور بے تکلفی سے بہت اچھی طرح آگاہ ہے۔ ابتداء میں ولی نے ایک بار اسے فون کال کی تھی۔

''میں ولی بول رہا ہوں فارہ...... کیسی ہو؟'' بظاہر لہجے میں کوئی دھمکی اور ڈرانے والی بات شامل نہیں تھی پھر بھی وہ ڈر گئی تھی۔

تب وہ میڈیکل کے پہلے سال میں تھی، اس کے نکاح کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور ان دنوں واقعی وہ اتنی ڈرپوک سی تھی کہ اسے لگا کرتا تھا جیسے اس کا زبردستی نکاح پڑھوایا گیا ہے، ایسے ہی کسی دن وہ زبردستی اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

''میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اپنا خوف اس پر ظاہر کئے بغیر بظاہر بہادری کا مظاہرہ کرتے اس نے نفرت سے یہ جملہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔

پھر ایک بار وہ اسے اپنے ہاسپٹل کے داخلی راستے پر کھڑا نظر آیا تھا۔ یہ غالباً تب کی بات تھی جب آغا جان نے اسے ایک فون کال میں یہ بتایا تھا کہ ولی ان کے بہت کہنے کے باوجود بھی امریکہ سے پڑھائی چھوڑ کر واپس آ گیا ہے۔ اس کا میڈیکل کا چوتھا سال تھا اور کالج کے ساتھ ساتھ ہاسپٹل میں بھی ان کا خوب رگڑا لگا کرتا تھا۔ تھکی ہاری وہ وہاں سے نکل رہی تھی۔ معیز اسے لینے آیا ہوا تھا۔ اس روز فارہ کی برتھ ڈے تھی اور معیز اسے کہیں باہر کھانا کھلانے لے جا رہا تھا تب تک وہ اب جتنی بہادر اگر نہیں ہوئی تھی تو ابتدا جیسی ڈرپوک بھی نہیں رہی تھی تب ہی اسے کھڑا دیکھ لینے کے

باوجود اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتی معیز کے ساتھ باہر پارکنگ میں آ گئی تھی۔

اور تیسری بار میں جب اس نے ولی پر اپنی ناپسندیدگی اور بے زاری ثابت کی وہ اس کے فائنل ایئر کے آخری دنوں کی بات تھی۔ وہ پشاور سے لاہور کیا کرنے آیا ہوا تھا، فارہ کے علم میں نہ تھا مگر اس روز معیز کے ساتھ ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے اس نے وہاں دو تین افراد کے ساتھ ولی کو کھانا کھاتے دیکھا تھا۔

اپنی بے حد مشکل اور تھکا دینے والی پڑھائی سے وہ کچھ وقت نکال کر فریش ہو سکے۔ خود کو ریلیکس کر سکے، یہی سب سوچتے معیز کبھی کبھار اسے لانگ ڈرائیو، لنچ، ڈنر وغیرہ کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ایک دن تھا اور یہ تب کی بات تھی جب معیز باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔

ولی ان دونوں سے کافی دور ایک میز پر بیٹھا تھا مگر جن نگاہوں سے وہ انہیں دیکھ رہا تھا انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا وہ ابھی اپنی میز پر سے اٹھے گا اور دندناتا ہوا سیدھا اس کے سر پر آ کھڑا ہو گا۔ اس پر حق جتائے گا، کوئی سین کری ایٹ کرے گا۔

وہ کھانے اور اپنے ساتھ آئے افراد سب کو نظر انداز کیے کافی دیر فارہ اور معیز کی میز کی طرف دیکھتا رہا۔ بہت غصے سے، یوں جیسے اگلے ہی پل وہ اس کے پاس آئے گا اور اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جائے گا۔

اس نے اسے میز پر سے یکدم ہی اٹھتے دیکھا تو اپنی تمام تر بہادری کے باوجود لوگوں میں تماشا بننے کے خیال سے ہراساں ہو گئی مگر وہ ان کی میز کی طرف آنے کے بجائے نہایت تیز رفتاری سے چلتا ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے ریسٹورنٹ سے جاتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس پل اس سوچ نے اسے بہت سکون پہنچایا تھا کہ وہ ولی کے سامنے بہت اچھی طرح یہ بات اسٹیبلش کر چکی ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اگر وہ اپنی خوشی و رضامندی سے شامل کرے گی تو وہ ولی صہیب خان نہیں معیز تجمل ہو گا۔

تجمل ماموں کے فون کا سن کر اسے کئی گھنٹوں بعد جا کر یہ یاد آیا کہ کل اسے معیز کو فون کرنا تھا اس کی ناراضی دور کرنی اور اسے اعتماد میں لینا تھا۔

کل رات سے صبح ابھی جب تک کہ ولی نے تجمل ماموں کے فون کا ذکر نہیں کیا تھا فون کرنے والی بات تو دور اسے تو سرے سے معیز ہی یاد نہیں آیا تھا اور یہ کیسی حیرت کی بات تھی۔

معیز نے اسے کل شام تک لاہور پہنچنے کا الٹی میٹم دیا تھا اور وہ شام اور رات سب گزار کر اگلی صبح بلکہ دوپہر کر چکی تھی۔

گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی اور وہ بجائے یہ سوچنے کے کہ معیز اس سے کتنا شدید ناراض ہو گیا ہو گا یہ سوچ رہی تھی کہ اب تک یقیناً آغا جان نہا چکے ہوں گے۔

اس بار ان کے کمرے تک جب وہ آئی تو گل خان سے یہ تصدیق کر لینے کے بعد کہ وہ نہا چکے ہیں، اپنے کمرے میں موجود ہیں اور بالکل اکیلے ہیں۔

''تشریف لایئے ڈاکٹر فارہ بہروز خان!'' وہ اسے دیکھ کر بھرپور اور شرارتی انداز میں مسکرائے۔ بہت طویل اور پرانی بیماری کے سبب ان کے حد درجہ کمزور اور پیلاہٹیں لئے چہرے پر یکدم ہی جیسے کئی چراغ جل اٹھے تھے۔

صرف اس کا چہرہ بھی کسی کو ایسی خوشی فراہم کرسکتا ہے؟

انہوں نے سفید کرتہ شلوار کے اوپر ڈارک براؤن رنگ کا خوب موٹا سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے اوپر ہلکے براؤن رنگ کی گرم مردانہ شال بھی کندھوں اور سینے کے گرد پھیلا رکھی تھی۔ ان کے بال جو ہلکے ہلکے بڑھے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی کٹنگ ہوچکی تھی، سفید داڑھی جو صبح تک کچھ بے ترتیب سی نظر آرہی تھی۔ خط بننے کے بعد چہرے پر جچی چہرے کی نورانی چمک بڑھا رہی تھی۔

انہوں نے آنکھوں پر سے گلاسز اتار کر اخبار بھی ایک طرف رکھ دیا اور اسے اپنی طرف اتنا بغور دیکھتا پا کر شرارتی انداز میں بولے۔

''لگ رہا ہوں ناہینڈسم؟'' وہ بے اختیار مسکرائی۔

''تم نے مجھے بہت دیر میں دیکھا بچے! اب تو یہ کھنڈرات بچے ہیں۔ تیس چالیس سال پہلے دیکھتیں تو کہتیں۔ آغا جان آپ کے آگے ہالی ووڈ کا ہرڈیشنگ، ہینڈسم ہیرو پانی بھرتا نظر آتا ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستی بیڈ پر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

آج انہوں نے اسے بیڈ پر نہیں بلایا تھا۔ وہ از خود وہاں آئی تھی۔ انہوں نے اس کے شانوں کے گرد محبت سے بازو پھیلا کر اپنی گرم شال اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

''کیا ٹائم ہوگیا؟'' انہوں نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔''ایک بجنے میں بیس منٹ ہیں۔ ابھی بہت ٹائم ہے۔'' انہوں نے جیسے خود کلامی کی پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

ناشتہ دیر سے کیا ہے ناں۔ میں نے زرینہ سے کہا تھا۔ ڈھائی تین بجے سے پہلے کھانا نہیں کھاؤں گا۔ چلو، تب تک میں تمہیں ایک خاص جگہ دکھا کر لے آتا ہوں۔''

''خاص جگہ؟'' اس نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

''ہاں، ایک بہت خاص جگہ ہے جو میں نے خاص تمہارے لئے بنوائی ہے۔ صرف تمہارے لئے۔ نہیں روحی کے لئے بھی۔ بہروز کا نام چاہو تو شامل کرلو۔ جب میں نے اسے بنوانے کا سوچا تھا تب وہ زندہ تھا مگر جب وہ بنتا اور سجنا شروع ہوئی تب وہ ہم سب سے بہت دور جاچکا تھا۔''

وہ ایک پل کے لئے کچھ کرادا س ہوئے پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے اس سے کہنے لگے۔

''چلو، جلدی سے چلتے ہیں۔ ابھی کھانے میں بھی وقت ہے اور اس وقت کوئی ملنے بھی نہیں آیا ورنہ اتوار کے دن ملنے اور خیریت پوچھنے آنے والوں کا رش ہی لگا رہتا ہے۔'' اس کے گرد سے ہاتھ ہٹا کر وہ فوراً بیڈ سے اٹھنے لگے۔ بہت پرجوش اور بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہوتے۔

''آپ سے چلا نہیں جائے گا آغا جان! ابھی آپ آرام کریں۔ میں بعد میں دیکھ لوں گی جو آپ دکھانا چاہ رہے ہیں۔''

''مجھ سے چل لیا جائے گا بیٹا! تم بعد میں جا کر دیکھو گی تو مجھے خوشی نہیں مل سکے گی۔ مجھے خوشی تو اس وقت ہوگی جب میں خود تمہیں وہاں

لے کر جاؤں اور اپنی بہت شوق اور محبت سے بنوائی ایک ایک چیز تمہیں خود دکھاؤں۔"

"آغا جان! زیادہ چلنا اور تھکنا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے میں پھر کبھی۔"

"میں تمہارے سہارے سے چل لوں گا فارہ! زیادہ دور تھوڑی جانا ہے، یہ جو میرے کمرے کا یہ دوسرا دروازہ ہے، یہ ادھر جھیل کے پاس کھلتا ہے، وہاں سے بس چند قدموں کا فاصلہ ہے۔ یہ ولی تو مجھے زیادہ ہی چھوئی موئی بناتا ہے، ایسے برے حالات بھی نہیں۔ میں چل پھر سکتا ہوں۔" وہ اس کا جملہ کاٹ کر بہت عجلت میں بولے۔

ان کے بوڑھے چہرے پر بچوں جیسی خوشی اور ایکسائٹمنٹ بکھری ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی متامل سی تھی۔

"اچھا، مجھے وہیل چیئر پر لے چلو۔" انہوں نے اس کا تامل اور ہچکچاہٹ دیکھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی ویل چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"فارہ! یہ میری بہت سالوں پرانی خواہش تھی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو۔ میرے بہروز کی فیملی میرے گھر آباد ہو سکے۔ میں نے تم لوگوں کے لئے گھر کے اندر ہی ایک الگ پورشن بنوایا تھا، تمہیں یاد ہے بہروز مجھ سے آخری بار مل کر گیا کہہ کر گیا تھا۔ وہ واپس میرے پاس آجائے گا ہمیشہ کے لئے۔

تم لوگوں کو الگ رہنے کی عادت تھی اسی لئے میں نے اسی روز ایک آرکیٹکٹ سے رابطہ کیا تھا۔ بہروز اسی رات ہمیں چھوڑ گیا تھا، مگر مجھے تمہارے اور روحی کے لئے تو یہ پورشن تعمیر کروانا ہی تھا۔ سو اس کی تعمیر فوراً کروائی۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی فارہ! کہ تم اور روحی یہاں آکر آباد ہو جاؤ۔ میرے بچے اپنے گھر لوٹ آئیں اور اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے بس اتنی سی خوشی مل جائے کہ میں نے جو کچھ تم لوگوں کے لئے بنوایا، وہ آنکھوں میں بسا سکوں۔ فارہ! میں تمہارے ساتھ وہاں جانا چاہتا ہوں یہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور سب سے یادگار لمحہ ہوگا فارہ! مجھے بس اتنی سی خوشی دے دو بیٹا! بس اتنی خوشی۔" وہ اب مزید کیا کہہ سکتی تھی۔ انہوں نے اسے کسی اعتراض اور انکار کے قابل ہی نہیں رکھا تھا۔

وہ آنکھوں میں آس اور امید لئے دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھی اور کمرے کے دوسرے کونے سے وہیل چیئر کھسکا کر ان کے پاس لے آئی۔ ان کے چہرے پر بے ساختہ ہی خوشیوں کے کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ اتنے خوش لگ رہے تھے جیسے انہیں ہفتِ اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔

اس نے انہیں سہارا دینے کو ہاتھ آگے بڑھایا مگر وہ اس کے سہارے کے بغیر خود ہی کھڑے ہو کر وہیل چیئر پر بیٹھ گئے۔

وہ وہیل چیئر پر صحیح سے بیٹھ گئے اور اس نے ان کی چادر اچھی طرح ان کے گرد لپیٹ دی پھر ابھی وہ وہیل چیئر چلانا شروع بھی نہیں کر پائی تھی کہ ہاتھ میں کارڈلیس لئے ایک ملازم اندر آیا۔

"آپ کا فون ہے۔" مؤدب سے انداز میں اسے کارڈلیس تھما کر وہ فوراً باہر چلا گیا تھا۔

"ہیلو۔" ذہن میں اندازے قائم کرتے کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے؟ اس نے کارڈلیس کان سے لگایا۔

''فارہ! تم میرے کہنے کے باوجود گھر واپس کیوں نہیں گئیں۔ رات پاپا نے فون کیا تو اس بدتمیز اور بے ہودہ انسان نے ان کی تم سے بات نہیں کرائی۔ پھوپھو کتنی ناراض ہیں تم سے، کچھ احساس ہے تمہیں؟ اور میں یہاں اپنے دس مسئلوں کے ساتھ تمہاری وجہ سے بری طرح پریشان اور ڈسٹرب ہوں۔ تم مجھے سچ بتاؤ فارہ! کیا تم کسی دباؤ میں ہو؟ کیا وہ تمہیں زور زبردستی سے کوئی دھمکی دے کر کسی بات سے ڈرا کر یہاں لایا ہے؟ ہم اتنے بے اختیار اور لاچار نہیں فارہ! کوئی اندھیر نہیں مچی جو وہ تمہیں ڈرا دھما سکے۔ تم مجھے صرف ایک ہاں بولو، میں نے اپنے دوست ایس پی یاسین لغاری سے ساری بات کل رات ہی کر لی ہے۔ ہم قانون کی مدد لیں گے اور تم آج ہی واپس لاہور میں ہو گی۔

میں پاکستان میں ہوتا تو اب تک یہ سارا تماشا کب کا نمٹ چکا ہوتا، کوشش کر رہا ہوں کہ آج یا کل واپس آ جاؤں۔ تم بس مجھے میرے سوال کا جواب دے دو۔'' وہ پھر سلام دعا اور خیر و عافیت کے بغیر ایک دم شروع ہو چکا تھا۔

وہ بے حد غصے میں بھی تھا اور اس کے لیے فکر مند اور پریشان بھی۔ اس کا غصہ اور فکر دونوں اس کے لفظوں اور لہجے سے عیاں تھے۔ اس نے سامنے وہیل چیئر مین پر بیٹھے آغا جان کو دیکھا اور پھر چلاتے، جھنجھلاتے متفکر معیز کو سنا۔

معیز اس کا دوست تھا، وہ اس کا پرپوزل بھی قبول کر چکی تھی اور وہ اس کے لیے اہم بھی تھا مگر سامنے وہ بوڑھا شخص جو وہیل چیئر پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا اسے احساس ہوا وہ اس کے لیے معیز سے زیادہ اہم ہے۔

''مجھے تجمل ماموں کے فون کا میسج مل گیا تھا۔ رات میں سو چکی تھی اس لیے ان سے بات نہ کر سکی، آج ضرور ان سے اور ممی سے فون پر بات کر لوں گی اور آپ کو کسی دوست سے مدد لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ اچھا میں اس وقت تھوڑی مصروف ہوں، ہم بعد میں بات کریں گے اللہ حافظ۔'' آغا جان اسے یہ اشارہ کرتے ہی رہ گئے تھے کہ وہ آرام اور اطمینان سے کسی جلدی اور عجلت کے بغیر فون پر بات کر لے مگر ان کے اشاروں کو نظر انداز کرتی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر چکی تھی۔

''بیٹا! ایسی کوئی جلدی تو نہیں تھی جانے کی۔ تم آرام سے بات کر لیتیں۔''

''کس کا فون تھا؟'' تمہارا موڈ ایک دم سے آف کیوں ہو گیا؟'' انہوں نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

''معیز کا، اسے لگ رہا ہے، ولی مجھے یہاں زبردستی اغواء کر کے لے آیا ہے۔ آغا جان! ہم لوگوں کی زندگی نارمل کیوں نہیں۔ میں اپنے سگے دادا کے پاس اگر اپنی مرضی سے بھی آؤں تو سب کو یہی کیوں شک ہوتا ہے کہ مجھے ڈرایا، دھمکایا یا اغواء کیا گیا ہے؟'' وہ اپنے دل میں آئی باتیں بہت کم کسی سے کہا کرتی تھی مگر اس وقت معیز کا فون سن کر جو سوچ اس کے دل میں ابھر رہی تھی وہ اسے آغا جان سے کہہ اٹھی تھی۔

آغا جان کے خوشیوں بھرے چہرے پر اس کے اس سوال نے اداسیاں بکھیر دیں۔ اسے کوئی جواب دینے کے بجائے وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔

ان کے کمرے کا یہ پچھلا دروازہ اس نے دیکھا بار ہا تھا مگر یہ کہاں کھلتا ہے وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

باہر نکلنے پر گھاس کا ایک قطعہ نظر آیا تھا اور ایک مصنوعی جھیل بھی، جو بے حد خوبصورت تھی اور جہاں وہ جھیل ختم ہو رہی تھی وہاں جدید طرز

تعمیر کا حسین شاہکار اس گھر کا وہ پورشن جو آغا جان نے ان لوگوں کے لئے آج سے چھ برس قبل تعمیر کروایا تھا۔ اس پورشن میں داخل ہونے کا سفید لوہے کا گیٹ، پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''گیٹ کھولو'' اس نے وہیل چیئر وہاں لا کر روکی تو آغا جان اس سے بولے۔ اس نے کنڈی کھولی اور ان کی وہیل چیئر اندر لے جانے کے لئے پیچھے مڑی تو دیکھا کہ آنکھوں میں نمی لئے وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے ہیں۔

''فارہ! اس ایک پل کا میں نے برسوں انتظار کیا ہے، اب اگر میں مر بھی گیا تو مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا'' وہ بہت عجیب کیفیات میں گھری خاموشی سے وہیل چیئر چلاتے اندر جانے لگی۔ تب آغا جان ہی کی چھ برس قبل کی ایک آواز اس کی سماعتوں میں گونجی۔

''میں اپنی غلطی مانتا ہوں روحی بیٹا! میں نے تمہیں بطور بہو قبول نہ کر کے ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔ میں اعلیٰ ظرف نہ تھا تم اعلیٰ ظرف ہو جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔ تمام زیادتیوں کو بھلا کر اپنے گھر چلی چلو۔ تمہارا اصلی گھر تو وہی ہے ناں۔ تم وہاں چلوگی تو میرے بہروز کی روح بھی کتنی خوش ہوگی۔''

اسے یک بارگی چھ سال پہلے کے وہ سب لمحے یاد آئے جب جب وہ اسے اور ممی کو اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔

''بیٹا! تمہاری ممی ہم سے بہت ناراض ہیں۔ انہیں سمجھاؤ۔ ان سے کہو آغا جان کو معاف کر دیں۔ تم لوگوں کا گھر تم لوگوں کے بغیر بہت ویران ہے۔ ممی سے کہو اپنے گھر کو آباد کر دیں۔'' انہوں نے چھ برس قبل بھرائی ہوئی آواز میں بڑی شکستگی، رنجیدگی اور التجا کرتی آواز میں فارہ سے کہا تھا۔

''ابھی تم بہت غصے میں ہو۔ مجھ سے سخت خفا بھی ہو، روحی بیٹا! میں پھر آؤں گا۔ تمہارا گھر تمہاری اور فارہ کی راہ تک رہا ہے۔'' وہ عجیب کھوئے کھوئے، الجھے بکھرے انداز میں اس خوبصورت جگہ کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

وہ پورا حصہ خاموش اور غیر آباد تھا۔ مگر وہاں کے لان کی خوشنما حالت یہ بتا رہی تھی کہ یہاں پابندی سے دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کروائی جاتی ہے۔ لان کے سامنے دو اسٹیپس تھے، پھر لکڑی کا مضبوط اور خوبصورت دروازہ جو رہائشی حصے میں کھلتا تھا۔ اس نے وہیل چیئر اوپر چڑھائی وہ تب تک سکون سے ٹیک لئے کھڑے رہے، پھر انہیں دوبارہ وہیل چیئر پر بٹھا کر وہ اندر لے آئی۔

یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ ٹی وی لاؤنج، یہ کچن، یہ اس کی ممی کا بیڈروم، یہ فارہ کا کمرہ اور یہ فارہ کا اسٹڈی روم۔ اس کے لئے بنے اس اسٹڈی روم میں رائٹنگ ٹیبل، کمپیوٹر بک شیلف وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ کمپیوٹر کورز سے ڈھکا ہوا اور بک شیلف میں سب ہی میڈیکل و سائنس کی ڈھیر ساری کتابیں۔

اسٹڈی روم کی دیواروں پر انسانی جسم کے کئی اعضاء اور ہڈیوں وغیرہ سے متعلق رنگین ڈایاگرام، چارٹس وغیرہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ میڈیکل کے کسی طالب علم کی اسٹڈی ہے۔ میڈیکل کی وہ طالبہ ڈاکٹر بن بھی گئی اور یہ ویران سٹڈی اس انتظار ہی میں رہی کہ اس کی مالکن یہاں آ کر بیٹھے گی، پڑھے گی اسے آباد کرے گی۔

سب جگہیں فرنشڈ تھیں، سب جگہ قالین، پردے اور دیگر سارا سامان موجود تھا۔ یہاں تک کہ کچن بھی پورا سیٹ تھا۔

سارے کمرے دیکھ لینے کے بعد وہ ان کے ساتھ دوبارہ لاؤنج میں آ گئی۔ وہ وہیل چیئر ہی پر بیٹھے تھے اور وہ ان کے برابر صوفے پر۔

''رات میں نے خواب میں بہروز کو دیکھا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولے۔

''وہ پہلے بھی خواب میں کئی بار نظر آیا مگر بجھا ہوا، اُداس، اُداس، لیکن کل وہ بہت خوش لگ رہا تھا'' وہ بے اختیار صوفے سے اٹھ کر ان کے سامنے آ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر تھے اور وہ آنکھوں میں حیرت لئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''فارو! ابھی تم مجھ سے اپنی زندگی کے نارمل نہ ہونے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ بات یہ ہے بیٹا! کہ اپنے بچوں کی زندگیوں کو ابنارمل بنانے میں، انہیں آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈالنے میں ہم بڑے بہت قصوروار ہوتے ہیں۔ ہماری زندگیاں بہت سیدھی سادی اور نارمل ہو سکتی تھیں اگر میں بہروز کی پسند کو قبول کر لینے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتا۔ کوئی قیامت تو نہ آ جاتی اگر میں اس کی خود بخوشی وہاں شادی کروا دیتا جہاں وہ کرنا چاہتا تھا۔ میں انا پرست، ضدی۔ میں نے کہا میں تمہیں جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں، میرا صرف ایک بیٹا ہے صہیب تم سے میں اپنا ہر رشتہ توڑ رہا ہوں اب زندگی میں کبھی مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا تو وہ میرے پاس سے، اپنے گھر سے ایسا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر آیا ہی نہیں۔ واقعی کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھائی، میں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ضد میں آ کر فوراً ہی صہیب کی وہیں شادی کروا دی جہاں بہروز منگنی توڑ کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا لیکن وہ صہیب ہم دونوں باپ، بیٹے کی طرح ضدی اور انا پرست نہیں تھا۔ زندگی میں اس کی اپنی بھی کوئی پسند، کوئی خواہش ہے، یہ مجھے جتائے بغیر بھائی جس لڑکی سے منگنی توڑ کر گیا تھا، اس نے میرے کہنے پر اپنی اسی کزن سے شادی کر لی۔

روحی اگر آج تک مجھ سے خفا ہے، بدگمان ہے تو شاید اس میں اس کا اتنا قصور بھی نہیں۔ میں نے اسے اپنی بہو تسلیم کرنے میں اتنی دیر لگا دی کہ شاید تب تک وہ اپنے دل کے دروازے مجھ پر بند کر چکی تھی۔'' وہ آنکھوں میں نمی لئے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

اس نے انہیں ہمیشہ بہت غلط اور بہت برا سمجھا تھا، لیکن آج جب وہ خود اپنی برائیاں اور غلطیاں قبول کر رہے تھے تب اس کا دل چاہ رہا تھا ان سے کہے۔ آپ اتنے غلط نہیں جتنا خود کو کہہ رہے ہیں، آپ اتنے برے ہرگز نہیں، جتنا خود کو ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ سب ہی ماں باپ اولاد سے فرمانبرداری کی توقع کرتے ہیں۔ ان پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔

''ہم دو انا پرستوں کے بیچ صہیب پل کا کام کرتا تھا۔ وہ کبھی مجھے سمجھاتا کہ آغا جان! بھائی کو واپس بلا لیں، اسے معاف کر دیں، وہ کبھی بہروز کے پاس پہنچتا کہ بھائی اپنے گھر واپس چلو۔ آغا جان ناراض ہیں تو کیا، تمہاری شکل دیکھتے ہی سارا غصہ و ناراضی بھول جائیں گے۔ میں کہتا تھا میں اس کا باپ ہوں، میں اس کے آگے کیوں جھکوں، کیا اسے اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ماں باپ غصے میں کچھ برا بھلا اگر اولاد کو کہہ بھی دیں تو ان کا دل سے وہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا۔''

''کیا اسے اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی کہ ہزار ناراضیوں کے باوجود میں اس کی راہ تکتا ہوں۔

اور بہروز کہتا تھا۔ آغا جان نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ جب تک وہ خود نہیں بلائیں گے، میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ہم باپ بیٹے کے بیچ برسوں یہ انا کی جنگ چلی، صہیب ہم دونوں کو سمجھا سمجھا کر ہار گیا مگر ہم میں سے کوئی اپنی ضد چھوڑنے پر تیار نہ ہوا'' بولتے بولتے وہ ایک پل کے لئے خاموش ہوئے۔

اپنے لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو پایا، آنکھوں کی نمی کو پیچھے دھکیلا پھر اس کی طرف دیکھتے دوبارہ اسی مدھم اور کمزور سی آواز میں بولنے لگے۔

''میری ضد، انا اور غصے کے سبب بہروز اپنے اکلوتے بھائی تک سے بدگمان ہو گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی منگیتر آمنہ سے شادی کر کے صہیب نے میری نظروں میں خود کو زیادہ اچھا اور فرمانبردار بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے میری نظروں سے مزید گرانا چاہا ہے وہ بھائی کو دولت، جائیداد کا لالچی سمجھنے لگا تھا۔

میں نے بہروز کو عاق کر کے سب کچھ صہیب کے نام جو کر ڈالا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے بڑے خوددار اور غیرت مند تھے۔ ان میں سے کوئی بھی دولت، جائیداد کا لالچی اور خود غرض نہیں تھا۔ ان محبت کرنے والے بھائیوں کے درمیان غلط فہمیوں کا سبب میری ضد بن گئی۔

بہروز اس سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا، پھر بھی وہ بڑی پابندی سے گاہے گاہے اس سے ملنے لاہور جاتا رہتا تھا۔ اسے اس کے گھر واپس آنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ وہ میرے غصے سے خائف ہو کر مجھے بتاتا نہیں تھا مگر میں جانتا تھا وہ بہروز سے ملتا رہتا ہے۔ وہ ایک روز تم سے بھی مل کر آیا تھا، شاید تمہارے اسکول۔ وہ تمہاری ایک تصویر بھی کھینچ کر ساتھ لے آیا تھا۔

آغا جان! یہ دیکھیں۔ آپ کی پوتی، میری بھتیجی، کتنی پیاری ہے یہ گڑیا۔ میں نے اس تصویر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ دیکھتے میری انا حائل ہو رہی تھی مگر وہ میرا بیٹا میری رگ رگ سے واقف تھا۔

وہ میری لاتعلقی و بیگانگی کے اظہار کے باوجود اس تصویر کو میرے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ اور پتہ ہے فارہ! وہ مجھے بالکل صحیح طرح جانتا تھا۔ اس کے جانے کے بہت دیر بعد، رات میں اپنے کمرے میں بالکل اکیلے میں نے تمہاری اس تصویر کو اٹھا کر دیکھا تھا۔

اسے بہت دیر تک محبت سے چومتا رہا تھا۔ اسکول یونیفارم میں نو، دس سال کی وہ بچی میری پوتی تھی، میرا خون۔ وہ تم سے میری محبت کا پہلا دن اور پہلا لمحہ تھا فارہ! اور تم سے مجھے متعارف کروانے والا میرا وہ بیٹا جو مجھے بہت اندر تک جانتا تھا۔ تمہاری وہ تصویر آج بھی میرے پاس ایک بہت قیمتی یاد کی طرح رکھی ہے فارہ! اس سے تمہاری اور صہیب دونوں کی یادیں جڑی ہیں۔''

''آپ نے میری تصویر کیوں کھینچی ہے؟'' بہت پہلے کی وہ ایک گرم دوپہر، بچپن کی وہ ایک بھولی بسری یاد، وہ تو اس دن کو غیر اہم جان کر بھول چکی تھی۔ آج آغا جان نے ذکر کیا تو اسے جیسے ایک دم ہی وہ دن یاد آ گیا۔

وہ 5th گریڈ میں تھی، اسکول سے چھٹی کے وقت وہ باہر نکل رہی تھی تب اس نے ایک اجنبی کو بغور اپنی طرف دیکھتا اور اپنے پاس آتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس شخص نے ہاتھ میں لئے کیمرے سے اس کی تصویر اتاری تھی۔ اس شخص نے جھک کر اسے پیار کیا تھا اور اسے ڈھیر ساری چاکلیٹس دینی چاہی تھیں۔

''ممی منع کرتی ہیں۔''

''ممی کو پتہ نہیں چلے گا یار! تم راستے میں کھا لینا۔'' وہ اس کے معصومانہ سے انکار اور ساتھ ساتھ چاکلیٹس کو للچائی نگاہوں سے دیکھنے کو انجوائے کرتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ کیا بچوں کو اغوا کرنے والے ہیں؟'' وہ اپنی سمجھ کے حساب سے معصومیت سے بولی تھی۔

''بچوں کو نہیں صرف تمہیں۔ ایک روز تمہیں اغواء کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارے اکڑو ڈیڈی دیکھتے رہ جائیں گے۔'' وہ اس کی سادگی بھرے بچگانہ استفسار کے جواب میں قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

اور پھر اس کے دونوں گالوں پر پیار کرتا۔ وہ جس گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آیا تھا، اس میں بیٹھ کر وہاں سے واپس چلا بھی گیا تھا۔

بچپن کی وہ یاد وہ چاکلیٹس دینے اور والہانہ پیار کرنے والا اجنبی اس کے چچا تھے، اس کے سگے چچا صہیب خان۔

''اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے وہ بڑی شدت سے یہ بات کہنے لگا تھا کہ میں فارہ کو اپنی بہو بناؤں گا۔ بھائی نہ مانا تو اسے زبردستی اٹھا کر ساتھ لے آؤں گا۔ چچا بھی سرپرست ہوتا ہے، اس کا بھی حق ہوتا ہے۔ آغا جان! آپ اور بھائی لاکھ رشتوں کو توڑنے کی کوشش کرلیں، میرے جیتے جی یہ ٹوٹیں گے نہیں۔ میں انہیں کبھی ٹوٹنے دوں گا نہیں۔''

وہ ان دنوں اکثر اداس لہجے میں یہ بھی کہنے لگا تھا ''آغا جان! آپ باپ بیٹے کے جھگڑے نے مجھ سے میرا بھائی، میرا سب سے پیارا دوست چھین لیا۔ وہ مجھ سے اتنا متنفر ہو گیا ہے۔ اسے تو اب یہ یقین بھی نہیں رہا کہ میں صہیب خان کبھی اس کا سب سے اچھا دوست بھی رہا ہوں۔''

ان دونوں بھائیوں میں بچپن سے بہت دوستی، بہت محبت تھی فارہ؟

ان کی عمروں میں بس سال کا ہی فرق تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ پڑھے بھی ایک ہی کلاس میں، اسکول اور کالج تک وہ دونوں ہمیشہ ساتھ پڑھے، ان میں بہت انڈرسٹینڈنگ، بہت پیار تھا۔ مگر میرے ایک ضدی فیصلے نے بڑے بھائی کو چھوٹے سے حد درجہ بدگمان کروا دیا تھا۔

اپنے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے وہ لاہور بہروز سے ملنے گیا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہمیشہ ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ اس روز اس نے بہروز سے یہ کہا تھا کہ میں فارہ کو اپنی بہو بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جن رشتوں کو تم توڑ دینے پر تلے ہو، میں انہیں پہلے سے زیادہ مضبوط کردوں گا۔ اس کی یہ باتیں مجھے بہروز نے اس کے انتقال کے بعد بتائی تھیں۔

بہروز جو ایک ہفتہ پہلے اپنے دفتر میں ملنے آئے بھائی سے ہمیشہ کی سی لاتعلقی و بیگانگی سے ملتے وقت جانتا نہیں تھا کہ یہ بھائی سے اس کی آخر ملاقات ہے۔ اگر جانتا ہوتا تو کیا اس سے یوں بے گانگی برتتا؟ وہ بہت پیارا تھا۔ بہت اچھا، بہت محبت کرنے والا۔ اس کے دفتر سے اٹھتے صہیب نے اس سے کہا تھا۔

''اب کی بار میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ تم ساری ضد بھلا کر دوڑتے ہوئے پشاور آؤ گے۔'' بہروز نے اس کی بات بغیر دھیان دیئے سنی تھی۔

''اگر میں مر جاؤں پھر تو گھر آؤ گے ناں؟'' وہ بالکل صحت مند اور تندرست تھا پھر پتہ نہیں اس نے ایسی بات بہروز سے کیوں کہی تھی، شاید یونہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی، شاید اس کے وجدان نے اس سے کہلوائی تھی، کون جانے وہ ایسی بات بہروز سے کیوں کہہ کر آیا تھا۔

مگر یہ سچ ہے کہ اس بات کے صرف ایک ہفتے بعد صہیب کا انتقال ہو گیا تھا۔ نہ بیمار پڑا نہ کچھ۔ بس معمولی سی طبیعت خراب ہوئی اور وہ

جیسے ہنستا کھیلتا ہی ہمیں چھوڑ گیا۔ اسے جیسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹا اپنی اپنی ضد اتنی آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔ اس کے لئے اسے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

میں نے اپنی برسوں کی ضد توڑتے بہروز کو فون کیا تھا۔ ''بہروز! تمہارا بھائی چلا گیا۔ میں ٹوٹ رہا ہوں، مجھ میں طاقت نہیں۔ بھائی کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے آ جاؤ بیٹا۔''

فارہ کو وہ فون کال یاد تھی۔ وہ وہیں ڈیڈی کے پاس تو بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا۔ ڈیڈی نے وہ کال ریسیو کی تھی اور پھر اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ ریسیور ہاتھ میں لئے بالکل گم صم ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

تب وہ نہیں جانتی تھی پر آج سمجھ سکتی تھی ڈیڈی کی فیلنگز۔ اس کال کو سن کر ان کے کانوں میں اپنے بھائی کا کہا جملہ گونج رہا ہوگا۔

''اگر میں مر جاؤں پھر تو گھر آؤ گے ناں؟''

''اب کی بار میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ تم ساری ضد بھلا کر دوڑتے ہوئے پشاور آؤ گے۔'' اور وہ دوڑتے ہوئے ہی پشاور جا رہے تھے۔

اسے یاد تھا اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھتے ڈیڈی کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ وہ رو نہیں رہے تھے پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہے ہوں، جیسے ان کے اندر کہیں آنسو ہی آنسو گرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ پشاور چلے گئے تھے۔ تب اسے لگا تھا ڈیڈی اتنے سارے دنوں کے لئے انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور پلٹ کر کوئی خبر بھی نہیں لی اور آج وہ سوچ رہی تھی ڈیڈی نے وہ غم سہا کس طرح ہوگا۔ ان کے دل کے اوپر کیا گزر رہی ہوگی جب انہوں نے اس بھائی کو کفن میں لپٹے دیکھا ہوگا جو ان کی لاتعلقی و بیگانگی کی پروا کئے بنا دوڑا دوڑا ان کے پاس جایا کرتا تھا۔

غم کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں کتنے پچھتاوے، کتنے افسوس اور کتنی آہیں ہوں گی۔ وہ خود پر، اپنی ضد پر کس قدر خفا ہوں گے اور اسے لگا تھا ڈیڈی بدل گئے ہیں، وہ صرف آغا جان کے بیٹے بن گئے ہیں، آغا جان نے انہیں پتہ نہیں ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ وہ، ڈیڈی نہیں رہے ہیں۔

''میں نے بہروز کو سمجھانا چاہا تھا فارہ! کہ اتنی عجلت میں نکاح کا فیصلہ درست نہیں۔ مگر وہ کہتا تھا میرے مرنے والے بھائی کی آخری خواہش تھی، اس کی مجھ سے آخری خواہش۔ عمر بھر اس کی ایک نہیں سنی، مرنے سے پہلے جو ایک خواہش وہ مجھ سے کر گیا تھا۔ میں اسے تو پورا کر دوں۔''

تمہارا اور روحی کا رشتہ ہو جائے، ہمارے ٹوٹے رشتے اس ایک رشتے کی بدولت پھر جڑ جائیں۔ یہ میری بھی خواہش تھی، مگر میں یہ بھی جانتا تھا۔ روحی اس کے لئے راضی نہیں ہوگی، اس لئے بہروز کو سمجھانا اور روکنا چاہا تھا۔ مگر وہ ضدی اس بات پر بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگتا ہے فارہ! کہ شاید بہروز کو بھی صہیب کی طرح اس کے وجدان نے خبر دے دی تھی کہ وہ اب زیادہ جئے گا نہیں، شاید اپنی موت سے پہلے وہ بھائی کی یہ آخری خواہش پوری کر جانا چاہتا تھا۔ اس لئے تھوڑے ضدی انداز میں اپنا فیصلہ روحی سے منوایا تھا۔ تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں فارہ! مگر بیٹا میرا یقین کرو، یہ نکاح میری کوئی ضد یا میرا فیصلہ نہیں، بہروز کا فیصلہ تھا۔ یوں کہہ لو کہ یہ ان دونوں بھائیوں کا فیصلہ تھا جو طے کر بیٹھے تھے کہ پندرہ دن کے اندر آگے پیچھے ہی ہمیں اس دنیا سے، آغا جان کی زندگی سے رخصت ہو جانا ہے۔ میں نے صرف بہروز کی ضد مانی تھی، اس نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں اسے اس کے بھائی کی یہ آخری خواہش پوری کرنے دوں اور میں اس کے

آنسوؤں سے ہار گیا تھا۔

''فارہ! تمہارے ڈیڈی نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ اب ان کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ نہ دوگی؟ ان کی بات نہ مانو گی؟''

اور اسے لگتا تھا آغا جان نے ڈیڈی کو ممی سے متنفر کروا دیا ہے۔ وہ اس روز اپنے ڈیڈی کی فیلنگز کو سمجھ کیوں نہیں پائی تھی۔

''یہ میرے مرجانے والے بھائی کی آخری خواہش تھی فارہ کہ تم اس کی بہو بنو اور ہمارا ٹوٹا رشتہ اس رشتے کے ذریعے پھر سے جڑ جائے۔''

تب نہیں پر آج وہ بری طرح رو رہی تھی، اس انسان کی موت پر، جس کے لئے اس نے زندگی بھر کبھی کوئی فیلنگز محسوس نہیں کی تھی۔ نہ محبت نہ نفرت، جو بس ایک غیر اہم اور انجان شخص تھا۔ اس کا چچا صہیب خان۔

اس سے بہت محبت کرنے والا۔

اسے اس شخص کا اپنے گالوں پر پیار کرنے کا وہ والہانہ انداز یاد آتا۔ خون کی کشش کیا ہوتی ہے۔ خون کا رشتہ کوئی معمولی رشتہ تو نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں سے چھ سال پہلے مرجانے والے اپنے چچا کے لئے آج آنسو بہہ رہے تھے۔

آغا جان کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے اور وہ اسے دیکھتے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں دھیمی اور بھرائی آواز میں بولے جا رہے تھے۔

''فارہ! میں یہ نہیں چاہتا کہ اس نکاح کے لئے مجھے قصوروار اور ذمہ دار ٹھہرانا چھوڑ کر تم صرف اپنے باپ کو قصوروار ٹھہرانے لگو اس سے ناراض ہو جاؤ۔ بیٹا! اپنے ڈیڈی سے ناراض مت ہونا، اس لئے کہ تمہاری ناراضی و بدگمانی دور کرنے وہ اب کبھی تمہارے پاس آ نہیں سکے گا اگر اس سے ناراض ہو تو بھی اپنی ناراضی ختم کر کے اسے معاف کر دو۔''

وہ بھی تو نہیں پوچھ سکی تھی ڈیڈی سے ان کے دل کا حال۔ لاہور اپنے گھر واپس آ کر جب وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس وقت اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے، شاید وہ اس وقت ممی سے بھی کچھ کہنا چاہتے تھے، ممی جو انہیں سمجھے اور ان کے حساسات کو جاننے کی کوشش کئے بغیر ناراض ہو کر چلی گئی تھیں۔

وہ ان کی زندگی کے آخری چند گھنٹے تھے۔ وہ ان کی زندگی کی آخری دوپہر تھی کہ اگلی دوپہر اسی گھر میں اسی جگہ ان کی میت رکھی تھی، پشاور لے جائے جانے کے لئے بالکل تیار۔

''ہمیں جن سے محبت کا بہت دعویٰ ہوتا ہے غم کے لمحوں میں، آزمائشوں کی گھڑیوں میں ہم ان کا حوصلہ، ان کا سہارا کیوں نہیں بن پاتے۔ جب انہیں ہماری ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم سے محبت اور اعتبار پانے کے آرزومند ہوتے ہیں تب ہم انہیں تنہا کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ کیا ان کی زندگی کے ان آخری گھنٹوں میں، ان سے بہت محبت کا دعویٰ کرنے والی ممی کو ان کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے تھا؟ کیا ان کی محبت کا دم بھرنے والی بیٹی کو ان کے قریب نہیں ہونا چاہئے تھا؟

جب وہ زندگی کی بازی ہار رہے تھے، جب وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے تب نہ وہ بیوی ان کے قریب تھی نہ بیٹی۔ اکھڑتی

سانسوں کے ساتھ ان کی بند ہوتی بجھتی آنکھوں نے کتنی حسرت دیاس سے اپنے اردگرد اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاشا ہوگا۔

بیٹا! یہ رشتہ اگر قائم رہتا تو یقیناً یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات ہوتی، لیکن اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں تو میں بھی خوش نہیں۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر تو میرے لئے کچھ اہم نہیں بیٹا! یہ رشتہ میری خوشی ضرور تھا مگر میری ضد ہرگز نہیں۔

میری انا، میری ضد قصہ پارینہ ہیں جان عزیز۔ میں انا پرست اور ضدی تھا فارہ! مگر اب نہیں ہوں۔ صہیب جاتے جاتے مجھے اور بہروز کو یہ سمجھا گیا تھا کہ انا کی جنگ میں جیتتا کوئی نہیں اور ہارتے سب ہیں۔

کیا صہیب کے مرنے پر جب میں نے بہروز کو فون کر کے یہاں بلایا تو اس نے یہ سوچا ہوگا کہ میں جیت گیا'' آخر کار جھکنا تو آغا جان ہی کو پڑا اور کیا بہروز کو فون پر بھائی کے انتقال کی اطلاع دے کر گھر بلاتے میں نے یہ سوچا تھا کہ صہیب کی وجہ سے میں ہار گیا۔ نہیں فارہ نہیں۔

تمہارے اور روحی کا رشتہ نہ میری انا اور ضد تھا اور نہ ہے۔ اسی انا کے زعم میں، میں نے اپنا بیٹا اور بہروز نے اپنے بھائی کھو دیا تھا۔ روحی کے ساتھ انا اور ضد کی کوئی جنگ لڑ کر میں تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ رشتہ تو بہت بعد کی بات تھی، بہت الگ بات۔ میری بنیادی ترجیح، میری اولین خواہش، میری آخر شب کی دعا تو فقط اتنی تھی بیٹا کہ میری بہو اور میری پوتی اپنے گھر واپس لوٹ آئیں۔ جو گھر ان کا حوالہ، ان کی شناخت ہے، وہ اسے اپنالیں، قبول کرلیں۔ خونی، شرعی اور محرم رشتوں کے ہوتے تم دونوں وہاں تنہار ہو چاہے، اس میں تم دونوں کی خوشی ہی کیوں نہ شامل ہو میرا دل اسے گوارا نہیں کرتا تھا۔

روحی کو لگتا تھا کہ میں اس سے اس کی بیٹی کو چھین لینا چاہتا ہوں، اسے مجھ سے شکوہ تھا کہ میں نے اسے ہرانے کی دھن میں اس سے اس کے شوہر کو دور کر دیا تھا۔

میں اسے کبھی یہ نہ سمجھا سکا کہ بہروز مرنے سے پہلے بدلا نہیں تھا، اسے میں نے یا کسی نے بھی ورغلایا نہیں تھا۔ وہ بس بھائی کی اچانک موت کے صدمے کے زیر اثر تھا، وہ اس غم سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔

اس لئے جو جو شرائط وہ میرے سامنے رکھتی گئی۔ میں مانتا گیا۔

اس نے کہا میں اسے اور فارہ کو پشاور لے جانے کی بات پھر کبھی نہیں کروں گا، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ طلاق کی بات کرتی تھی، میں نے کہا فارہ ابھی بہت چھوٹی ہے، پڑھ رہی ہے، اس وقت نکاح یا طلاق سے متعلق کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں۔ اس کا ذہن ابھی باپ کی موت کا صدمہ قبول نہیں کر پایا، ابھی اسے کوئی الجھن اور پریشانی نہ دو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے فی الحال وہ نکاح یا طلاق کی کوئی بات نہیں کرے گی مگر پھر میں بھی اس رشتے کے حوالے سے خاموشی اختیار کیے رکھوں گا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میں اگر خود کو سرپرست اور ذمہ دار قرار دیتا ہی ہوں تو صرف فارہ کا دوں، اس کا نہیں۔ میں سرپرست، نگران اور ذمہ دار صرف اپنی اکلوتی پوتی کا ہوں، وہ میرا ایک پیسہ بھی لینا حرام سمجھتی ہے۔ لہذا مجھے اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے گی کہ میں اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلواؤں، میں نے اس کی بات مانتے تمہارا الگ اکاؤنٹ کھلوا دیا۔

وہ تمہارے ساتھ صرف سرپرستی کے نظریے کے تحت بھی اس اکاؤنٹ کی جوائنٹ اکاؤنٹ ہولڈر بننے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ پر یہ پابندی بھی لگا دی کہ میں ان پانچ سالوں کے دوران اپنی پوتی سے کبھی ملنے نہیں آؤں گا، ہاں فون کبھی کبھار کر سکتا ہوں۔ میں اس کا یہ خوف، یہ بدگمانی دور کر دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے اس کی بیٹی کو چھیننے یا اس پر تسلط قائم کرنے کی کسی کوشش میں لگا ہوں، اس لئے اس کی ہر شرط اور ہر خواہش مانتا چلا گیا۔ میری بہو، میری پوتی، میری ذمہ داری تھیں، میں ان کا سرپرست تھا، انہیں تحفظ نہ دے پاتا، انہیں اپنے گھر کی چھت نہ دے پاتا تو روز قیامت بہروز کا سامنا کیسے کرتا؟ آغا جان! بس یہ تھی آپ کی محبت، میری بیوی، میری بیٹی، تنہا رہتی رہیں اور آپ نے کبھی ان کی پرواتک نہ کی؟''

روتے روتے ان کی آواز پہلے سے بھی دھیمی ہوگئی تھی۔

وہ بہت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے، یوں جیسے کوئی بہت وزنی بوجھ ان پر رکھا ہو یا وہ کسی اونچائی پر چڑھ رہے ہوں اور شدید نقاہت اور کمزوری محسوس کر رہے ہوں۔

''فارہ! بیٹا یہ مت سمجھنا۔ میں تمہیں تمہاری ماں کے خلاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے یہ سب کبھی نہ کہتا اگر مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ ہوتا۔ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی بیٹا! کب بلاوا آجائے پتہ نہیں اور میں اس حال میں مرنا نہیں چاہتا کہ میرے بہروز کی واحد نشانی، میرا خون، میری پوتی مجھ سے خفا اور بدگمان ہو۔ یہ سمجھتی ہو کہ میں اس سے محبت کے دعوؤں میں سچا نہیں ہوں محض ایک انا پرست انسان ہوں۔ فارہ! تم، ولی اور زرمینہ میرے لئے کیا ہو، میں لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتا۔ میری آتی جاتی سانسیں میرے دل کی دھڑکنیں سب تم تینوں کے ساتھ جڑی ہیں۔ میں تم تینوں میں اپنے بیٹوں کو دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔

تم بس میری محبت کا یقین کر لو بیٹا! اس نکاح کے بارے میں سوچے بغیر، تمہارے اس نکاح کو...... میں خود میں ولی سے کہوں گا وہ تمہیں۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔'' ان کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ کھینچ کھینچ کر گہرے گہرے سانس لیتے جیسے انہیں آکسیجن کی شدید کمی محسوس ہو رہی تھی۔

روتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ انہیں سانس لینے میں شدید دشواری کا سامنا تھا، اب کھینچ کر وہ جیسے کوئی بہت ہی شدید تکلیف، کوئی بہت ہی کڑا درد سہنے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ انہیں پسینے آرہے تھے، ان کے چہرے کا رنگ بالکل فق ہو رہا تھا۔

''آغا جان'' ۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ ایک بلند اور ہراساں سی پکار نکلی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' آنکھیں کھول کر درد صبر و ہمت سے برداشت کرتے وہ قصداً اور بدقت مسکرائے، اسے تسلی دینے کے لئے انہوں نے خود ہی اپنے کرتے کی جیب کی طرف ہاتھ لے جانا چاہا تھا، مگر وہ اس سے پہلے ان کی جیب سے وہ دوا نکال چکی تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں آغا جان؟'' آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟'' انہیں وہیل چیئر سے سہارا دے کر بڑی مشکلوں سے اٹھاتے ہوئے وہ صوفے پر آرام دہ حالت میں بٹھا لینے میں کامیاب ہوگئی اور ان کی نبض دیکھی۔

ان کے بائیں بازو میں شدید درد پھیل رہا ہے یہ ان کے مٹھیاں بھینچنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا۔

''سینے پر بہت بوجھ سا ہے بیٹا!'' ان پر شدید ترین نقاہت، بے چینی اور گھبراہٹ طاری تھی۔ ان کا جسم ساکت سا ہو رہا تھا۔

تین منٹ گزرنے پر وہ طبیعت میں بہتری کے آثار نہ پا کر ان کی زبان کے نیچے دوسری گولی رکھوا چکی تھی۔ اس نے ان کی نبض پھر دیکھتے بغور ان کے کرب و اذیت میں ڈوبے چہرے کو اور بے جان سے ہوئے جسم کو دیکھا۔ وہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ بتا نہیں پا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے نکلی۔

جس دروازے سے کچھ دیر قبل وہ ان کے ساتھ باہر نکلی تھی، اس سے ان کے کمرے میں داخل ہوئی ان کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک طرف بی بی اپریٹس رکھا تھا اس نے وہ اسٹیتھو اسکوپ سمیت اٹھایا، پین کلر کا پتہ اور پانی کی ایک بوتل اور بہت تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آئی، جہاں وہ تینوں ابھی بھی اس طرح باتیں کر رہے تھے۔

''ولی!'' خود پر بمشکل کنٹرول رکھتے ہوئے اس نے اسے آواز دی۔ وہ تینوں ایک ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جو وہ تینوں یک دم ہی صوفے پر سے بھی بے اختیار کھڑے ہوئے تھے۔ ''آغا جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' وہ اطلاع دے کر رکی نہیں بلکہ الٹے قدموں واپس وہیں بھاگی۔

وہ تینوں اس کے ساتھ بھاگے، ولی اس سے آگے نکل آیا تھا مگر کمرہ خالی دیکھ کر چونک کر رکا، وہ تب تک دوسرے دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ ولی اسی طرف دوڑا، پیچھے عباد اور زرینہ بھی تھے۔

''کہاں ہیں آغا جان؟ تم انہیں ان کے کمرے سے باہر لے کر کس کی اجازت سے گئیں؟ تمہیں نہیں پتہ، معمولی سے کام اور حرکت سے وہ تھک جاتے ہیں، انہیں انجائنا کا اٹیک ہو جاتا ہے۔'' زرینہ اسے پورشن میں داخل ہوتا دیکھ کر چلائی۔ وہ اسے جواب دیئے بغیر اندر لاؤنج میں آ گئی۔

ولی اس کے ساتھ وہاں داخل ہوا تھا۔ ولی نے انہیں آواز دی، انہیں چھو کر دیکھا، انہوں نے ایک پل کے لئے آنکھیں کھولیں پھر بند کر لیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے گہرے گہرے، اکھڑے ہوئے سانس لے رہے تھے۔

ان کے چہرے پر چند منٹوں کے اندر انتہا سے زیادہ کمزوری، سرخی اور تپش پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ان کا بی پی دیکھنے فوراً ان کے پاس جانے لگی مگر زرینہ نے ایک جھٹکے سے بی پی اپریٹس، اس کے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور اسے دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔

''خبردار جو تم نے میرے آغا جان کو ہاتھ لگایا۔'' وہ روتے ہوئے اس پر چلائی۔

وہ بہت بری طرح رو رہی تھی، اس کے بری طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تو اپریٹس ہی صحیح سے نہیں تھاما جا رہا تھا۔ دھکیلے جانے کے بعد وہ اس سے ایک قدم پیچھے ہی کھڑی تھی، اس نے خاموشی سے زرینہ کے ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ بازو بند کس کر صحیح سے باندھا۔ اسٹیتھو اسکوپ کان سے لگایا اور ان کا بی پی چیک کرنے لگی۔ ولی اور عباد آغا جان کے بالکل پاس کھڑے کبھی اسے اور کبھی آغا جان کو دیکھ رہے تھے۔

ولی نے زرینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا مگر وہ بہت بری طرح روئے چلی جا رہی تھی۔ تین تین منٹس کے وقفے سے وہ انہیں پانچ ٹیبلٹس دے چکی تھی، دوبارہ نبض دیکھی تھی بی پی دیکھا تھا، طبیعت میں بہتری نہ پا کر ایک پین کلر بھی دے دی تھی۔

مگر وہ اسی طرح تکلیف میں تھے، وہ اسی طرح درد کی شدتیں محسوس کر رہے تھے، ان کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا تھا، ان کی کمزوری ہر لحظہ بڑھتی ہی نظر آ رہی تھی۔

اب ان کا فوراً ECG ہونا بہت ضروری تھا۔ انہیں فوراً کسی اچھے ہاسپٹل لے جایا جانا اب لازمی تھا۔ اس نے اپنے برابر کھڑے ولی کی طرف دیکھا، اسے اس سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں پڑی شاید اس وقت وہ خود بھی انہیں ہاسپٹل لے جانے ہی کا فیصلہ کر رہا تھا تب ہی خاصی عجلت میں عباد سے بولا۔

''عباد! گاڑی نکالو، میں آغا جان کو لاتا ہوں۔'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

ولی نے بڑی احتیاط اور آرام سے آغا جان کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور باہر نکلا، وہیل چیئر پر بڑی احتیاط سے چلاتا ہوا۔ زرینہ روتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگی تھی، وہ بھی ان دونوں کے ساتھ ہی باہر آ گئی تھی۔

''زرینہ! آغا جان کی رپورٹس لے کر آؤ۔'' اس نے بری طرح روتی زرینہ سے کہا۔

وہ زار و قطار روتے بس خوفزدہ نگاہوں سے آغا جان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے جیسے ولی کی بات دھیان سے سنی بھی نہیں تھی۔ مایوسی سے بھن پر ایک نگاہ ڈالتا وہ فارہ سے بولا۔

''آغا جان کے بیڈ سائیڈ ٹیبل کے اوپر والی دراز میں براؤن رنگ کی ایک فائل رکھی ہے وہ لے آؤ، اس کے نیچے کچھ دوسری رپورٹس اور ایکس ریز بھی ہیں، وہ بھی لے آؤ۔'' وہ بھاگتے ہوئے کمرے میں آئی جو جو کچھ ولی نے کہا تھا وہ سب نکالا اور باہر پورچ میں آ گئی۔

گاڑی سٹارٹ کیے عباد اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ آغا جان کا سر اپنی گود میں رکھے ولی پیچھے بیٹھا تھا اور زرینہ بھی آغا جان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے پیچھے ہی بیٹھی تھی۔

وہ ان ہاتھوں کو چومتی اسی طرح روتی جا رہی تھی۔ فارہ وہ فائل اور دوسرے خاکی لفافے ہاتھ میں لیے اگلی سیٹ پر عباد کے برابر بیٹھ گئی۔ اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے، اس کا دل بھی زرینہ کی طرح ہسٹرک ہو کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر خود پر قابو رکھتے، خود کو یہ یاد دلاتے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے، وہ ڈاکٹر جس پر اس کے دادا کو فخر ہے، خود کو سنبھال رہی تھی۔

''لوگوں کو ایک ڈاکٹر بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ میرے پاس تو دو، دو ہیں اور وہ بھی راؤنڈ دا کلاک۔''

''خبردار جو میری پوتیوں کی قابلیت پر کوئی شبہ کیا ہو تو۔ میری پوتیاں ذہین، قابل، لائق فائق۔''

ہاسپٹل تک پہنچنے کے اس راستے میں ان کی میڈیکل ہسٹری سے آگاہ ہونا چاہتی تھی تاکہ ان کے کارڈیالوجسٹ سے بہتر انداز میں بات کر سکے۔ اس نے وہ موٹی فائل کھولی۔ اس میں تاریخ کے اعتبار سے آغا جان کی تمام رپورٹس ترتیب سے لگی تھیں۔ تین روز قبل ہونے والے ان کے ای سی جی اور ہفتہ قبل ہونے والے ایکو کی رپورٹس سب سے اوپر ہی لگی ہوئی تھی۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھتی صفحے پلٹنے لگی، ترتیب سے کئی ای سی جی تھے، خون کی کئی رپورٹس تھیں۔

وہ ایک ای سی جی کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔ اس نے اس ای سی جی پر درج تاریخ اور وقت پڑھا۔ 6 نومبر شام چھ بج کر پندرہ منٹ 6 نومبر 6 نومبر۔

''مجھے طلاق چاہئے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔'' آغا جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں اور ان سے وابستہ ہر چیز کو رد کرنے والا وہ دن، کیا تاریخ تھی اس روز؟ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی، اسے یاد تھا۔ دو مہینے پہلے کی وہ صبح چھ نومبر کی صبح تھی۔ بہت سادہ سی بات تھی، بہت عام سی، چھ نومبر کی صبح اس نے انہیں اور ولی صہیب خان کو اپنے گھر پر ذلیل و بے عزت کیا تھا، دوسروں سے کروایا تھا اور چھ نومبر کی شام انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

اور یہ ہاسپٹل کی ڈسچارج شیٹ تھی۔ چھ نومبر کو دل کے دورے کے سبب ہاسپٹل داخل ہونے والے محمد بختیار خان وہاں سے بیس نومبر کو ڈسچارج ہوئے تھے۔

''بیٹا! میری صحت ٹھیک نہیں۔ میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں۔ فارہ سے ایک بار میری بات کروا دو۔'' یہ نو نومبر کی رات تھی۔

چھ نومبر کو اتنے شدید ہارٹ اٹیک کا شکار ہونے والا نو نومبر کو کہاں ہوگا؟ آئی سی یو میں؟ سی سی یو میں اور فارہ بہروز خان صوفے پر بیٹھی تھی، بے نیاز و لاتعلق۔ اس کی ماں آئی سی یو یا سی سی یو سے التجا کرتے اس بوڑھے انسان پر چلا رہی تھی۔

''فارہ آپ سے بات نہیں کرے گی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا، وہ آپ سے صاف صاف کہہ چکی ہے۔ آپ کے خاندان سے جڑ کر اس کی ماں کو کونسا سکھ نصیب ہو گیا جو وہ خود کو قربان کر ڈالے۔ وہ آپ سے کہہ چکی ہے کہ اسے آپ سے اور آپ کے پوتے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ اگر آپ کو جگ ہنسائی اور اپنی عزت کا خیال ہے تو کہیے اپنے پوتے سے خاندانی اور مہذب ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے میری بیٹی کو طلاق دے دے۔ یا اگر واقعی آپ کو اپنی پوتی سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ فرما رہے ہیں، تو اسے جائیداد میں اس کا جائز اور قانونی حق دے کیوں نہیں دیتے۔'' وہ سکون سے بیٹھی رہی تھی اور اس کی ماں اس بوڑھے انسان پر خوب چلا کر فون بند کر چکی تھی۔

''کیا فرما رہے تھے بزرگوار؟'' تجمل ماموں نے طنزیہ انداز میں ممی سے پوچھا تھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں۔ فارہ سے ایک بار میری بات کرا دو۔ ہونہہ! ساری زندگی اپنی بیماریوں اور مرنے کے ڈراوے دیتے آئے ہیں اور زندہ خیر سے اب تک ہیں۔ پہلے بیٹے کی موت اور اپنی بیماری کو ہتھیار بنا کر میرے شوہر کو میرے خلاف کیا، میری بیٹی کا زبردستی نکاح پڑھوایا اور اب بیماری کے ڈرامے کر کے فارہ سے اپنا من چاہا فیصلہ کروا کر اسے میرے خلاف لے جانا چاہتے ہیں۔'' ممی نفرت سے بولی تھیں۔

''ابھی تین روز پہلے تو یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ مجھے تو بالکل بھلے چنگے دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے بالکل تندرست۔ اب اس بڑھاپے میں نوجوانوں جیسی صحت تو ان کی ہونے سے رہی۔'' زہرہ مامی کا لہجہ ہتک آمیز اور انتہائی تمسخرانہ تھا۔

اس کے کانوں میں آغا جان کی کچھ دیر پہلے کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ اگر زمین اور آسمان کے بیچ کوئی جگہ ایسی تھی جہاں وہ اپنا یہ سنگدل اور ظالم وجود چھپا سکتی ہو تو وہ وہاں عمر بھر کے لئے چلی جانا چاہتی تھی۔

”تم میرے پاس یہاں آئیں، تمہارا بہت شکریہ بیٹا!“ وہ بوڑھا انسان کوئی شکوہ، گلہ اور شکایت کیے بغیر اس شقی القلب، گھٹیا، پیچ اور پست لڑکی کا شکریہ ادا کررہا تھا جو یہاں بوڑھے بیمار دادا سے ملنے نہیں بلکہ ایک ایگریمنٹ ایک معاہدے کے تحت آئی تھی۔

”تم علیحدگی چاہتی ہو۔ میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ محبتوں کی عینک لگا کر اسے دیکھتے تھے، اس لیے اس کا گھٹیاپن اس کی پست ذہنیت انہیں نظر نہیں آتی تھی، مگر ولی صہیب خان کو نظر آتی تھی۔

وہ بوڑھا بیمار دادا جو اس کی راہ تک رہا ہے، اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کو مچل رہا ہے، وہ اس کی بیماری، بے چینی اور بے بسی سن کر بھی وہاں نہیں جائے گی، وہ گھٹیا اور بے غیرت لڑکی جو بات سن کر وہاں جانے کو آمادہ ہوسکتی تھی اس نے وہی بات اس سے کہی تھی اپنی انا، اپنی ضد اور اپنی عزت نفس کو پس پشت ڈال کر۔

اس لیے کہ وہ اس کے گھٹیاپن اس کی سنگدلی اور بے حسی سے بخوبی آگاہ تھا۔ دادا کی بیماری کا سن کر وہ کبھی یہاں آتی؟ کبھی بھی نہیں۔

وہ بوڑھا انسان بیمار تھوڑی تھا۔ وہ تو بیماریوں کے ڈرامے کیا کرتا تھا، اپنی موت سے ڈرا کر لوگوں سے من چاہے فیصلے کروایا کرتا تھا۔ وہ محبتیں لٹانے والا دادا اپنی اس پوتی کی اصلیت جان لے کہ وہ اس کی محبت میں نہیں بلکہ طلاق کے لالچ میں آئی ہے، اس سے رشتے جوڑنے نہیں بلکہ ہر رشتہ توڑنے آئی ہے تو کیا گزرے گی اس کے بیمار و کمزور دل پر؟

اسے اپنے وجود سے گھن آئی۔

جب اس کا بوڑھا بیمار دادا مرنے کو پڑا تھا، تب وہ اسے خلع کے نوٹس بھجوا رہی تھی، جب وہ اسے اس کے موبائل اور گھر کے نمبروں پر کال کر کرکے تھکتا، بستر پر نڈھال پڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا تب وہ اپنے گھر میں اپنی خود ساختہ محرومیوں اور غموں کا ماتم کررہی تھی۔

وہ تو نئے سال کے اس پہلے دن ولی صہیب خان کی فون پر آواز سننے کی بھی روادار نہ تھی۔ لفظ طلاق نے اسے اس کی بات سننے پر آمادہ کیا تھا۔

”ولی! فارہ کہاں ہے؟“ اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ان کی بہت ہلکی آواز سنی۔

”فارہ ہمارے ساتھ ہے آغا جان!“ ولی نے سنجیدگی سے انہیں جواب دیا۔

”زرینہ! میں ٹھیک ہوں بیٹا!“ اس بار انہوں نے سست آواز میں روتی ہوئی زرینہ کو تسلی دی۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنی دونوں پوتیوں کی فکر تھی۔

وہ ریورٹس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی، اس میں جرأت ہی نہ تھی گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کی۔ گاڑی ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوچکی تھی۔

یہ تینوں باہر کوریڈور میں کھڑے تھے اور ولی اندر سی سی یو میں تھا۔ وہ اندر ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر ولی کو جاتا دیکھ کر باہر رک گئی تھی۔

”کیا کہا تھا تم نے میرے آغا جان سے؟“ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی جب زرینہ آنسو صاف کرتی کسی زخمی شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی تھی۔ وہ اس کے سر پر کھڑی خونخوار نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”وہ ابھی دوپہر تک، تھوڑی دیر پہلے تک بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے ان کے لیے کھیر پکائی ہے، یہ سن کر خوش ہورہے تھے، صبح لالہ نے

انہیں نہلوایا تھا، انہوں نے اپنے سارے کام آرام سے کیے تھے، وہ بالکل ٹھیک تھے، ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ تم نے انہیں کچھ کہا ہے جو ان کی طبیعت ایک دم بگڑی ہے۔ کیا کہا تھا ان سے؟ تمہیں طلاق چاہئے، جائیداد میں اپنا حصہ چاہئے؟ نفرت و حقارت سے اسے دیکھتے وہ زور سے چلائی۔

عباد فوراً اس کے پاس آیا۔

''زرینہ! بری بات ہے، اس طرح بات نہیں کرتے۔ یہ ہاسپٹل ہے، سی سی یو ہے۔ تم تو خود میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو تمہیں نہیں پتہ یہاں آہستہ آہستہ آواز میں بولتے ہیں۔''

ولی موبائل پر کسی کا نمبر ملاتا باہر نکلا تھا، اس نے ایک نظر اس منظر کو دیکھا مگر اس کے کچھ کہنے یا سمجھنے سے پہلے زرینہ اس کے پاس بھاگتی ہوئی آگئی۔

''آپ اسے اپنے ساتھ کیوں لے کر آئے لالہ؟ دیکھیں، اس نے آغا جان کو پھر کہاں پہنچا دیا۔ آپ اسے طلاق دے دیں۔ آپ اسے جائیداد میں اس کا سارا حصہ بلکہ حصے سے بھی زیادہ دے دیں اور اس سے کہیں یہ اب عمر بھر ہمیں اپنی شکل نہ دکھائے۔ چلی جائے وہیں واپس جہاں سے آئی ہے۔

اس کے پاس تو اس کے ہمدرد اور مہربان بہت ہیں، ہمارے پاس تو بس یہ ایک دادا ہی ہیں، انہیں کیوں ہم سے چھین لینے یہاں آئی ہے۔'' وہ ولی کے بازو پر سر رکھ کر پھر زار و قطار رونے لگی۔ روتے روتے اس نے یک لخت سر اوپر اٹھایا اور بہت نفرت سے بولی۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو فارہ خان! اگر میرے آغا جان کو کچھ ہوا تو میں تمہیں چین سے جینے تو ہرگز نہیں دوں گی۔''

ولی اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر آہستہ آواز میں بہت پیار سے اس سے کچھ کہتا، اسے قریب نظر آتی ایک بینچ کی طرف لے گیا۔

عباد نے ایک شرمندہ سی نگاہ فارہ پر ڈالی۔ وہ شاید زرینہ کے رویے کی تلافی کے لئے اس سے کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ ان تینوں پر ایک نگاہ ڈالتی اندر آغا جان کے پاس سی سی یو میں آگئی۔

انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی، ان کی آنکھیں بند تھیں، ان کے سینے پر کچھ تار چسپاں تھے، ان کے دل کی رفتار، ان کی دھڑکنوں کا شمار کرتی کچھ مشینیں ان کے قریب موجود تھیں۔

وہ سانس صحیح سے لے رہے ہیں ان کا دل دھڑک رہا ہے کہ نہیں، اس نے ایک ڈری ڈری نگاہ ان پر ڈالی اور پھر اس مشین پر۔ ان کے سوئی پیوست ہوئے ہاتھ کو اس نے جھک کر آہستگی سے چوما۔

''آپ کو میرے پاس سے اپنے بیٹے کی خوشبو آتی ہے اور مجھے آپ کے پاس سے اپنے باپ کی خوشبو آتی ہے۔ ہمارا رشتہ تو اتنا مضبوط، اتنا اٹوٹ ہے۔ بہت بری فارہ کو آپ نے بہت دیکھا ہے، ایک بار اسے اچھا بننے کا موقع دے کر بھی دیکھیں۔

ابھی ابھی آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ کی سانسیں، آپ کی دھڑکنیں، میرے ساتھ جڑی ہیں، پھر جب میں سانس لے رہی ہوں، میرا دل دھڑک رہا ہے تو آپ کی سانسیں کیسے ختم ہو سکتی ہیں، آپ کی دھڑکنیں کیسے خاموش ہو سکتی ہیں۔''

وہ بہت آہستہ آہستہ آواز میں ان سے کہہ رہی تھی، اس کی آواز ان کی سماعتیں سن رہی ہیں اسے یقین تھا۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو بڑے خاموشی سے گر رہے تھے۔

''آپ برسوں سے مجھ پر محبتوں کی بارش برساتے آئے ہیں۔ ایک بار مجھے بھی تو موقع دیں، میں آپ سے اپنی محبت ثابت کر سکوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں آغا جان! میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں سرگوشی کے سے انداز میں، ایسے جیسے انہیں ڈسٹرب نہ کرنا چاہتی ہو، آنسو بہاتی انہیں اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی۔

اسی وقت پردہ کھینچ کر کوئی اندر آیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور کرسی پر سے فوراً کھڑی ہوگئی۔ ولی تھا، اس کے ساتھ ایک سینئر ڈاکٹر اور پیچھے ایک جونیئر ڈاکٹر اور نرس بھی تھے۔

وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی مگر نکلتے نکلتے جو آوازیں اور باتیں اس نے سنیں وہ اسے یہ سمجھا گئیں کہ یہ سینئر ڈاکٹر آغا جان کے کارڈیالوجسٹ تھے۔ آغا جان برسوں سے انہی کے زیرِ علاج تھے۔

زرمینہ سی سی یو لکھے شیشے کے دروازے کی طرف مسلسل امید، آس، خوف اور ہراس سے دیکھے جا رہی تھی اور عباد اس کے پاس بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک طرف خاموشی سے آکر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

وہ ہاسپٹل آنے کے راستے میں سرسری ان کی ساری رپورٹس دیکھ آئی تھی۔ ان کی تینوں ہارٹ اٹیکس کی تفصیلات بھی دیکھ لی تھیں۔ ان کا دل کتنے فیصد کام کر رہا ہے اور کتنے فیصد زخم خوردہ و بے کار ہو چکا ہے وہ یہ بھی جان چکی تھی۔ پہلے ہارٹ اٹیک کی تاریخ اس کی پیدائش سے بھی قبل کی تھی۔

دوسرا ہارٹ اٹیک وہ تھا جب صہیب خان کا انتقال ہوا تھا اور جب بستر پر بیمار پڑے اس وجود سے اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ممی کو تو وہ بیماری ہی ڈھونگ اور ڈرامہ لگی تھی۔

اور تیسرا، تیسرے کی تو بات ہی الگ تھی۔

پچیس فیصد جس کا دل کام کر رہا ہو، جو تین ہارٹ اٹیکس سہہ چکا ہو، جو معمولی کاموں کے کرنے سے بھی انجائنا میں مبتلا ہو جاتا ہو، اس کے لئے ڈاکٹر کیا کہتا۔ میں دوا کرتا ہوں آپ دعا کیجئے۔ مریض کو خوش رکھئے، اسے ٹینشن میں نہ آنے دیجئے۔ اسے خوشگوار ماحول دیجئے، کوشش کیجئے کہ کوئی اختلافی امور لڑائی جھگڑا اس کے سامنے نہ ہو۔

اگر نفرتوں کے مضبوط قلعے میں مقید اس کی پوتی ایسا ہونے دے تو۔ گھڑی گھنٹے آگے بڑھا رہی تھی اور وہ چاروں کسی طے شدہ معاہدے کے بغیر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اندر ان کے پاس سی سی یو میں جا کر بیٹھتے اور پھر دوسرے کو اندر آنے کا موقع دیتے خود باہر آ جاتے تھے۔

عباد نے اپنے گھر فون کر کے اپنے چھوٹے بھائی سے دونوں بچوں کو گھر لے جانے کو کہہ دیا تھا کہ آغا جان کے گھر پر بہت سے ملازمین کی موجودگی کے باوجود بھی وہ بہت چھوٹے بچے ماں باپ کے بغیر اکیلے رہ نہیں سکتے تھے۔

''آغا جان کے پاس میں ہوں۔ تم لوگ گھر جاؤ۔'' رات دس بجے ولی، زرمینہ اور عباد سے بولا تھا، اس کی طرف دیکھے یا اس کا نام لئے بغیر یہ بات کہی گئی تھی مگر ظاہر ہے اس جملے کی مخاطب وہ بھی تھی۔

زرمینہ گھر جانے کے لئے کسی قیمت پر آمادہ نہیں تھیں۔ وہ ولی اور عباد سے یہاں رکنے کی ضد کر رہی تھی۔ عباد اور ولی نے بڑی مشکلوں سے اسے بچے گھر پر اسے یاد کر رہے ہوں گے اور سی سی یو میں تو ویسے بھی ایک سے زیادہ کوئی فرد رک نہیں سکتا جیسی باتیں کہہ کر گھر جانے پر راضی کیا تھا۔

زرمینہ دوبارہ اندر آغا جان کو دیکھنے چلی گئی تھی، وہ چند منٹوں بعد واپس آئے گی تو یقیناً ولی اسے بھی ان لوگوں کے ساتھ جانے کے لئے کہے گا۔ بہت زیادہ مضطرب اور بے قرار ہوتے وہ سیدھی ولی کے پاس آئی۔

''ولی! میں آغا جان کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں، تم یہاں اکیلے۔''

''ولی! پلیز مجھے یہاں رکنے دو۔ پلیز مجھے یہاں سے مت بھیجو۔'' وہ کہتی تھی کہ اجنبیوں کے سامنے آنسو نہیں بہاتی اور اس پل ولی سے التجائیہ انداز میں یہ بات کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

دوپہر سے اسپتال میں آنے کے بعد زرمینہ جتنا روئی تھی وہ اتنی ہی خاموش رہی تھی، دیوار سے ٹیک لگا کر کوریڈور میں اکیلی، بالکل خاموش کھڑی رہی تھی۔ عباد نے اس سے بینچ پر بیٹھنے کو ایک دو بار کہا تھا مگر وہ ویسی ہی کھڑی رہی تھی۔ اس وقت سامنے کھڑے عباد نے اسے یوں روتے تاسف سے دیکھا ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا کہ وہ اسے تسلی دے سکتا یا کوئی اپنائیت بھری بات کہہ سکتا، مگر اس وقت اس کا اسے تسلی دینے کو دل چاہا تھا۔ عباد نے ولی کو بغور دیکھا۔ کاش ولی اسے یہاں رکنے دے۔ اس نے دل میں سوچا۔ ولی نے فارہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھنے کے بعد کچھ سوچا تھا، پھر اس پر سے نظریں ہٹا کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' زرمینہ بھائی سے سخت شاکی کہ اسے گھر بھیج کر وہ اس لڑکی کو آغا جان کے پاس رکنے کی اجازت دے رہا ہے، جو آغا جان کی آج اس حالت کی ذمہ دار ہے۔ عباد کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ آغا جان کے پاس اندر آ گئی اور ولی باہر شاید کسی بینچ پر بیٹھا تھا۔

آغا جان کو بدستور آکسیجن لگی تھی، سکون آور ادویات کے زیر اثر وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ کرسی ان کے بیڈ کے بالکل قریب کر کے ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی اور اس کے ذہن کی سکرین پر ماضی کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

اس انسان کی اس موجودہ حالت کی ذمہ دار وہ تھی، انہیں اس حالت تک پہنچانے والی وہ تھی مگر وہ یاد کرنا چاہتی تھی۔ ماضی میں اس شخص کے ساتھ اس نے کیا کیا کچھ غلط کیا تھا۔

''آ گئے میرے بچے۔'' یہ اس بوڑھے انسان کے لبوں سے اس نے پہلے الفاظ سنے تھے۔ یہ اس کی اس کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ سرسری نگاہوں سے اس نے اس بوڑھے انسان کو کسی توجہ اور دلچسپی کے بغیر دیکھا تھا۔

یہی وہ آغا جان تھے ناں جنہوں نے اس کے ڈیڈی کو ممی سے محبت کے جرم کی سزا دیتے برسوں پہلے ان کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور اس

کی ممی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔

''فارہ! اپنے دادا کے پاس نہیں آؤ گی؟ روحی بیٹا! تم وہاں کیوں رک گئیں۔ یہاں آؤ۔ کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟ دیکھو تو صہیب کیسے مجھ سے چھوٹ گیا؟'' انہوں نے ان کے استقبال کے لئے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اٹھ نہ سکے تھے۔

بیٹے کی موت کے تیسرے دن ان کے بیمار دل پر ایک تازہ زخم لگا تھا، انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ کئی دن اسپتال رہ کر اس روز گھر واپس آئے تھے۔ وہ اپنے اس وقت کے رویوں کے لئے خود کو ٹین ایجر، ناسمجھ، ناتجربہ کار، کم سن کہہ کر جان چھڑا لے مگر ممی کے رویے کو کیا نام دے؟ جنہوں نے رسم دنیا کے لئے بھی آغا جان سے ان کے بیٹے کے انتقال پر تعزیت نہ کی، شوہر کو غم کی اس گھڑی میں حوصلہ نہ دیا، اس کی دل جوئی نہ کی، ولی اور زرینہ کے سروں پر شفقت بھرا ہاتھ نہ پھیرا۔

ممی نے ہمیشہ اپنی غلطیوں کا الزام آغا جان پر ڈالا۔ آخر کیوں؟ ان کا شوہر آغا جان نے ان سے دور کروا دیا تھا یا وہ خود بدگمانیوں میں گھر کر شوہر سے دور ہو گئی تھیں۔

ڈیڈی 23 سال بعد اپنے گھر آئے تھے، باپ سے ملے تھے اور کس حال میں ملے تھے۔ ان کا مسکرانا، زندگی سے بھرپور، صحت مند بھائی زندگی کی بازی ہار گیا تھا، انہیں منا منا کر واپس بلا بلا کر ہار گیا تھا۔ باپ شدید بیمار تھا۔ انہیں شدت سے یہ احساس ندامت ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ضد توڑ کر یہاں پہلے کیوں نہیں آئے۔

ممی بجائے ان کی کیفیت، ان کا غم، ان کا درد سمجھنے کے ان سے دور ہو گئیں۔ اپنے اور ان کے بیچ ایک اجنبیت قائم کر ڈالی۔

انہوں نے تو یہاں آنے سے قبل ہی ڈیڈی کی پندرہ روز غیر حاضری اور دوری پر یہ بدگمانی اور شک دل میں راسخ کر لیا تھا کہ ڈیڈی کو ان کے گھر والوں نے ممی کے خلاف کر دیا ہے۔ وہ اس گھر میں پہلی بار آئی تھیں، وہ اپنے سسر سے پہلی بار مل رہی تھیں مگر دل میں کینہ و نفرت لئے۔

اس کا نکاح تو ایک بالکل الگ واقعہ تھا اور اس واقعہ کی وجوہات آغا جان نے اسے آج بتائی تھیں لیکن آج وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نکاح نہ ہوتا صرف اپنا لاہور کا گھر چھوڑ کر پشاور آغا جان کے گھر مستقل رہائش اختیار کرنے کی بات ہی ڈیڈی نے کی ہوتی، ممی تب بھی یونہی ری ایکٹ کرتیں جیسے انہوں نے تب کیا تھا۔

اس گھر نے برسوں انہیں یہاں کی بڑی بہو کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا تھا اور اب وہ اس گھر اور یہاں بسنے والوں کو معاف کرنے کو تیار نہ تھیں۔ یہ نہ سوچا کہ اس گھر نے ایسا تئیس برس پہلے کیا تھا۔ ڈیڈی ان تئیس برسوں میں پلٹ کر کبھی یہاں آئے ہی نہیں، اگر پلٹ کر آتے تو کیا پتہ یہ گھر بانہیں کھول کر ان کا استقبال کرتا۔ اس کے نکاح کے لئے ہونے والا ممی اور ڈیڈی کا جھگڑا جس کے لئے اس نے ہمیشہ ممی کو مظلوم اور ڈیڈی کو ظالم سمجھا تھا۔ آج جب ڈیڈی کے نظریے سے سوچ رہی تھی، ان کے دل میں جھانک کر اور ان کی نگاہوں سے اس دن کو یاد کر رہی تھی تو احساس ہو رہا تھا جھگڑا ڈیڈی نہیں ممی کر رہی تھیں۔ وہ شوہر سے کس لہجے اور کس انداز میں مخاطب تھیں۔ روحی بیٹا! سارے گلے، رنجشیں اور پچھلی ہر بات بھول جاؤ۔ تم میرے لئے میری بہو نہیں بیٹی ہو۔'' ممی کی آنکھوں میں موجود نفرت دیکھنے کے باوجود کس طرح ان تین دنوں میں کئی بار ممی سے یہ جملے کہہ چکے تھے اور

وہ نفرت بھری خاموشی لئے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔

ڈیڈی کو بیوی کے اس تحقیر اور نفرت بھرے رویے سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا کتنا دکھ ہوا ہوگا، جس کی محبت میں انہوں نے باپ کی نافرمانی کر کے، ناراضی مول لے کر، اپنے گھر اور اپنی ہر محبوب چیز کو چھوڑ ڈالا تھا، آج جب وہ اس سے یہ امید کرتے تھے کہ وہ ان کو سمجھتے، دکھ کی اس گھڑی میں ان کے ساتھ کھڑی ہوگی تب وہ ان سے ناراض ان کے مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔

ممی نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا، لاہور واپس آ کر وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔

یہ اعلان تھا اس بات کا کہ وہ شوہر کے ساتھ پشاور اس کے باپ کے گھر نہیں جائیں گی، وہ اگر بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ وہ اپنے نکاح پر ڈیڈی سے اتنی ناراض اور شاکی تھی کہ اسے ممی کا ہر رویہ درست نظر آتا تھا۔

ہمیشہ اتنی چاہتیں لٹانے والا باپ، بیٹی سے والہانہ محبت کرنے والا باپ اگر اپنی عادت و مزاج کے خلاف ہمیشہ سے کچھ مختلف کر رہا تھا اس کے اسباب جاننے کی کوشش کئے بغیر اسے بھی باپ ظالم اور سخت گیر نظر آنے لگا تھا۔

شوہر کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کے پاس نہ ہونے کا الزام ممی بڑے اطمینان سے آغا جان پر ڈال کر اپنے اندر سر اٹھاتے احساس ندامت و پشیمانی کو چین دلا دیتی تھیں مگر جو سچ تھا وہ سچ تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ساتھ گزار دینے کے باوجود شوہر کی زندگی کے آخری دنوں میں اسے سمجھا نہیں۔

تئیس سال تک جس شوہر نے انہیں محبت، عزت، وفا، سکھ اور چین سب کچھ دیا جب اسے ضرورت پڑی تب وہ اپنی وفا نبھانے اس کے ساتھ کھڑی نہ ہوئیں اور وہ خود اٹھارہ سال محبتیں، چاہتیں اور شفقتیں لٹانے والا وہ باپ کیا اس پر اپنی بیٹی پر اتنا حق بھی نہیں رکھتا تھا کہ اگر کہیں اس کا رشتہ طے کرنا چاہتا تو کر دیتا۔

کیا وہ ایسی بیٹی نہ تھی جو سوچ سکتی میرا محبتیں لٹانے والا باپ کبھی میرے لئے کچھ غلط نہیں سوچ سکتا، اس کے اس فیصلے کا یقیناً کوئی سبب ہے اور یقیناً وہ اس میں میری بہتری دیکھ رہا ہے۔

سنگ دلی اور ظلم کی حد تھی، اس نے اور ممی نے ڈیڈی کی موت کا ذمہ تک اس شخص کو قرار دے دیا تھا۔

جس روز اس کا باپ مرا تھا، جس روز ممی کا شوہر مرا تھا۔ اس روز اس شخص کا بیٹا بھی تو مرا تھا۔ وہ جو اس کا باپ تھا، اس کی ماں کا شوہر تھا، وہ اس شخص کا بیٹا بھی تو تھا۔ دکھ کہتے کس کو ہیں، کیا وہ جانتی ہے؟ اس کمزور دو ناتواں بیمار انسان نے ایک نہیں اپنے دونوں بیٹے کھو دیے تھے، یکے بعد دیگرے محض چند دنوں کے وقفے سے۔

بجائے اس کے کہ بیٹے باپ کے جنازے کو کندھا دیتے اس بوڑھے باپ نے بیٹوں کے جنازوں کو کندھا دیا، انہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی میں اتارا، اپنے ہاتھوں سے ان کی قبروں پر مٹی ڈالی۔

''آغا جان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ آپ لوگ اگر کچھ دیر ٹھہر جاتے تو۔'' وہ آغا جان کا کوئی قریبی رشتے دار تھا جو ڈیڈی کی تدفین کے

فوراً بعد انہیں واپس لوٹتا دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

وہ لوگ گیٹ کے پاس کھڑے تھے، ممی، تجمل ماموں اور وہ گیٹ سے نکل رہے تھے۔ ولی بھی اس رشتے دار کے ساتھ کھڑا تھا۔ آغا جان قبرستان سے آتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے تھے، کوئی کہہ رہا تھا شاید ان کی طبیعت بھی خراب ہوگئی ہے مگر اسے اور ممی کو ان کے صدمے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

''اس گھر میں ٹھہر جاؤں؟ دعا کرتی ہوں۔ اللہ مجھے اس منحوس گھر اور یہاں رہنے والوں کی شکلیں زندگی میں پھر کبھی نہ دکھائے۔'' ممی، اس رشتے دار کو نفرت سے جواب دیتی تجمل ماموں اور اسے ساتھ لئے وہاں سے باہر نکل گئی تھیں۔

اپنی خود ساختہ نفرتوں سے نکل کر کبھی سوچا نہ تھا۔ آج سب یاد آ رہا تھا تو سوچ رہی تھی۔ آغا جان نے وہ پہاڑ سا غم سہارا کس طرح ہوگا؟ ان کا دل تو غم سے پھٹ رہا ہوگا۔ پہلے ایک بیٹا پھر دوسرا جو ملا بھی تئیس برسوں کی جدائی کے بعد تھا مگر وہ بہادر اور صبر و ہمت کا پیکر اپنے غموں سے سمجھوتہ کرتا اپنی بیماری اور دکھوں کو بھلا کر چند ہی دنوں میں بیوہ بہو اور پوتی کے پاس آ پہنچا تھا۔

''خواہش تو میری یہی تھی کہ تم لوگ میرے ساتھ رہتے لیکن بیٹا اگر تمہاری یہ مرضی نہیں تو ہم فارہ کا لاہور ہی میں داخلہ کروا دیتے ہیں۔''

اور پھر یہاں سے سلسلہ شروع ہوا تھا اور اس شخص کے بے بہا محبتوں اور یہاں سے بے حساب نفرتوں کا۔

وہ تو آج بھی جب اسے اپنی زندگی ختم ہوتی نظر آ رہی ہے تب بھی بہت ڈرتے ڈرتے جب اپنی محبت کا اسے یقین دلانا چاہ رہا تھا تو اپنی بیمار کا ہر ذکر دانستہ چھوڑ گیا تھا۔ اس پوتی کی ضد، اس کی ہٹ دھرمی، اس دل کے مریض کو موت کے منہ میں لے جا رہی ہے، وہ دو مہینے پہلے تیسری بار دل کے دورے کا شکار ہوا پوتی کے ناروا رویے اس کے مرض کی شدتوں کو مسلسل بڑھا رہے ہیں۔ اس نے تو اس سے یہ شکوہ، یہ گلہ تک نہ کیا۔

یہ اس کی سچی محبت ہی تو تھی جو پوتی کو ندامت میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو اس کی ماں کا صریح ظلم، اس کی زیادتیاں اور اس کی غلطیاں بھی اسے بہت ڈر ڈر کر بتا رہا تھا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ وہ اسے اس کی ماں کے خلاف کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ کہیں یہ سوچ کر ان سے بدگمان نہ ہو جائے۔

اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروا رہے ہیں، ان کے گھریلو اور دیگر تمام اخراجات اور اس کی تعلیم کا سارا خرچا اپنے ذمہ لے رہے ہیں تو وہ ان کا فرض ہے اور ان ماں بیٹی کا حق ہے۔ ہاں بدلے میں اس شخص کے کوئی حقوق نہیں، ان ماں بیٹی کے کوئی فرائض نہیں۔ محبت نہ کرتیں وہ دونوں اس کی احسان مند ہی ہو جاتیں۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد وہ اور ممی کس مالی بحران میں آ جاتے اگر آغا جان نہ ہوتے تو۔

اس کی میڈیکل کی مہنگی تعلیم تو ایک طرف رہی گھر کے اخراجات تک کے لئے چند ہی ماہ کے اندر اسے اور ممی کو کوئی ملازمت اختیار کرنا پڑتی۔ ذاتی گھر، گاڑی، تھوڑے بہت شیئرز جن کا Dividend آ جایا کرتا تھا، ممی کے زیورات اور بہت ہی قلیل بینک بیلنس پہ مشتمل تھا ان کا کل اثاثہ، ڈیڈی کے انتقال کے وقت۔

آج اگر وہ ڈاکٹر بہروز خان کہلائی جاتی ہے تو کس کے سبب، کس کے طفیل۔ حق، حق، حق۔ بہت سنا یہ لفظ اس نے ممی سے، تجمل ماموں

سے ،معیز سے فرض ،فرض ،فرض یہ لفظ کسی نے سکھایا نہیں تو اس نے سیکھنا چاہا بھی نہیں ،جس دادا کے پیسے پر وہ اور اس کا سارا کنبہ عیش کرتا رہا۔ وہ کبھی اس کی شکر گزار احسان مند بھی نہ ہوئی۔ اس بوڑھے شخص نے آخر ایسا کیا گناہ کیا تھا کہ فارہ بہروز خان کے دل میں اس کی محبت نہ آ سکی۔ ہمدردی اور احسان مندی بھی پیدا نہ ہو سکی۔

آخر وہ اس سے خفا کس بات پر تھی؟ اگر اپنے نکاح پر تھی تو وہ اس کے باپ نے کروایا تھا، وہ جا کر اپنے اس مرے ہوئے باپ سے لڑے۔

یا پھر وہ اس کی محبتوں سے بےزار ہے، اس کی چاہتوں اور الفتوں سے نالاں و تنگ ہے؟

''فارہ! یار! ممی سے ضد کر کے آجاؤ ناں زرینہ کی شادی میں، انہیں بھی ضد کر کے زبردستی ساتھ لے آؤ۔ ہم سب یہاں مل کر خوب مزے کریں گے۔''

''میں دن گن گن کر گزار رہا ہوں، کب میری بیٹی کی پڑھائی ختم ہو اور وہ اپنے آغا جان کے پاس ہمیشہ کے لئے آجائے۔

''جب تم میرے پاس آجاؤ گی ناں پھر تم اور میں ہم دونوں یہاں مل کر کوئی ایسی ترکیب سوچیں گے کہ روحی بھی یہاں ہمارے پاس ہی آ کر رہنے لگے۔''

''فارہ! عید پر تمہاری بہت یاد آئی بیٹا! ولی اور زرینہ میرے پاس تھے مگر تم نہیں تھیں ناں، اس لئے ہر خوشی ادھوری تھی مگر میں نے رمضان میں بڑی شدت سے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ اگلی عید اگر میرے نصیب میں ہے تو اس میں میرے تینوں جگر کے ٹکڑے میرے ساتھ ہوں۔''

''تمہاری دادی کے زیورات تو پرانے فیشن کے ہو گئے۔ اب ڈاکٹر صاحبہ تھوڑا ہی کوئی آؤٹ ڈیٹڈ چیزیں پہنیں گی۔ میں نے تمہارے لئے سب زیور بالکل نئے اور آج کل کے فیشن کے مطابق بنوائے ہیں۔''

''یعنی اب مجھے علاج کے لئے ادھر اُدھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر فارہ بہروز خان اپنے آغا جان کا خود علاج کریں گی اور وہ بھی بالکل مفت۔''

''کاش آج میرا بہروز زندہ ہوتا۔ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنا دیکھ کر خوشی سے اس کے پاؤں ہی نہ ٹکتے زمین پر۔ فارہ تم نے اپنے ڈیڈی کا خواب پورا کر دیا بیٹا۔'' سچے پیار اور والہانہ محبت سے مہکتے یہ جملے اس نے اپنے کانوں سے سنے تھے۔ خود احتسابی کی یہ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

رات کا یہ آخری پہر تھا، وہ گہری نیند سو رہے تھے اور وہ کئی گھنٹوں سے ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہی تھی۔ چار جنوری کی یہ ایک نہایت ہی سرد رات تھی۔ سی سی یو میں مکمل اور بھرپور ہیٹنگ ہونے کے سبب سردی کا کوئی اثر نہ تھا۔

وہ کرسی پر بغیر کسی کمبل کے صرف اپنی شال لپیٹ کر بیٹھی تھی اور ذرا سی بھی ٹھنڈک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مگر سی یو سے باہر کوئی ہیٹنگ نہ تھی۔ اسے ولی کا خیال آیا۔ وہ اس ٹھنڈ میں یخ بستہ کوریڈور میں کسی بینچ پر بیٹھا ہوگا، وہ آہستگی سے بغیر کوئی آواز پیدا کئے اٹھی اور پردہ ہٹا کر آغا جان کے کیبن سے باہر نکل آئی۔

وہ پورا کوریڈور طے کرتی ولی کی تلاش میں نظریں گھماتی رہی، یہ کوریڈور آگے دائیں اور بائیں میں مزید کوریڈورز میں جا کر کھلتا تھا۔

اس نے دائیں طرف دیکھا، وہاں دور دور تک سناٹا اور خاموشی کا راج تھا، بائیں طرف نظر ڈالی، جہاں وہ طویل کوریڈور ختم ہو رہا تھا، وہاں صرف ایک مدہم سا بلب روشن تھا اور بلب کی مدہم روشنی میں اسے ولی نظر آ گیا تھا۔ کوریڈور کے اختتام پر جہاں جا کر مزید کوئی کمرے نہیں تھے اور محض ایک دیوار تھی، وہاں وہ دیوار کے سامنے جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بالکل دبے قدموں چلتی اس کے پاس آ گئی۔ وہ سجدے میں تھا۔ اتنا طویل سجدہ۔ وہ تو اسے یہ کہنے آئی تھی کہ اب تم اندر چلے جاؤ، میں باہر بیٹھ جاتی ہوں، مگر وہ سجدے سے سر اٹھائے گا تو وہ اسے یہ بات کہے گی۔

وہ وہیں اس دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ولی سے چند انچ دور زمین پر بیٹھ گئی۔ سجدے میں جھکے اس کی پیٹھ ہلکے ہلکے ہل رہی تھی، اس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز سا رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

اس طویل سجدے میں وہ روتا اللہ سے اپنے دادا کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

بے تحاشا امیر کبیر دادا کے لیے، دولت، جائیداد کی خاطر اپنا کیریئر، مزید اعلیٰ تعلیم اور کامیابیاں چھوڑ آیا تو بہت احسان کیا۔ کسی غریب، بے آسرا و بے سہارا دادا کے لیے سب کچھ چھوڑ کر واپس آیا ہوتا تو بات بھی تھی۔ یہ سوچا کرتی تھی ناں وہ ولی صہیب خان کے بارے میں۔

خود اپنے گریبان میں کبھی جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ تو غریب کیا امیر دادا کے پاس بھی ایک ایگریمنٹ کر کے آئی تھی۔

جب وہ امیر دادا اس جیسی گستاخ، بدتمیز اور خود سر لڑکی پر مسلسل اپنا پیسہ لٹا رہا تھا تو ولی صہیب خان تو اس کا بہت فرمانبردار اور چاہتیں لٹانے والا پوتا تھا۔

وہ امریکہ شوق سے بیٹھا رہتا، اپنا کیریئر بناتا رہتا اور ساتھ ہی یہاں سے امیر دادا اسے اسی طرح پیسہ بھجواتا رہتا جیسے خود غرض اور بے حس فارہ بہروز خان کو بھجوایا کرتا تھا اور ولی صہیب خان، فارہ ہی کی طرح کوئی احسان تو نہیں میرا حق ہے کہہ کر اسے وصول کیے جاتا۔

کیا یہ ضروری تھا کہ صہیب خان کے بچے اس کی طرح فرمانبردار اور سعادت مند ہوں گے اور بہروز خان کی اولاد اس جیسی ضدی و سرکش؟ رشتہ ایک ہی تھا مگر بہت فرق تھا فارہ بہروز خان اور ولی صہیب خان و زرینہ عبادالرحمٰن میں دادا نے تینوں پوتے پوتیوں پر ایک ہی طرح چاہتیں نچھاور کی تھیں۔

تینوں کو ایک جتنا ہی چاہا تھا مگر وہ دونوں بھائی بہن اس کی طرح احسان فراموش و خود غرض نہ تھے۔

وہ دادا سے سچے دل سے محبت کرتے تھے، ایک پوتی انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی اور وہ دونوں اسے موت کے منہ سے نکالنے کی سعی کرتے دن رات ایک کر کے اس کی تیمارداری کر رہے تھے۔

اپنا گھر، شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں، شوہر، بچے، ان سب کے ساتھ زرینہ عبادالرحمٰن اپنے دادا کے پاس صبح، شام، دن رات رکی اس کی خدمت اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔

نوکروں کی ایک فوج کے ہوتے اس کا پرہیزی کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی، اسے دوا خود دیتی تھی، کسی کو دکھانے یا متاثر کرنے کے لیے نہیں، اپنی محبت، اپنا فرض اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر۔

جوفارہ بہروز خان سے صرف اس لئے نفرت کرتی تھی کہ وہ اس کے دادا کو دکھ پہنچا رہی تھی اور یہ ولی صہیب خان جس سے وہ نفرت کرتی ہے جسے وہ جائیداد کا لالچی سمجھتی ہے، وہ اسے اس لئے طلاق نہیں دیتا کیونکہ وہ جائیداد میں بٹوارا نہیں چاہتا۔

اسے اپنے داخلہ فارم پر دستخط کرتے آغا جان کے کانپتے ہاتھ بھول گئے وہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ ولرزش کے سبب دستخط کتنی مشکلوں سے کر پائے تھے۔ داخلہ فارم میں ان دستخطوں کی اتنی چھان پھٹک نہ ہوگی مگر بینکوں ودیگر مالیاتی اداروں میں تو ہر بار ہوگا۔

اگر اس کے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ ہولڈر خود نہیں بنے تھے، ولی کو بنایا تھا تو اس لئے کہ ان کے دستخط میں فرق آسکتا تھا اور لازماً آتا دیگر ہر جگہ بھی اس کے دستخط کو یقیناً کارآمد اس لئے بنوایا گیا تھا، قانونی حیثیت اسی لئے دلوائی گئی تھی کہ لکھتے اور دستخط کرتے ان کے ہاتھوں میں مسلسل لرزش وکپکپاہٹ رہا کرتی تھی۔

اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا یا یونہی اس نے سجدے سے سر اٹھایا تھا وہ اسی طرح زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنے پر سر رکھ کر بیٹھی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

فارہ نے دیکھا کہ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ دن بھر میں اس نے ایک بار بھی اسے حواس کھوتے نہ دیکھا تھا، اس کے چہرے پر ٹینشن وپریشانی کے آثار دو تین بار ضرور نظر آئے تھے مگر وہ سارا وقت خود کو اور اپنے ساتھ موجود دوسرے افراد کو سنبھالے رہا تھا۔

اور اس وقت اللہ کے حضور سجدے میں سر رکھ کر زاروقطار روتا وہ ایک بہت مختلف انسان نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے تمام آنسو صاف کیے اور آہستہ آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟'' ''کچھ نہیں۔'' نفی میں سر ہلاتی وہ وہیں بیٹھی رہی۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟ کچھ کھاؤ گی؟'' یہ سوال وہ اس سے رات بھی ایک بار پوچھ چکا تھا۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کے وہاں بیٹھنے پر کوئی اعتراض کیے بغیر وہ دوبارہ نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔ اسے عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ واپس اندر آغا جان کے پاس آگئی۔

زرمینہ اور عباد صبح سویرے آئے تھے۔ آغا جان کا ناشتہ ساتھ لے کر آغا جان جاگ چکے تھے، مگر ان کی طبیعت ابھی بھی سنبھلی نہ تھی۔

انہوں نے بس لبوں کی جنبش سے ان لوگوں کے سلام کے جواب دیا اور پھر خاموشی سے اپنی بیمار آنکھوں سے ان چاروں کو دیکھتے، آنکھیں دوبارہ بند کرلی تھیں۔

''آغا جان کو ناشتہ زرمینہ کرادے گی۔ تم لوگ اب گھر جاؤ۔'' سی سی یو سے باہر نکل کر عباد، ولی سے بولا تو وہ سر اثبات میں ہلاتے فوراً اس سے بولا۔

''چلو فارہ!'' ''لیکن ولی میں۔''

''آغا جان کو خدا حافظ کہہ آؤ۔ ہم اب دوپہر میں یہاں آئیں گے۔'' وہ اس کا جملہ کاٹ کر قطعیت سے بولا۔

رات اس نے اس کی بات مان کر اسے یہاں رکنے دیا تھا۔ اب اس پر یہ اخلاقی پابندی تھی کہ وہ اس کی بات مان کر یہاں سے چلی جائے۔ ولی اس سے پہلے اندر جا کر آغا جان کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔ وہ اب سیڑھیوں کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر آئی۔

زرمینہ، آغا جان کا بیڈ سرہانے کی جگہ سے تھوڑا سا اونچا کر کے اپنے ہاتھ میں گلاس پکڑے آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا دودھ انہیں پلا رہی تھی۔

زرمینہ ان کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ وہ خاموشی سے بائیں طرف آئی۔ آغا جان کے لبوں پر اسے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ بھری۔ اس نے جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور بہت مسکرا کر بشاش لہجے میں بولی۔

''میں ولی کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ دوپہر میں آؤں گی۔ اب تب تک آپ کو اپنی طبیعت بالکل ٹھیک کر لینا ہے، ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔'' انہوں نے سر اثبات میں ہلا کر آہستہ آواز میں اسے خدا حافظ کہا۔

راستہ پورا خاموشی سے کٹا تھا۔ راستے بھر ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی تھی اور اب وہ گھر کے سامنے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ولی گاڑی اندر لا رہا تھا اور وہ اس عمارت پر نظریں مرکوز کیے ہوئی تھی۔

یہ اس کے ڈیڈی کا گھر تھا۔ اسے اس گھر کے در و دیوار سے کبھی محبت کیوں نہیں ہوئی؟ کیا وہ ڈیڈی کی بیٹی نہیں؟ جس جگہ کو وہ اتنا والہانہ چاہتے تھے کہ مرنے سے پہلے ان کی آخری خواہش یہاں واپس آنا تھی۔ ایک بیٹی نے اپنے باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنے میں چھ سال لگا دیئے۔

اور چھ سال بعد آئی بھی تو کس طرح؟ کیا باپ کا حکم مانتے اس کی خواہش پوری کرنے کی نیت سے؟ خود اپنے وجود سے شرمسار و نادم وہ گاڑی سے اتری، ولی اس سے پہلے گاڑی سے اتر چکا تھا۔

اس وقت ان کے گیٹ پر کوئی گاڑی آ کر رکی تھی۔ وہ اس گاڑی اور اس سے اترنے والے پر دھیان دیئے بغیر اندر چلی گئی ہوتی اگر اس نے اپنا نام اور ایک جانی پہچانی آواز نہ سنی ہوتی۔

''مجھے فارہ سے ملنا ہے۔'' چوکیدار سے یہ جملہ بولنے والے کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس نے معیز کو گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اسے یہاں دیکھ کر سیدھا یہیں آ گیا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور اشتعال پھیلا ہوا تھا۔

''چلو گاڑی میں بیٹھو فوراً!'' ولی کو مکمل نظر انداز کرتا وہ اس سے حکمیہ لہجے میں انتہائی غصے سے بولا۔

''کہاں جانا ہے معیز؟'' وہ جواباً سکون سے بولی۔

''لاہور، ہم لاہور جا رہے ہیں۔ ابھی اور فوراً میں اور تم۔ ہم دونوں۔ کافی ہے اتنی وضاحت۔'' غصے کے ساتھ اس کے لہجے میں طنز بھی در آیا۔ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

یہ ولی کا گھر تھا، اس کی راجدھانی، یہ اس کی سلطنت تھی اور وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ! چاہتا تو پچھلے کئی حساب چکا تا معیز کو اپنے چوکیدار سے دھکے دلوا کر اور بہت بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال سکتا تھا، مگر وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اور کچھ بھی کہے بغیر بالکل لاتعلق سا پورچ سے چلا گیا۔

فارہ نے دور لکڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ گھر کے اندرونی حصے میں جا چکا تھا۔

''میں آپ کو فون پر بھی بتا چکی ہوں معیز! میں یہاں سے کہیں نہیں جا رہی۔ ابھی آغا جان بہت بیمار ہیں، میں ان کے پاس یہاں ہوں اور بعد میں بھی اب کبھی لاہور وہاں مستقل رہنے کے ارادے سے ہرگز نہیں آؤں گی۔ کبھی آپ سب سے ملنے آ جاؤں، وہ ایک الگ بات ہے۔'' ولی کے اندر چلے جانے کی آوازوں کو پوری طرح محسوس کرتے وہ معیز سے بہت پرسکون لہجے میں بولی۔

اس کے طنز اور غصے کا اثر قبول کیے بغیر۔

''فارہ! میں اپنے ہزاروں کام چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔ میرے پاس کسی بحث کا وقت نہیں ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت فوراً میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟'' وہ اس کے ضدی اور فیصلہ کن انداز پر جھنجلایا پہلے سے زیادہ غصے سے بولا۔

''نہیں۔'' اس کا ایک لفظی جواب قطعی نوعیت کا تھا۔ وہ جتنے غصے میں تھا حیرت انگیز طور پر وہ اتنی ہی پرسکون۔

''فارہ! تم مجھے ناراض کر رہی ہو۔ تمہاری یہ فضول ضد اور غلط حرکتیں ہمارے رشتے پر بہت برا اثر ڈالیں گی۔'' ان کے باہم رشتے کا حوالہ دیتا وہ کچھ نرم اور دھیما پڑا۔

''معیز! میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہی بلکہ مجھے لگتا ہے میں زندگی میں پہلی بار کچھ صحیح کر رہی ہوں۔'' یہ لفظ ادا کرتے اس نے اپنے اندر کل سے سر اٹھاتے احساسِ ندامت کو کچھ کم ہوتا پایا۔

معیز جو لمحہ بھر پہلے نرمی لیے انداز میں گویا ہوا تھا، اس کے اس جواب پر یک دم ہی پھٹ پڑا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ طیش اور غصے میں آ گیا۔

''وہ الو کا پٹھا دادا کی بیماریوں کی داستانیں سنا کر تمہیں یہاں لے آیا اور تم چلی آئیں، بغیر کچھ سوچے سمجھے، بنا کسی سے مشورہ کیے۔ ان لوگوں کے ساتھ تمہارا خلع اور جائیداد میں اپنے حصے کا معاملہ کورٹ تک چلا گیا ہے، یہ سوچے بغیر اور اب جب تمہیں سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو بجائے بات کو سمجھنے کے اپنی بے وقوفی پر ہٹ دھرمی سے جمی ہو۔ پہلے پھوپھو کو اپنی ضدی حرکتوں سے ناراض کر کے کینیڈا جانے پر مجبور کر دیا اور اب بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے مزید حماقتیں کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔''

یہ اس کے غصے کی انتہا ہی تھی جو وہ اپنے جملوں میں ایک گالی کو بھی شامل کر گیا تھا ورنہ معیز جیسا کلچرڈ اور ریفائنڈ انسان کبھی گفتگو میں گھٹیا الفاظ کو شامل نہیں ہونے دیتا تھا۔

''میں نے صرف آپ کا پروپوزل قبول کیا تھا، ابھی ہمارا ایسا کوئی رشتہ نہیں جس کی بنیاد پر حق جتا کر آپ مجھے کچھ بھی کہہ سکیں۔ یہ میری ضد ہے، ہٹ دھرمی ہے، حماقت ہے یا بے وقوفی۔ میں کچھ غلط ہو جانے پر مدد مانگنے آپ کے پاس نہیں آؤں گی، آپ بے فکر رہیں۔

میں اپنی زندگی اور اپنے فیصلوں کی خود مالک اور خود ذمہ دار ہوں۔'' وہ اپنا پرسکون اور دھیما انداز ترک کر کے یک لخت ہی غصے میں آ گئی۔

وہ غصے کی تیز تھی، اسے جلدی غصہ آ جایا کرتا تھا مگر معیز کے ساتھ اس نے اس طرح پہلی بار بات کی تھی۔ اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ چند سیکنڈ بالکل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''تو تم میرے ساتھ نہیں چل رہیں، یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' اس بار غصے سے نہیں اس نے سنجیدگی کے ساتھ کسی قدر دوٹوک انداز میں پوچھا۔

''میں آپ کے ساتھ نہیں چل رہی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''ٹھیک ہے اچھی بات ہے۔'' آخری الفاظ سکون سے کہتا وہ یک دم ہی واپس گھوما وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑے رہ کر اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ گیٹ سے نکل گیا، ایک سیکنڈ بعد اس نے باہر ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ گھر کے اندرونی رہائشی حصے کی طرف بڑھی۔

اندر آ کر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ لاؤنج پورا خالی تھا ملازمین کی آوازیں بھی کچن یا کسی دوسرے کونے سے تو آرہی تھیں مگر یہاں کوئی نہیں تھا اور ولی کا تو یہاں نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ یہاں لاؤنج میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے معیز کو کچھ کہہ کر غالباً چوکیدار اور آس پاس دیکھتے دوسرے ملازمین کے سامنے کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا چاہا مگر وہ اسے تو ضرور تنبیہ کرے گا کہ آئندہ اس کا کوئی رشتہ دار خاص کر معیز تجمل یہاں ہرگز نہ آئے۔

وہ ولی سے بے شمار بار بدتمیزی کر چکی تھی، بہت بار اس کی سیدھی باتوں کے بھی الٹے جواب دے چکی تھی مگر آج وہ سوچے ہوئے تھی کہ بہت تہذیب اور شائستگی کے ساتھ وہ اسے معیز سے ہوئی ساری بات بتا دے گی۔

اس ساری بات سے وہ خود ہی سمجھ لے گا کہ اپنے کسی بھی رشتہ دار کی یہاں آمد میں فارہ کی کتنے فیصد مرضی شامل ہوتی ہے۔

اسے گل خان ایک کمرے سے نکلتا نظر آیا۔

یہ آغا جان کے بالکل برابر والا کمرہ تھا، یہ کمرہ ولی صہیب خان کا ہے وہ جانتی تھی۔

''ولی کیا اپنے کمرے میں ہے؟'' اس کے سوال کا گل جان نے اثبات میں جواب دیا تھا، تو وہ اس سے کچھ بھی کہے یا پوچھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''ولی پوچھے تو بتا دینا، میں اپنے پورشن میں ہوں۔'' ایک سیکنڈ کے توقف کے بعد اس نے گل خان سے کہا اور پھر آغا جان کے کمرے میں آ کر وہی دوسرے کونے والا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اس حصے تک جانے کا یقیناً کوئی دوسرا باہر سے بھی راستہ ہوگا مگر فی الحال کوئی نئے راستے ڈھونڈنے اور سمجھنے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سفید گیٹ کی کنڈی کھول کر وہ اندر آ گئی اور پھر لان عبور کر کے لاؤنج سے گزرتی اپنے کمرے تک جانا چاہتی تھی مگر قالین پر صوفے کے بالکل پاس اسے ایک کاغذ گرا نظر آیا۔

وہ آگے آئی اور وہ نیچے گرا کاغذ اٹھا لیا۔ اس کاغذ کی پلاسٹک کوٹنگ ہوئی ہوئی تھی اور اس کو تہہ کر کے اتنا چھوٹا بنا لیا گیا تھا جیسے ماچس کی ڈبیہ۔ تہہ کھولتے کھولتے اسے اچانک ہی یاد آ گیا کہ یہ کاغذ آغا جان کی جیب سے گرا تھا۔ اس وقت جب وہ ان کی جیب سے دوا نکال رہی تھی تو ساتھ کوئی کاغذ بھی گرا تھا۔

سوفٹ پلاسٹک کوٹنگ ہوئے اس کاغذ کی سب تہیں کھل چکی تھیں اور اب وہ کھلا ہوا پورا کا پورا اس کے سامنے تھا۔ اس سفید کاغذ کو دیکھ کر اگر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ اس کے باپ کی آخری تحریر تھی۔

ان کا استعفیٰ۔ باقی سب لفظ ٹائپ شدہ تھے مگر وہ دستخط تو ان کی اپنی لکھائی تھی۔ بے ساختہ اس نے ان حروف پر، اس دستخط پر اپنے لب رکھ دیئے، اسے والہانہ چوم لیا۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا ڈیڈی کے انتقال پر ان کی میت ساتھ لے جانے آئے آغا جان اپنے ساتھ چپکے سے یہ غیر اہم سا کاغذ اٹھا لائے تھے۔

اس نے ڈیڈی کی میز پر تب وہ استعفیٰ رکھا دیکھا تھا مگر پھر اتنے بڑے غم اور ناقابل تلافی نقصان نے اسے اس کاغذ پر کبھی دھیان دلایا ہی نہیں تھا۔

اس نے وہ کاغذ اسی طرح واپس تہ کیا اور اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں سے واپس جاتے وہ اسے حفاظت سے آغا جان کے کمرے میں رکھ دے گی، یہ سوچتے ہوئے منہ ہاتھ دھو کر ابھی وہ بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔

آنے والی لڑکی ریشم نام کی وہ دوسری ملازمہ تھی جو صدو کے ساتھ ہمہ وقت کچن میں مصروف نظر آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی اشیاء سے بھری ایک ٹرے تھی۔ اس ٹرے میں موجود ڈشز صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا مجموعہ تھیں۔ وہ اپنے لئے کھانے، ناشتے چائے، پانی کسی چیز کا کہہ کر نہیں آئی تھی تو اگر یہ سب کچھ اس کے پاس لایا گیا تھا تو اسے لانے کا گھر کے کسی فرد ہی نے حکم دیا تھا اور وہ فرد کون تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اس نے اسے ناشتے یا لنچ کے لئے بلوایا نہیں تھا بلکہ جہاں پر وہ تھی وہیں اس کا کھانا بھجوا دیا تھا۔ وہ اگر اسے ڈائننگ روم میں بلواتا وہ وہاں بھی بخوشی چلی جاتی مگر جب یہاں آغا جان موجود نہیں تھے جن کے سامنے سب اچھا ہے اور سب ٹھیک ہے کا تاثر دینا ہوتا تھا تو ضرورت کیا تھی ان دو لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی جو ایک دوسرے کے ساتھ ہر رشتہ ختم کر دینے کا عہد کر چکے تھے۔

اس نے خاموشی سے ملازمہ کے ہاتھ سے ٹرے لی اور بیڈ پر سکون سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

وہ آغا جان کے سامنے اپنا مرجھایا، زرد بہت زیادہ رویا اور بالکل کملایا ہوا چہرہ لے کر نہیں بلکہ بالکل فریش خوش باش اور ہنستا مسکراتا صحت مند چہرہ لے کر جانا چاہتی تھی۔ خود کو پوری طرح کھانے کی طرف راغب کر کے اس نے پوری دلجمعی سے سب کچھ کھایا۔

تھرماس میں بھری چائے کے بھی دو کپ پی ڈالے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اب وہ موبائل اٹھا کر اپنی ممی کا موبائل نمبر ملا رہی تھی۔

''السلام علیکم ممی! کیسی ہیں آپ؟'' جب لاہور اپنے گھر اکیلی رہ رہی تھی تب وہ اس کی کالز ریسیو نہ کرتی تھیں مگر اب جب کہ وہ ان کے دشمن کے پاس جا پہنچی تھی تب انہوں نے کال ریسیو کر ہی لی تھی۔

''کیوں فون کیا ہے تم نے مجھے؟'' ان کا لہجہ بے حد تلخ اور انداز دل دکھانے کی حد تک اجنبیت لئے ہوئے تھا۔

''ممی! آغا جان کو ہارٹ''

''تمہارے آغا جان کو جو کچھ بھی ہوا ہے، تم ان کی لاڈلی چہیتی پوتی ان کی خدمت کے لئے پہنچ تو چکی ہو ان کے پاس۔ خوب دل لگا کر ان کی خدمت کرو اور اگر اب تک انہوں نے اپنے پوتے کے ساتھ تمہاری رخصتی نہیں کروائی تو ان کی عنقریب آئندہ بیس سالوں بعد ہونے والی موت کا

سوچ کر فی الفور کروالو۔'' ان کے لفظوں میں زہر تھا، کڑواہٹ تھی۔

اس کی نوک زبان پر کئی تلخ جواب آتے آتے رہ گئے مگر وہ لب بھینچ کر خاموش رہی کہ ماں کو جواب دینا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ وہ تو انہیں وہ تمام جھوٹ بھی نہ جتا سکی جو انہوں نے اس سے ہمیشہ بولے تھے اور جو غلط بیانیاں ہمیشہ اس سے کی تھیں۔ وہ سب کچھ جان چکی ہے وہ انہیں جتا نہ پائی۔

اپنے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈلوانے یا فارہ کے ساتھ جوائنٹ ہولڈر بننے سے آغا جان کو سخت اور دوٹوک انکار کر دینے کے بعد انہوں نے اسے ہمیشہ یہی تاثر دیا تھا کہ یہ آغا جان ہی نے کیا ہے، بہو کی حیثیت زیرو کر کے صرف پوتی کو فوقیت دی ہے، آغا جان کو اس سے ملنے کے لئے آنے سے کئی شرائط عائد کر کے روک دینے کے بعد انہوں نے ہمیشہ الزام ان پر ہی دھرا تھا کہ خالی بے تحاشا پیسہ پھینک کر سمجھتے ہیں کہ پوتی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

''آج کے بعد مجھے کبھی فون مت کرنا۔ میں زندگی بھر نہ تمہاری شکل دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ آواز سننا چاہتی ہوں، تمہیں جہاں جانا تھا تم وہاں جا چکیں۔ میں تمہارے لئے اور تم میرے لئے مر چکیں۔ اس وقت جو فون پر مجھ سے بات کر رہی ہے وہ میری بیٹی نہیں محمد بختیار خان کی پوتی ہے۔ تم میرے لئے مر چکی ہو فارہ!'' نفرت بھرے لہجے میں اپنے جملے مکمل کر کے انہوں نے فوراً رابطہ ختم کر دیا۔

''ایسے ہی کہہ دینے سے کوئی کسی کے لئے نہیں مر جاتا ممی!'' خاموش موبائل ہاتھ میں لئے وہ آنسو پیتی آہستہ سے بولی۔

جب وہ آغا جان کی محبتوں سے انکاری ہوتی تھی تب انہیں کیسا لگتا ہوگا، وہ کتنے ہرٹ ہوتے ہوں گے۔ انہیں کتنی تکلیف، کتنا دکھ پہنچتا ہوگا۔

اگر آغا جان نے اپنے بیٹے کو ایک انجان اور غیر لڑکی کے لئے اپنے مقابل کھڑا ہوتا پا کر اسے گھر سے نکال دیا تھا تو آپ انہیں ظالم جابر اور سخت دل کیوں قرار دیتی ہیں۔

میں تو پھر اپنے دادا کے پاس آئی ہوں، وہ دادا جو برسوں سے مجھ پر محبتیں نچھاور کر رہا ہے، محبت کے ساتھ ساتھ جس کے مجھ پر بے شمار، بے حساب احسانات بھی ہیں، ڈیڈی تو باپ کی ستائیس برس کی محبت اور شفقت بھرے ساتھ پر چھبیس یا ستائیس ماہ سے بھی کم کے ایک لڑکی کے ساتھ کو فوقیت دے گئے تھے۔

اگر آپ اپنی بیٹی سے اپنی غلط اور ناجائز بات پر بھی فرمانبرداری اور سعادت مندی کی توقع رکھتی ہیں تو آغا جان بھی تو بیٹے سے آپ ہی جیسی اپنی توقعات رکھ سکتے تھے اور ان کے نہ پورا ہونے پر آپ ہی کی طرح اس سے قطع تعلقی کا اعلان کر سکتے تھے۔

وہ اس کی بات سنے بغیر کب کا رابطہ منقطع کر چکی تھیں اور وہ ہنوز اسی طرح فون کان سے لگائے بیٹھی تھی۔

ریشم کھانے کی ٹرے واپس لینے آئی تو اس نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ اس کا سامان یہاں رکھوا لے۔ ڈیڈی کا جو کمرہ اسے یہاں استعمال کے لئے ملا تھا، وہاں سے اس کے دو بیگز اور ایک سوٹ کیس پر مشتمل سامان جو ابھی تک جوں کا توں بیگز اور سوٹ کیس ہی میں تھا وہ اس نے ریشم کے ساتھ مل کر اپنے اس بیڈروم کی وارڈ روب میں بالکل صحیح سے سیٹ کر لیا۔

رات میں وہ شاید یہاں اکیلے نہ سو سکے کہ یہ حصہ باقی گھر سے ذرا ہٹ کر ہے مگر اب سے دن میں وہ اس جگہ کو استعمال کرے گی اور اس کا سارا سامان بھی رہے گا۔ نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکل کر آغا جان کے کمرے اور وہاں سے لاؤنج میں آ گئی۔

بلیو جینز اور وائٹ کاٹن کی شرٹ پہنے ولی وہاں بیٹھا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی جیکٹ بھی صوفے پر پاس ہی پڑی ہوئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر چکا تھا اور اس کے بیٹھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جانے کے لئے بالکل تیار ہے۔

پتہ نہیں وہ کس سے بات کر رہا تھا اور اسے یہاں بیٹھنا چاہئے تھا یا نہیں یہی سوچ وہ لاؤنج سے نکل کر باہر گارڈن میں آ گئی۔

''چلو'' ۔ وہ دس منٹ بعد باہر آیا اور اسے آنے کا کہتے سیدھا پورچ کی طرف چلا گیا۔

تمام راستہ اس نے اس انتظار میں گزارا کہ وہ معیز کی آمد پر کچھ کہے گا۔ کوئی تنبیہہ، کوئی غصہ، کوئی حکم، کوئی سرزنش مگر وہاں تو بس اک گہری خاموشی اور سنجیدگی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

عباد کی ممی عائشہ آنٹی، آغا جان کی عیادت کے لئے آئی تھیں اور ان کے بعد بھی آغا جان کے کئی رشتے دار، دوست، میل ملاقاتی ان کی عیادت کے لئے آتے رہے تھے۔ مغرب کے وقت اسے آغا جان کے پاس فرصت سے ایسے بیٹھنے کا موقع مل سکا جب ان دونوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

ولی اور عباد نماز کے لئے گئے ہوئے تھے اور زرینہ آغا جان کے ابھی کچھ دیر قبل ہوئے ای سی جی اور خون کے کچھ ٹیسٹوں کی رپورٹس یہیں کے کسی سینئر کارڈیالوجسٹ سے ڈسکس کرنے گئی ہوئی تھی۔

وزیٹنگ آورز ختم ہوئے تھے تو ملنے جلنے اور آنے جانے والوں کا رش ختم ہوا تھا۔

''جوس پئیں گے آغا جان!'' اس نے ان سے پوچھا۔ انہیں بہت ہلکی غذا دی جا رہی تھی اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ پیٹ بھر کر کھانے یا پینے سے دل کا کام بڑھ جاتا تھا اور پھر ان کی طبیعت میں بے چینی اور خرابی پیدا ہونے لگتی تھی اسی لئے انہیں دن میں وقفے وقفے سے کئی بار تھوڑی تھوڑی سی ہلکی خوراک دی جا رہی تھی۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ گلاس میں جوس نکال کر ان کے پاس آ گئی۔ ان کا سرہانا اونچا کر کے وہ انہیں آہستہ آہستہ جوس پلا رہی تھی، ان میں فی الحال اٹھ کر بیٹھنے یا گلاس اپنے ہاتھ میں پکڑ لینے کی قوت بالکل نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ سے جوس لیتے وہ اسے مسلسل دیکھ بھی رہے تھے۔ کل کے مقابلے میں آج ان کی طبیعت بہتر کہی جا سکتی تھی۔

وہ کل پورا دن، کل پوری رات کن کیفیات سے گزری ہے وہ انہیں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی مگر ایک بات تھی وہ جو ان سے کہنا چاہتی تھی، جو کہنے کے لئے وہ کل سے بے قرار تھی۔

''کل آپ نے اتنا کچھ کہا اور میرا جواب سننے سے پہلے طبیعت خراب کر لی۔'' چند گھونٹ جوس پینے کے بعد انہوں نے گردن سے بس کا اشارہ کیا تو وہ گلاس سائیڈ میں رکھ کر نیپکن سے ان کے لبوں اور داڑھی پر گرے جوس کے چند قطرے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''میں بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں آغا جان! بس یہ ہوتا ہے ناں کہ کوئی محبت ہمیں بہت وافر مل رہی ہوتی ہے، ہم یہ سوچ کر کہ یہ تو

ہمیں ہمیشہ سے مل رہی ہے اور ہمیشہ ہی ملتی بھی رہے گی، ان سے کچھ بے نیاز سے ہو جاتے ہیں، اسے اپنا حق جو سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

اسے For Granted جو لے رہے ہوتے ہیں لیکن کل جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی آپ کو کھو دینے کا خوف میرے اندر پیدا ہوا، یہ احساس جاگا کہ یہ محبت مجھ سے چھن بھی سکتی ہے تو مجھے پتہ چلا میں آپ سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں۔ میں آپ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی آغا جان!

آپ کو میرے لئے ٹھیک ہونا ہے، آپ کو میرے لئے زندہ رہنا ہے آغا جان! کیا یہ صرف ولی اور زرمینہ کا حق ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہیں؟ میں آپ کے ساتھ، آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں آغا جان! میں اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں زندگی بھر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ آپ نے میرے اور ممی کے لئے جو پورشن بنوایا ہے ناں آغا جان! میں بھی اب اس میں رہوں گی اور ممی کو بھی ایک نہ ایک دن ضرور وہاں لے آؤں گی۔

یہ میرا آپ سے وعدہ ہے آغا جان!'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک کر ان کے رخسار پر گرے تھے۔

وہ دل کے مریض ہیں اور اسے انہیں ٹینشن نہیں دینی چاہئے، اسے ان کے سامنے رونا نہیں چاہئے۔ وہ یہ جانتی تھی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کوئی دوا اور کوئی علاج انہیں اتنی جلدی ٹھیک نہیں کر سکتا جتنا اس کا محبت کا یہ اظہار۔

وہ بستر پر سخت بیمار پڑے اس انسان سے جو اس کا دادا ہے' والہانہ پیار کرتی ہے' بے تحاشا محبت کرتی ہے اور یہ بالکل سچ تھا

یہ فارہ بہروز خان کی زندگی کا سب سے بڑا سچ تھا کہ وہ محمد بختیار خان سے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ پتہ نہیں کب سے۔

✿✿✿

''زرمینہ! اس میں تھوڑا سا سوپ اور ڈال کر دے دو۔'' وہ آغا جان کو سوپ پلا رہی تھی۔ اس نے پیالے میں تھوڑا سا سوپ ڈالا تھا کہ اگر انہیں اچھا لگا اور مزید پینے کی رغبت پیدا ہوئی تو اور ڈال لائے گی۔ زرمینہ باتھ روم سے وضو کر کے نکلی تھی، کہنیوں سے اوپر چڑھی آستینیں نیچے کرتے اس نے حیرت اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔

اس کا حیرت سے دیکھنا اپنی جگہ درست تھا' وہ اس سے اتنے معمول کے نارمل سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی جیسے روزمرہ کی یہ بات چیت اُن کے درمیان رہا ہی کرتی تھی۔

مگر پھر فوراً ہی اپنے چہرے سے حیرت بھرے تاثرات ہٹاتی وہ نارمل سے انداز میں چلتی آغا جان کے بیڈ کے پاس آئی اور فارہ کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ لے لیا۔

آغا جان کے پاس اس وقت وہ دونوں تھیں اور یہ ان دونوں کے درمیان پہلی باضابطہ بات تھی جو فارہ نے کی تھی وگرنہ اس سے قبل صبح سے وہ دونوں سارا وقت آغا جان کے ساتھ ہونے کے باوجود آپس میں ایک لفظ نہ بولی تھیں۔

وہ کل رات بھی پرسوں ہی کی طرح آغا جان کے پاس اسپتال میں رکنا چاہتی تھی مگر انہوں نے اسے اور زرمینہ دونوں کو گھر جانے کا حکم دیتے صرف ولی کو اپنے پاس رکنے دیا تھا۔ صبح دس بجے وہ آئی تھیں تو آغا جان نے ولی کو گھر بھیج دیا تھا۔

دوپہر بارہ بجے آغا جان کے کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر محمد نثار علی خان ان کا معائنہ کرنے آئے تو ان کی طبیعت میں بہتری پا کر انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا تھا۔

زرینہ ولی کو موبائل پر فوراً یہ بتا کر جلدی جلدی پرائیویٹ روم میں شفٹ ہونے کے لئے آغا جان کا سارا سامان سمیٹنے لگی تھی۔ اس سمیٹا سمائی میں پوری دل جمعی سے فارہ نے زرینہ کی مدد کروائی تھی بغیر آپس میں کوئی بات کئے اور پھر آغا جان کو اسپتال کے عملے کی مدد سے وہ پرائیویٹ روم میں لے آئی تھیں۔

ولی دوپہر دو بجے ان دونوں کا کھانا ساتھ لے کر آیا تھا۔ آغا جان کے بیڈ کے پاس سامنے وہی کھڑی تھی اس لئے اس نے وہ بڑا سا پلاسٹک بیگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”کھانا ہے تم دونوں کا۔“ اسے وہ ساز و سامان پکڑا کر وہ فوراً ہی آغا جان کی طرف جھکا۔ ان کے بیڈ کے کنارے پر ٹک کر نجانے وہ سرگوشیوں میں ان سے کیا راز و نیاز کرنے لگا تھا۔

زرینہ ابھی نماز پڑھ کر فارغ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے آغا جان کی صحت یابی کے لئے نجانے کون کون سے وظائف شروع کر رکھے تھے اس لئے اس کی ہر نماز بے حد طویل ہوتی تھی۔

کسی ٹرے کی عدم دستیابی کے سبب اس نے صوفے پر ایک اخبار بچھایا اور سارے ڈبے اور ہاٹ پاٹ وغیرہ کھول کھول کر اس پر رکھ لئے پلیٹیں، چمچے گلاس اور پانی کی بوتل بھی ساتھ سجالی۔

”آجاؤ زرینہ! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

اس لڑکی نے پرسوں سفاک لہجے میں اسے کیا کہا تھا۔ اپنی بہت جلدی غصے میں آنے اور بھڑک جانے والی عادت کے برخلاف وہ سب بھلائے بہت نارمل اور دوستانہ سے انداز میں اس سے بولی۔

جائے نماز تہہ کرتی زرینہ نے ایک پل کو تعجب سے اسے دیکھا پھر سر اثبات میں ہلاتی صوفے پر آگئی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں اور ولی کی باتیں سنتے آغا جان بڑی محویت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ انہیں یہ منظر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ان کے تینوں پوتی پوتا ان کے پاس ہیں اور آپس میں بہت خوشگوار دوستانہ ماحول بھی استوار کر چکے ہیں۔

آغا جان کی یہ کیفیت جب وہ سمجھ سکتی تھی جو ہمیشہ ان سے بہت دور رہی تھی تو ولی اور زرینہ جو پل کر بڑے ہی ان کے پاس ہوئے تھے کیونکہ نہ سمجھ پاتے۔ غالباً یہی وجہ تھی جو زرینہ چند لقمے لینے کے بجائے اطمینان سے کھانا کھانے لگی تھی۔

”یہ فرائڈ رائس باقی کے تم لے لو۔ میں صرف یہ چکن جلفریزی اور لوں گی۔“

وہ دونوں جیسے بچپن کی بچھڑی سکھیاں تھیں جنہیں ایک دوسرے کی پسند ناپسند سب از بر تھی، کم از کم اس کے بولنے کا انداز تو ایسا ہی تھا۔

جبکہ سچ تو یہ تھا کہ ابھی ابھی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اسے یہ پتہ چلا تھا کہ زرینہ چاولوں کو روٹی یا کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتی ہے۔ وہ باقی سب ڈشز کو چھوڑ کر صرف چاولوں پر تھوڑی سی جلفریزی اور سلاد ڈال کر کھانے میں مگن تھی۔

ولی نے گردن گھما کر بس ایک ہی بار ان دونوں کو کھانا کھاتے دیکھا تھا اس کے بعد وہ پھر آغا جان کے ساتھ کا نا پھوسی میں مصروف ہو گیا تھا۔

پیٹ بھر کر کھانا کھا لینے کے سبب کھانے کے بعد کچھ وقت ان دونوں کا اونگھتے گزرا تھا۔ عصر کے وقت عباد کی آمد ہوئی تھی اور پھر اس کے کچھ دیر بعد وزیٹنگ آورز شروع ہو جانے کے سبب رشتے داروں اور دوست احباب کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ہر رشتے دار کو بیماری کی پوری تفصیل جاننا تھی اور وہ بھی آغا جان کی زبانی۔ مشرقی رکھ رکھاؤ وضع داری اور آپس میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آنے والی ہماری تمام روایات جتنی بھی اچھی ہوں کم از کم عیادت اور تعزیت کا ہمارا طریقہ کار انتہائی نامناسب' تکلیف دہ بلکہ غیر اخلاقی ہوتا ہے۔

یہ بلا مبالغہ آغا جان کی ساتویں یا آٹھویں رشتہ دار خاتون تھیں جنہیں وہ پرسوں صبح اپنے نہانے سے لے کر اسپتال پہنچنے تک کی ساری روداد مفصل سنا رہے تھے۔

یہ خاتون باقی تمام رشتے داروں سے بھی بڑھ کر ثابت ہو رہی تھیں۔ باقی سب نے تو صرف پرسوں آغا جان کی طبیعت خراب ہونے کا تمام احوال سن کر جان بخشی کر دی تھی' یہاں تو اور بہت طویل گفتگو اور عوامی مشوروں کا بھی سامنا تھا۔

''آپ صبح صبح نہائے ہی تو غلط۔''

پھر دواؤں سے متعلق سنے سنائے مشورے' مشہور مشہور کارڈیالوجسٹ کے نام ایسے روانی سے لئے جا رہے تھے گویا وہ بچپن میں ان کے ساتھ کھیلتی آئی ہوں۔ ڈاکٹر نثار کی پروفیشنل مہارت پر شک' کارڈیالوجسٹ بدلنے کا مشورہ جو دوائیں دی جا رہی تھیں ان پر اعتراض۔

''خون پتلا کرنے والی یہ دوا تو بالکل غلط دی جا رہی ہے اور بلڈ پریشر کے لئے یہ دوا؟ اس کے سائیڈ افیکٹس اتنے خطرناک ہیں۔''

وہ اپنے چھ یا سات دوستوں اور رشتے داروں کی بیماریوں اور اموات کے قصے مفصل سناتی یقیناً آغا جان کو کوئی خوشی تو ہرگز نہیں پہنچا رہی تھیں۔ ''ان سب میں سے کوئی کچھ کہہ کیوں نہیں رہا۔'' وہ بڑی طرح جھنجلائی۔

ولی بے حد ناپسندیدگی و ناگواری سے انہیں دیکھ ضرور رہا تھا مگر غالباً براہ راست کچھ کہتے یا ٹوکتے میں رواداری آڑے آ رہی تھی۔ عباد تو تھا ہی بامروت انسان لیکن اسے زرینہ جیسی منہ پھٹ اور صاف گو لڑکی سے اس بزدلی کی ہرگز توقع نہ تھی۔

زرینہ چہرے پر جھنجلاہٹ اور ناراضی لئے ان خاتون کو دیکھ ہی تھی مگر تھی بالکل خاموش۔

''اچھا بابا میں ہاتھ میں رات سے درد تھا۔ او ہو یہی غلطی کی ناں آپ نے اگر آپ رات ہی۔'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ یک دم ہی صوفے پر سے اٹھ کر آغا جان کے بیڈ کے پاس آ گئی۔

''آغا جان! اب آپ کی دوا اور سونے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ باقی باتیں پھر کبھی کر لیجئے گا۔'' وہ بظاہر نرم و شیریں لہجے میں بولی۔

''ارے ہاں دیکھو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا بیٹھے بیٹھے اتنی دیر ہو گئی۔'' وہ خاتون ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر فوراً کھڑی ہو گئیں۔

اور پھر آغا جان کو خدا حافظ کہتی دو تین منٹ کے اندر ہی چلی گئیں۔ آغا جان نے متفکر نگاہوں سے اپنی ان رشتہ دار خاتون اور پھر بدتمیز ومنہ پھٹ پوتی کو دیکھا۔ وہ آغا جان کی نگاہوں کا نوٹس لئے بغیر سکون سے واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

ولی نے اپنے چہرے کو ہر طرح کے تاثرات عاری کر رکھا تھا۔ وہ خوش ہوا ہے یا ناخوش وہ جان نہیں سکتی تھی۔ زرینہ حیرت سے گنگ اسے دیکھ رہی تھی شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی سی صفات کسی اور میں بھی پائی جا سکتی تھیں جب کہ عباد چہرے پر محظوظ سی مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں سمجھتا تھا یہ خوبیاں صرف میری بیگم میں پائی جاتی ہیں۔''

''آغا جان کہتے ہیں یہ ہماری خاندانی اور موروثی خوبیاں ہیں۔ ان میں نہ ہمارا کمال ہے نہ قصور۔'' عباد کی شوخی کا اس نے بے ساختہ اور برجستہ جواب دیا تھا۔

اس جواب پر عباد کے ساتھ آغا جان بھی بے اختیار کھل کر ہنس پڑے تھے جب کہ زرینہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

وہ اپنے میاں، بھائی اور دادا سب سے اپنے لئے منہ پھٹ اور بدلحاظ اور بدتمیز کے القاب سنا کرتی تھی مگر ان صفات پر اس نے یوں گردن اکڑا کر فخر کا اظہار کبھی نہ کیا تھا جیسے فارہ کر رہی تھی۔

✿✿✿

آغا جان کو ساتویں دن اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ کل دوپہر وہ ہاسپٹل سے گھر آئے تھے اور پھر ان کی عیادت کے لئے آنے والوں کا جو تانتا بندھا تھا تو ان سب میں سے کسی کو بھی رات گئے تک ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں ملا تھا۔

صبح وہ اپنے معمول کے وقت پر بیدار ہو گئی تھی۔ آغا جان کو جاگے دیکھا تو وہ ان کے لئے ناشتہ بنانے کچن میں آ گئی۔ وہ دلیہ چن کر چولہے پر چڑھا کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ زرینہ کچن میں آ گئی۔

''آؤ زرینہ چائے پیو گی؟'' اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور وہ خوش اخلاقی سے اسے بھی چائے آفر کر رہی تھی۔

''نہیں، میرا کافی کا موڈ ہے۔ ناشتے میں ساتھ کافی لوں گی۔'' وہ فارہ کو جواب دیتی اس کے پاس ہی آ گئی۔

''دلیہ چڑھایا ہے میں نے آغا جان کے لئے۔ جب تک ولی ان کا منہ ہاتھ دھلوا کر لباس تبدیل کروائے گا، یہ تیار ہو جائے گا۔'' زرینہ کو کنگ رینج کی طرف دیکھتا پا کر اس نے بتایا۔

سر اثبات میں ہلاتے وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی مسلسل خود پر مرکوز نگاہوں سے حیران ہوتے اس نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''فارہ! میں نے اس روز تمہارے ساتھ بہت مس بی ہیو کیا تھا۔ میں تم سے اس دن کی تمام باتوں کے لئے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔''

''معذرت؟ لیکن مجھے تو تمہاری کوئی بات بری ہی نہیں لگی۔ ہم غصہ اسی کو دکھاتے ہیں جس پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر رسانیت سے بولی۔

"وہ غصہ نہیں بدتمیزی اور بہت دل دکھانے والی باتیں تھیں، فارہ! یقین کرو مجھے اپنی باتوں پر تب ہی بہت افسوس ہوا تھا۔ عباد سے بھی مجھے اس رات گھر آ کر بہت ڈانٹ پڑی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "تم نے اس کی حالت دیکھی نہیں تھی' وہ کتنی پریشان تھی اور پھر تم نے اس سے وہ سب بکواس کی تھی' یقین کرو بقول تمہارے ہماری خاندانی اور موروثی عادتوں کے باوجود میں حقیقت میں اتنی بدتمیز نہیں۔ دراصل مجھے تم پر بہت غصہ تھا اور جس پر مجھے غصہ آ رہا ہو میں اس سے میٹھی بن کر منافقت نہیں دکھا سکتی۔" زرمینہ کی حد درجہ سنجیدگی کے باوجود اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

اپنی خاندانی و موروثی بدتمیزی پر فخر میں وہ بھی اس کی طرح مبتلا تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑی۔

"میں پہلے تمہیں بہت غلط نہیں سمجھتی تھی۔ بہروز پاپا کے انتقال کے بعد تمہارے رویوں کے لئے میں تمہیں کہیں نہ کہیں رعایت بھی دے دیا کرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا اتنے برسوں کی غلط فہمیاں ہیں تمہیں اور روحی تائی کو کچھ عرصہ تو لگے گا آغا جان کے خلوص کو سمجھنے میں مگر جب تمہارا ایم بی بی ایس فائنل ایئر کا رزلٹ آیا اور تم نے اپنے رزلٹ کی اطلاع آغا جان کو نہیں دی تب مجھے تم پر پہلی بار بہت شدید غصہ آیا تھا۔

وہ تمہارا رزلٹ آنے سے پہلے اتنے پُر جوش تھے "میری فاری کا رزلٹ آنے والا ہے' میری پوتی ڈاکٹر بننے والی ہے" وہ اپنے ہر ملنے والے سے ذکر کیا کرتے تھے۔

وہ شرارت سے مجھے چھیڑتے تھے کہ تم پیچھے رہ گئیں فارہ تم سے پہلے ڈاکٹر بن گئی...... لیکن جب تم نے انہیں اپنے رزلٹ سے آگاہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی تم سے فون کر کے تمہارے رزلٹ کے متعلق پوچھا اور یہ پتہ چلا کہ رزلٹ آئے بھی بیس پچیس دن ہو چکے ہیں تب ان کے چہرے پر بکھر تا رنج اور اداسی دیکھ کر مجھے تم بہت بری لگی تھیں۔

وہ تمہارے اس رویے سے ہرٹ ہوئے تھے میں آغا جان سے اس روز بہت لڑی بھی تھی کہ وہ ایک بے حس لڑکی پر کیوں اپنی محبتیں برباد کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا' زرمینہ! فارہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنی محبت دیکھی ہے۔ بس صرف زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتی۔ بہروز کی بیٹی ہے ناں اس کی طرح تھوڑی سی ضدی۔"

مجھ سے بہت پریقین لہجے میں یہ سب کچھ کہہ کر جب وہ تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں بہت شوق سے تمہارے لئے تحائف لے کر تمہارے پاس لاہور گئے تو...... تو وہاں اس روز جو کچھ ہوا اور گھر واپس آنے کے بعد جو درد اور غم میں ڈوبا وجود میں نے آغا جان کا دیکھا تو اس کے بعد مجھے تم پر پہلے سے بھی زیادہ شدید غصہ آیا اور تم بہت بری لگیں۔

پھر ابھی دو، ڈھائی مہینے پہلے جب انہوں نے سی سی یو سے تمہیں فون کیا تھا۔ میں اور لالہ اس وقت ان کے پاس تھے۔ ان کی طبیعت اب تو بہت بہتر ہے فارہ! یقین کرو اس وقت تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ نہ کرے وہ اب بچیں گے ہی نہیں۔

اور پھر میرے اور لالہ کی موجودگی میں وہاں سے جو کچھ آغا جان کو سننے کو ملا اور اس کے بعد جتنی ان کی طبیعت خراب ہوئی' میرے دل میں تمہارے لئے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

اس روز میں تمہیں کوئی رعایت نہیں دے سکی تھی فارہ! تم نے پہلے جو کچھ بھی سنا تھا پر چھ سال سے آغا جان کو دیکھ بھی تو رہی تھیں۔

مجھے لگا یہ کیسی لڑکی ہے اسے تو محبت بھی اپنی طرف کھینچ نہیں پاتی۔ آغا جان اس سے سوائے محبت کے کچھ بھی تو نہیں مانگتے۔" اس کے چہرے کے یک دم ہی پھیکے پڑ جانے والے رنگوں کو دیکھ کر زرینہ نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ دبائے۔

"تم تو دل کی بہت اچھی ہو' اگر تم دل کی اچھی نہ ہوتیں تو اتنا سارا جھگڑا کھڑا کر دینے اور معاملہ کورٹ تک لے جائے جانے کے بعد صرف لالہ کے یہ کہہ دینے پر کہ آغا جان بیمار ہیں کبھی ان کے ساتھ پشاور آتیں؟

اور اب تو میرے دل میں تمہارے لئے کوئی غصہ' کوئی نفرت اور کوئی بغض نہیں، بلکہ تمہاری محبت اور بہت قدر ہے۔ تم واقعی ان سے بہت محبت کرتی ہو تب ہی تو ان کی بیماری کا سنتے یہاں آ گئی ہو، اور تم دل کی بھی بہت بہت اچھی ہو فارہ!"

زرینہ کی سچے دل سے کی گئی اس تعریف نے مزید کچھ رنگ اس کے چہرے پر سے غائب کر دیئے تھے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ وہ یہاں کیسے آئی تھی پھر' پھر وہ اسے کیسا سمجھے گی۔ پھر وہ اس کے متعلق کیا کہے گی کیا سوچے گی؟

اگر ولی اسے سچ بتا دے۔ نہیں۔ وہ یک دم ہی پوری کانپ گئی۔ اس کی وہ سچائی کسی کو بھی پتہ نہ چلے کاش ولی بھی اس دن کو بھول جائے۔

ولی کچن کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ زرینہ سے آغا جان کا ناشتہ لانے کو کہہ رہا تھا۔ شاید اس نے زرینہ کی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے ولی کے چہرے پر طنز' استہزاء اور تمسخر تلاش کرنا چاہا مگر وہاں صرف ایک دبیز سنجیدگی چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

اگر وقت پیچھے کی طرف لے جایا جا سکتا ہے تو اس پل فارہ بہروز خان نے شدت سے یہ دعا مانگی تھی کہ یکم جنوری کی وہ دوپہر لوٹ آئے۔ وہ اس میز پر ولی کے سامنے بیٹھی ہو۔

وہ اپنی شرط فارہ کے سامنے رکھے' وہ اس شرط کو قبول کرنے کے بجائے بضد ہو کر اس شرط کے پیش کیے جانے کے اسباب پوچھے۔

اس کے پیہم اصرار پر جب وہ اسے یہ بتانے پر مجبور ہو جائے کہ آغا جان کی بیماری کے سبب وہ کسی بھی قیمت پر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے' اس لئے یہاں آیا ہے' تب وہ اس سے کہے کہ وہ آغا جان کے پاس چل رہی ہے' بغیر کسی شرط اور معاہدے کے۔

ولی' زرینہ سے ناشتے کا کہہ کر فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور زرینہ جلدی جلدی آغا جان کے ناشتے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ اس عجلت اور تیز رفتاری کے عالم میں اس کا دھیان فارہ کی خاموشی کی طرف بالکل نہ گیا تھا۔

وہ "زرینہ! میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر وہاں سے نکل کر اپنے پورشن میں آ گئی۔ سیدھی اپنے کمرے میں آ کر الماری میں رکھے بیگ کی زپ کھول کر اس نے اس میں سب سامان کے بالکل نیچے دبا لفافہ نکالا اور وہ کاغذ آخر باہر نکال لیا۔

اس پر نظر ڈالے بغیر اس نے اسے پرزے پرزے کیا اور پھر وہ سب پرزے ہاتھوں میں سمیٹے کچن میں لے آئی۔ چولہا جلا کر اس نے وہ سب چھوٹے چھوٹے پرزے آگ پر رکھ دیے تھے۔

❂❂❂

آغا جان کو اسپتال سے آئے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہتری پا کر ولی نے دو دن سے دوبارہ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ زرمینہ ابھی یہیں تھی۔ عباد بھی ہر ایک دن چھوڑ کر آغا جان کی عیادت کے لئے آ رہا تھا۔

اس رات بھی وہ آیا ہوا تھا۔ بہت خوشگوار سے ماحول میں آغا جان ہی کے کمرے میں رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے جب کہ یہ سب صوفوں پر بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا؟ تم جلدی کھا بھی چکیں؟'' اسے پلیٹ خالی کر کے میز پر رکھتا دیکھ کر زرمینہ بے ساختہ بولی۔

''لگتا ہے فارہ کو ہمارے پشاوری کھانے پسند نہیں آ رہے۔ بھئی زرمینہ! کھانے میں تھوڑا سا لاہوری ذائقہ بھی شامل کر لو۔'' عباد مسکرا کر بولا۔

''نہ پشاوری نہ لاہوری' ان خاتون کو سرے سے دیسی کھانوں ہی سے رغبت نہیں ہے' یہ تو چائنیز پسند کرتی ہیں۔'' وہ جواباً خاموشی سے مسکراتی رہی تھی مگر اس کی طرف سے فوراً یہ جواب زرمینہ نے دیا تھا۔

عباد چٹکلے اور لطیفے سنا سنا کر سب کو ہنساتا ماحول کو بہت خوشگوار بنائے ہوئے تھے۔ اسے عباد کا یہ بے تکلفانہ دوستانہ انداز اچھا لگا تھا۔ اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنے گھر وہ پچھلے کئی برسوں سے اکیلے کھانا کھانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ فیملی کے سب لوگ اگر ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں تو عام سا کھانا بھی کتنے مزے کا لگنے لگتا ہے۔

ولی بھی اس کی طرح کھانا کھا چکا تھا اور اب وہ حذیفہ کے ساتھ مصروف تھا جو ماموں کا سر کھاتا اس سے بے بلیڈ چلانا سیکھنا چاہ رہا تھا۔

''برخوردار! یہ وکیل صاحب کو آپ نے کس کام پر لگا دیا ہے؟'' عباد نے بیٹے سے کہا۔

''یار ولی! ہمارے بچپن میں یہ لٹو کتنے روپے کے ملا کرتے تھے' کچھ یاد ہے؟''

''کارٹون نیٹ ورک کے کرشمے ہیں سب۔ اب لٹو جیسی عام سی چیزیں بھی بچے کئی کئی سو کی خرید کر لاتے ہیں۔'' حذیفہ کے ساتھ مصروف ولی نے عباد کو جواب دیا۔

❂❂❂

اگلے روز جب کہ ولی دفتر جا چکا تھا اور آغا جان کی آنکھ لگی ہوئی تھی تب وہ دونوں لاؤنج میں فلور کشنز پر براجمان باتیں کر رہی تھیں۔

وہ واقعی اس کے جیسی تھی جب بدتمیز اور بداخلاق تھی تو بے حد اور اب خوش مزاج اور خوش اخلاق تھی تو بھی بے حد۔ وہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں باتیں کیا کرتی تھی' مگر اس بے تکلفی کے باوجود وہ اس کے اور ولی کے رشتے کے متعلق یا اس کی ممی کے متعلق کبھی بھی کچھ نہ کہتی تھی۔

نہ ہی اس کی پچھلی کسی بات کا کوئی حوالہ دیتی تھی۔ وہ جیسے پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے لئے دل بالکل صاف اور کشادہ کر چکی تھی۔

لنچ ٹائم میں ابھی کافی دیر تھی مگر زرمینہ کو بھوک لگ رہی تھی' اس کی بھوک علاج کے لئے فارہ ایک بڑا سا پیالہ گرم گرم پاپ کارن کا بنا کر لے آئی۔

دونوں بچے وہیں بیٹھے ٹی وی پر کارٹون دیکھنے میں مصروف تھے۔ عشنا پاپ کارن دیکھتے ہی ان دونوں کے پاس آ گئی اور ان دونوں سے

بھی پہلے کھانا شروع ہوگئی جب کہ حذیفہ ویسے ہی کائی اور میکس کو بے بلیڈ چلاتا دیکھنے میں مگن رہا۔

زرمینہ حذیفہ کو پیار سے چمکار چمکار کر اپنے پاس بلا رہی تھی۔

"بیٹا! کھا کر تو دیکھو کتنے مزے کے پاپ کارن بنا کر لائی ہیں فارہ آنٹی!"

پھر وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی اور زبردستی اس کے منہ میں دو تین پاپ کارن ٹھونسے مزید کھانے سے انکار میں سر ہلاتے اس نے اپنی نظریں پھر کارٹون پر جما دیں۔

"اسے اگنور کرو ابھی خود آ جائے گا کھانے۔" فارہ نے ڈائٹ پیپسی کا کین کھولتے اسے نصیحت کی۔

"نہیں آئے گا۔ کھانے سے تو جیسے اسے الرجی ہے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تم تھوڑے دن کے لئے اپنے اس نخریلے بیٹے کو میرے پاس چھوڑو میں اسے ٹھیک کر دوں گی۔" اس نے عشنا کو گود میں چڑھا لیا۔

وہ اس کی گود میں بیٹھی مزے سے پاپ کارن بھی کھا رہی تھی اور اس کے کین سے پیپسی کے گھونٹ بھی لیتی جا رہی تھی۔

"ہمیں تو یہ موٹی گڑیا پیاری لگتی ہے۔" اس نے عشنا کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔

"تم میرے بچوں میں فرق کر رہی ہو۔ خبردار! دیکھو میں تمہیں وارن کر رہی ہوں اپنے بیٹے میں میری جان ہے اگر مجھ سے بنا کر رکھنی ہے تو اس کے نخروں سمیت دل کھول کر پیار کرنا ہوگا۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا تم نے کنفرم بھی کر دیا۔ ہونا وہی روایتی اماں بیٹے کو بیٹی پر فوقیت دینے والی۔"

"ہاں تو کچھ غلط ہے کیا۔ یہ تو شادی کر کے چلتی بنیں گی۔ ہمارے بڑھاپے کا سہارا تو یہ بیٹا ہی بنے گا۔"

روایتی کا لفظ سن کر اس نے بھی بالکل روایتی اور گھسا پٹا جملہ بڑے فخر سے بولا پھر اسے گھورتا پا کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"یار تمہیں ٹوئن بچوں کے ساتھ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اب تو خیر یہ کچھ بڑے ہو گئے ہیں مگر جب پیدا ہوئے ہوں گے تم دو، دو کو ساتھ سنبھال لیتی تھیں؟"

"تم یہ بات کر رہی ہو، مجھے تو پریگنینسی کے دنوں میں ڈاکٹر نے اول اول جب یہ بتایا تھا کہ میرے ہاں جڑواں بچے ہوں گے تو میرے تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میں نے اتنے ارمانوں سے ٹوئن بچوں کی ڈبل سواری والی پرام کاٹ سب چیزیں خریدی تھیں پھر جب یہ پیدا ہوئے اتفاق سے اس ہاسپٹل میں ان دنوں کسی اور کے ہاں جڑواں بچے ہوئے نہیں تھے۔ میں اتنے فخر سے ان دونوں کو گود میں لے کر پھرتی تھی۔ بس صرف یہ کہنے کی دیر ہوتی تھی، تمہارے پاس تو بہن ایک ایک ہے میرے پاس تو دو دو ہیں۔ یار! مجھے منفرد نظر آنے کا شوق ہے۔ روایتی اور عام سے کام تو میں کر ہی نہیں سکتی اور پھر اس میں ایک فائدہ بھی ہے، دونوں ساتھ مل کر بڑے ہو گئے۔ شروع میں بے شک بہت مشکل ہوئی مگر بچے دو ہی اچھے کے اصول پر اگر چلا جائے تو میرا فائدہ بھی تو دیکھو۔ ایک وقت میں دو مشکلات سے نکل آئی۔ ساتھ بڑے ہو گئے، ساتھ اسکول جانا شروع کر دیا، چلو اماں کی مشکل ختم ہوئی۔" وہ اتنے مزے سے بول رہی تھی کہ فارہ سے اپنا قہقہہ روکنا مشکل ہو گیا تھا۔

''ہاں بس نقصان اتنا ہوا کہ میرا پڑھائی کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ کالج میں کلاسز ریگولر اٹینڈ نہیں کر پائی تھی، اس لئے سیکنڈ ایئر کا ایگزیم نہیں دیا۔ اسی وجہ سے اب فائنل ایئر چل رہا ہے لیکن خیر کیا فرق پڑتا ہے ابھی نہ سہی اگلے سال مکمل ڈاکٹر بن جاؤں گی۔''

''تمہاری پڑھائی کے دوران شادی ہوئی کیوں تھی زرمینہ!''

وہ اب یہ بات پورے یقین کے ساتھ جانتی تھی کہ آغا جان نے اس شادی کے لئے زرمینہ کو مجبور نہیں کیا ہو گا۔ پہلے وہ اس خاندان کی عورتوں کو مظلوم، دبا ہوا اور مردوں کو ظالم اور حاکم سمجھا کرتی تھی۔

اس خاندان کی عورتیں باپردہ رہا کرتی تھیں تو یہ ایسی کوئی برائی تو نہیں جس پر یہاں کے مردوں کو قدامت پرست اور ظالمانہ و حاکمانہ ذہنیت کا مالک قرار دے دیا جائے۔

گھر سے باہر تو زرمینہ اور اس فیملی کی دوسری خواتین بڑی بڑی چادروں میں ملفوف ہو کر جایا کرتی تھیں مگر گھر کے اندر بھی اس نے زرمینہ کو کبھی دادا یا بھائی تک کے سامنے کھلے سر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر میں بھی ہر وقت سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ سر پر لئے رکھتی تھی۔ جبر یا زبردستی سے نہیں اپنی خوشی سے۔

اس نے زرمینہ کو فیشن کے مطابق ہاف سلیوز یا بے تحاشا فگر کو نمایاں کرتی فٹنگ والے کپڑے پہنتے نہیں دیکھا تھا۔

اس کا لباس فیشن کے مطابق ہوتا تھا مگر وہ فیشن بس اسی حد تک جاتا تھا جہاں تک ہمارا مذہب ہمیں جانے کی اجازت دیتا ہے۔

اس سب میں کہاں برائی تھی، کہاں ظلم تھا، کہاں دقیانوسیت تھی، بغیر جانے، ملے، قریب سے دیکھے اور اس فیملی کے متعلق بالکل اسی طرز کے پروپیگنڈے کا شکار تھی جیسے مغربی میڈیا مسلمان ملکوں کی باپردہ خواتین کے متعلق کرتا ہے، جو سر پہ سکارف پہن لے، خود کو ڈھکا چھپا کر باہر نکلے، وہ بے چاری مردوں کے ظلم کا شکار ہے۔ اس ظلم سے رہائی کے لئے اسے عورتوں کے حقوق کی علمبردار کسی تنظیم سے فوراً رابطہ کرنا چاہئے۔

''بس یار! حالات کچھ ایسے بنے کہ میری شادی ذرا جلدی اور افراتفری میں ہوگئی۔'' زرمینہ اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

''اصل میں میرے سسر ان دنوں بہت بیمار تھے۔ بیمار کیا ڈاکٹرز انہیں جواب دے چکے تھے۔ مہینہ دو مہینہ، بہت سے بہت چھ مہینے، ڈاکٹرز کے مطابق بس اتنا وقت باقی تھا ان کے پاس۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی کسی ایک اولاد کی خوشی تو دیکھ لیں۔

عباد سب سے بڑے ہیں ناں۔ اپنے بہن بھائیوں میں تو شادی انہیں کی ہونی تھی لیکن اس خواہش کے باوجود میری تعلیم کو ادھورا دیکھتے ان کی آغا جان سے یہ بات کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اسکول کے آخری سالوں میں میری منگنی عباد کے ساتھ کر دینے کے بعد آغا جان نے اور تب تو ماما اور پاپا بھی زندہ تھے ان تینوں نے عباد کے ممی بابا سے بالکل واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ شادی میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہو گی اور اس سے قبل شادی کا نام بھی نہیں لیا جائے گا۔

لیکن اس وقت کسی نے یہ بھی تو نہیں سوچا تھا کہ عباد کے بابا یوں ایک دم اتنے موذی مرض کا شکار ہو جائیں گے۔

تب پھر عباد میرے پاس آئے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے اس شادی کے لئے فورس نہیں کر رہے لیکن اگر میں ان کی خواہش

مانتے ابھی شادی کے لئے راضی ہو جاؤں تو وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو ایک آخری خوشی دے پائیں گی۔

فیصلہ مشکل تھا۔ میں بہت پڑھاکو، کتابی کیڑا ٹائپ کی لڑکی تھی۔ ڈاکٹر بننا میرا جنون تھا اور میڈیکل کی پڑھائی کے ساتھ شادی، اتنی بڑی ذمہ داری کشمکش و پیچ و الجھن میں مبتلا میں نے آخر آغا جان کی ایک بات پر عمل کیا۔

وہ کہتے ہیں فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو، وہ کیا کہہ رہا ہے اور میرا دل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ شادی تو تمہاری اس شخص سے ہونا طے ہے کہ تم اس سے منسوب ہو، اب نہیں ہوتی تو چار پانچ سال بعد ہوگی، پھر ایک چھوٹی سی قربانی دے کر اس کا مان رکھ لو۔

اور یقین کرو فارہ! شادی اس وقت کر لینے کا میرا وہ ایک چھوٹا سا فیصلہ میری شادی شدہ زندگی کے لئے کتنا اچھا ثابت ہوا، تم اندازہ نہیں لگا سکتیں، حالانکہ اس وقت میری ادھوری تعلیم اور کم عمری کی وجہ سے لالہ کو اس شادی پر بہت تحفظات تھے۔

میری شادی ہوگئی اور شادی کے ایک مہینے بعد ہی میرے سسر کا انتقال ہو گیا تب مجھے خود اپنے فیصلے کے درست ہونے کا احساس ہوا۔ میرا وہ ایک چھوٹا سا فیصلہ ایک مرتے ہوئے شخص کو خوشی دے گیا اور بدلے میں عمر بھر کے لئے میرے شوہر کی نگاہوں میں میری عزت اور قدر و منزلت کئی گنا بڑھا گیا۔

میری اس ایک قربانی کی ان کی نگاہوں میں بے حد عزت ہے، بہت قدر ہے، میرے ایگزیمز ہو رہے ہوں تو اپنے کام تو چھوڑو وہ میرے کام تک خود کر دیتے ہیں۔

میں جب ڈاکٹر بن جاؤں گی تو میری اس ڈگری میں پچاس فیصد کریڈٹ میرے شوہر کے تعاون، حوصلہ افزائی، مدد اور محبت کا ہوگا۔'' وہ زرمینہ کی باقی باتیں بے دھیانی میں سن رہی تھی۔

اس کی سوچیں زرمینہ کے صرف ایک جملے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ ''فیصلہ کرنے کے لمحے میں۔''

''زرمینہ! تم نے کیا کہا تھا ابھی۔ فیصلہ کرنے کے لمحے میں دل کی آواز سنو؟'' زرمینہ جیسے ہی خاموش ہوئی اس نے بے حد حیرت سے اس کے یہ الفاظ کھوئے کھوئے سے انداز میں دہرائے۔

''ہاں یار! یہ آغا جان کہتے ہیں۔ یہ آغا جان کے فیورٹ اور غالباً خود ایجاد کردہ جملے ہیں اور یہ وہ ہمیں بچپن سے سکھاتے، بتاتے اور سناتے آئے ہیں۔''

''فیصلہ کرنے کی گھڑی اور فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔''

دل دلیلیں نہیں مانگتا اس لئے جرأت مند بھی ہوتا ہے جبکہ دماغ ہر کام کرنے سے پہلے دلیلیں، ثبوت اور گواہیاں تلاشتا ہے اس لئے بزدل ہوتا ہے۔

لیکن دل کی ماننے کا یہ مشورہ صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنی اس مشین کو صحیح Working Condition میں رکھا ہوا ہوتا ہے اس پر جھوٹ، نفرت، عداوت، لالچ، حرص، حسد، بغض اور کینہ کا زنگ نہیں لگنے دیا۔'' زرمینہ ہنستے ہوئے آغا جان کے الفاظ ہو بہو انہی کے سے

انداز میں دُہرا رہی تھی اور وہ حیرت سے گنگ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

''آغا جان کی اپنی ہی طرز کی بڑے مزے مزے کی مثالیں اور باتیں ہوا کرتی تھیں جو وہ ہمیں بچپن میں سکھایا کرتے تھے۔ یہ جو ضمیر انکل ہیں ناں، وہ بھی وہیں دل کے کہیں آس پاس ہی رہتے ہیں۔

ان کا کام ہماری اس مشین کی نگرانی اور حفاظت کرنا ہے۔ ٹوکتے رہتے ہیں اگر ہم ان کی چیخ و پکار پر دھیان دیتے اس زنگ کی بروقت روک تھام کرلیں تب تو خیر ہے۔ سمجھ لو، ہم نے اپنی مشین کو خرابی سے بچالیا، نہیں تو پھر وہ زنگ آہستہ آہستہ ہماری اس قیمتی اور نازک مشین کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے کر اسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔''

زرمینہ، آغا جان کی باتیں انہی کے الفاظ اور لہجے میں مسکراتے ہوئے دُہرا رہی تھی۔

اور وہ حیران ہو رہی تھی۔

تو ڈیڈی نے جو بچپن میں ایک بار اسے یہی سب باتیں انہی الفاظ میں نصیحت کی تھیں وہ انہیں آغا جان نے سکھائی اور بتائی تھیں؟۔

اور آغا جان کی بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں تھیں کتنی سچ۔ کچھ دیر بعد جب زرمینہ، عباد کا فون آنے پر وہاں سے اٹھی اور وہ لاؤنج میں اکیلی رہ گئی تب وہ آغا جان کی ان باتوں کی روشنی میں اپنا تجزیہ کرنے لگی۔

اسے کیا بات ڈسٹرب کرتی تھی۔ جب خلع کا ایشو اٹھا تب جب آغا جان سے جائیداد میں حصہ مانگنے کے ممی کے مطالبے پر وہ مصلحتاً خاموش ہوئی تھی۔

تب، جب اپنے گھر میں اس نے آغا جان سے اس رشتے کے لئے انکار کیا، تب جب اس نے دو مہینے پہلے آغا جان کی فون کال نہیں سنی تھی تب۔

اس کی ہاؤس جاب میں کارکردگی خراب کیوں جا رہی تھی، اس کا فائنل ایئر کا رزلٹ بہت اچھا کیوں نہیں آسکا تھا؟ کیونکہ اس کا دل اس کے خلاف چلا آرہا تھا۔

''جو کچھ بھی وہ کر رہی تھی اس پر اس کا دل اس سے ناخوش تھا۔'' فارہ! تم مجھ پر زنگ پر زنگ لگا رہی ہو، تم میری درست ورکنگ کنڈیشن کو خراب کردینے پر تلی ہو، تم مجھے ناکارہ بنا دینے کے کام کر رہی ہو۔''

اور اس کا دل اس سے پہلی بار بدگمان اور شاکی کب ہوا تھا جب آغا جان اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروا کے گئے تھے۔

دل کی دنیا کی اپنی دلیلیں اور اپنی منطقیں ہوتی ہیں، دل جسے اچھا قرار دے دے پھر وہ بے دلیل بھی اچھا ہوتا ہے اور جسے برا کہے پھر وہ اپنے حق میں ہر دلیل اور ہر حجت رکھنے کے باوجود برا ہی رہتا ہے۔

اور اس کے دل نے اس روز آغا جان کو اچھا مان لیا تھا، ان کی محبت کو قبول کرلیا تھا، اس سے پہلے اس کا دل نہ انہیں اچھا سمجھتا تھا نہ برا، مگر اس روز ان کے ساتھ بینچ پر بیٹھ کر فارم بھرتے اس کے دل نے ان کی سچائی ان کے خلوص اور ان کی محبت کو پہچان لیا تھا۔

آج اسے پہلی بار پتہ چل رہا تھا کہ چھ سالوں سے وہ الگ سمت میں بھاگ رہی ہے اور اس کا دل الگ سمت میں اس کا دل اس کے مدمقابل، اس کے خلاف کھڑا تھا۔

یہ تو اب طلاق، خلع اور جائیداد والے ایشوز اور اکاؤنٹ سے سارا پیسہ متواتر خرچ کر ڈالنے والے معاملے کے بعد ہوا تھا جو وہ ممی سے خفا اور بہت دور ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے تک تو ان تمام برسوں میں اس نے ہمیشہ انہیں ان کے ہر عمل کے لیے حق بجانب سمجھا تھا۔

صرف اس نے، اس کے دل نے نہیں۔ دل میں ماں کی محبت نہ ہو، یہ ہو سکتا تھا بھلا؟ مگر اس کا دل جسے اتنا چاہتا تھا اسے برباد ہوتا اور غلط کرتا بھی تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ جس سے محبت کرتا تھا، اسے تباہی و بربادی سے بچا لینا چاہتا تھا اور اس کی ممی وہ خود کو تباہ ہی تو کر رہی تھیں۔

ایک بہت اچھی گھریلو، مشرقی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی نے شوہر کی زندگی کے آخری ایام میں اس کا ساتھ نہیں نبھایا، مرنے سے پہلے اسے تنہا چھوڑ گئی۔ اپنے اندر ابھرتے احساسِ ندامت، شرمندگی اور پچھتاؤں سے بچنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ سب الزام آغا جان پر دھر دیں اور خود کو زندگی کے دوسرے مشاغل میں اتنا الجھا لیں کہ اپنے اندر سے ابھرتی کوئی پچھتاووں بھری یاد انہیں آئے ہی نہیں۔

کبھی جو ایک بہت گھریلو عورت، بہت اچھی بیوی اور بہت اچھی ماں تھی اور اب امیر طبقے کی محض ایک ایسی عورت تھی جس کا کام پیسہ دونوں ہاتھوں سے لٹانا تھا۔

شاپنگز، ڈنرز، پارٹیز اس کی زندگی کا محور یہی چیزیں بن گئی تھیں۔

اس کا دل اسے سمجھاتا تھا، ڈانٹتا تھا کہ وہ ماں کو اس خودکشی سے روکے اسے غلط کرنے سے روکے، اسے سمجھائے کہ وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کا بہادری سے سامنا کرے۔

وہ ماں کا ساتھ ایک اچھی فرمانبردار بیٹی کی طرح دے تو رہی تھی مگر اندر یہ احساس شدت سے موجود تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ سب کا سب غلط ہے۔

پچھلے چھ سات مہینوں سے وہ کتنی الجھی ہوئی اور بے قرار تھی، وہ کتنی نڈھال اور کتنی بے سکون تھی۔ وہ اپنے ہی دل کے خلاف لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔

اسے آغا جان کے پاس پشاور چلے جانا چاہیے۔ یہ اس کے دل نے اس سے کہا تھا اور اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے دل کی مانی تھی۔

اتنے دنوں میں پہلی بار اسے خود پر تھوڑا سا فخر ہوا۔ اس کا ندامت سے جھکا سر کچھ اوپر اٹھ سکا، وہ اپنے دل کی مان کر یہاں آئی تھی۔ دل کے پیش کردہ کسی معاہدے کو مان کر نہیں۔

اس کا دل ابھی صحیح Working Condition میں تھا، ہر چند اس نے اسے داغ دار بہت کرنا چاہا مگر وہ ابھی تک صحیح سلامت تھا۔

زرینہ کی بظاہر ایک عام سی بات نے اس کے لیے سوچ کے کتنے نئے در وا کیے تھے۔

ماں سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسے اس کی غلطیوں کا بہت پیار سے احساس دلائے، اس کی غلطیوں کے لئے جواز ڈھونڈنا چھوڑ کر اور اس سے ناراض ہونا ترک کر کے وہ اس سے وہ بات کہے جو اس کا دل سمجھاتا آیا ہے کہ اسے اپنی ماں سے کہنی چاہئے۔

شام کے وقت اپنے پورشن میں آ کر اس نے وہاں سے انہیں فون کیا تھا۔

کانپتی نہیں، مضبوط انگلیوں سے اس نے ممی کا نمبر ملایا تھا۔

''السلام علیکم ممی!''

''میں نے تم سے کہا تھا اب مجھے کبھی بھی.....'' وہ اپنا جملہ مکمل کرتے ہی یقیناً لائن منقطع کر دینے والی تھیں، اس لئے وہ بے ساختہ ان کی بات کے درمیان ہی بول پڑی۔

''ممی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ میری بات پوری ہونے سے پہلے فون بند نہیں کریں گی۔ اگر آپ نے زندگی میں کبھی ڈیڈی سے محبت کی تھی تو میں آپ کو اس محبت کا واسطہ دے رہی ہوں۔''

''فارہ!'' اس کے لہجے میں کوئی گستاخی، کوئی بدتمیزی نہیں تھی مگر شاید انہیں ایسا ہی لگا تھا تب ہی تنبیہی انداز میں اس کا نام لیا۔

''ممی! ایک شخص تھا محمد بہروز خان، وہ بہت اچھا شوہر تھا، وہ بہت اچھا باپ تھا، وہ اپنی شادی شدہ زندگی کے تئیس سالوں میں اپنی بیوی کے ساتھ بہت مخلص، بہت وفادار رہا۔

اس نے بیوی کو محبت، عزت، وفا، سکھ، چین وہ سب کچھ دیا جو ایک چاہنے والا شوہر دیا کرتا ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی اور وہ اس بیٹی کو اس کی زندگی کے اٹھارہ سالوں تک بے حد و بے حساب پیار دیتا رہا۔

اسے عیش و آرام، محبت، شفقت وہ سب کچھ دیا جو ایک محبت کرنے والا باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے پھر آپ کو پتہ ہے کیا ہوا؟

اس کا بھائی مر گیا، اس کا باپ بستر پر بیمار، غم سے نڈھال پڑا تھا۔ وہ اتنے برسوں ضد باندھ کر، ناراض ہو کر باپ اور بھائی سے کیوں دور رہا، ان سے کبھی ملا کیوں نہیں، بیٹے اور بھائی کا فرض کبھی نبھایا کیوں نہیں۔ وہ غم میں بھی تھا، وہ زندگی بھر باپ اور بھائی سے دور رہنے پر نادم بھی تھا۔

اور پتہ ہے ان حالات میں تئیس سال ساتھ رہنے والی بیوی اور اٹھارہ سال باپ کی شفقتوں کے سائے میں پلی بیٹی نے کیا کیا؟

اور پتہ ہے ان حالات میں تئیس سال کے محبت بھرے ساتھ سے بدگمان ہونے میں تئیس گھنٹے بھی نہ لگائے۔ اور بیٹی نے اٹھارہ سال کی محبت محض اٹھارہ گھنٹوں میں بھلا ڈالی۔

آپ کو معلوم ہے جب وہ شخص تین روز بعد مر گیا تھا تو کس حال میں مرا تھا۔ اس کی بیوی نے اس سے تین روز سے بات کرنا بند کر رکھی تھی اور بیٹی خود کو بہت مظلوم اور بہت ستم رسیدہ سمجھ کر ایک کونے میں باپ سے لاتعلق بیٹھی تھی۔

اس کی بیوی اور بیٹی اس پر اعتبار کرتی ہیں، اس کا یقین کرتی ہیں، اس کی محبت کو دل کی گہرائیوں سے مانتی ہیں، وہ سننا چاہتا تھا، وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔

اسے شاید پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہ شاید جان کنی کی تکلیف میں بستر پر نڈھال ہو کر گر بھی گیا تھا۔ اس کے حلق میں پانی کا ایک قطرہ ٹپکانے والا کوئی اس کے پاس نہ تھا نہ بیوی نہ بیٹی۔

اس نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ وہ بھوکا، پیاسا، شاید پیاس کی شدت سے تڑپتا، نزع کا عالم، جان کنی کی تکلیف سب کچھ تنہا جھیل کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔" وہ بھرائی آواز میں انہیں ایک کہانی سنا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بڑی شدت سے بہنے لگے تھے کہ یہ کہانی آنسوؤں کے بغیر سنائی نہ جا سکتی تھی۔

"پھر اس بیوی اور بیٹی کا کیا ہوا؟ آپ کو شاید یہاں تک سن کر ایسا لگا ہو کہ پھر وہ بدل گئی ہوں گی، اپنے کئے پر بے حد شرمندہ ہوں گی، اپنے اس بہت عزیز انسان کی ایسی موت پر ان کے دل ہل گئے ہوں گے۔

نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس زندہ کو انہوں نے جتنی اذیتیں دیں، اس کے مرنے کے بعد بھی اسے اذیتیں دینا ختم نہ کیں۔ اب وہ تو نہیں رہا تھا ہاں اس کا وہ باپ تو زندہ تھا جس سے وہ بے تحاشا محبت کیا کرتا تھا۔

اس شخص سے بدلہ لینے کا، اسے تکلیف پہنچانے کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اب اس کے دکھی باپ کے غمزدہ دل کو مزید غم پہنچائے جائیں۔

پتہ نہیں وہ ماں اور بیٹی اتنی سخت دل کیسے تھیں؟ کیوں تھیں؟ انہیں کوئی حادثہ کوئی سانحہ نہیں ہلاتا تھا۔ مزے کی بات بتاؤں انہیں اپنے مرحوم شوہر اور باپ سے محبت کا بھی بڑا زبردست دعویٰ تھا۔

کوئی مجھ سے محبت کا دعویٰ کرے گا مگر میری ماں سے نفرت کرے تو کیا میں اس شخص کی محبت کو قبول کر لوں گی؟ سچ مان لوں گی؟

کوئی آپ سے بہت محبت کرے مگر آپ کی بیٹی کے خلاف دل میں بغض رکھے تو کیا آپ ایسے شخص کو اپنی محبت میں سچا سمجھیں گی؟

اگر مرے ہوؤں کو زندوں کے اعمال کی خبر پہنچا کرتی ہے تو وہ مر جانے والا ان ماں اور بیٹی کی اپنے سے محبت کے دعوؤں کو کیونکر سچ سمجھتا ہوگا، کیونکر ان پر اعتبار کرتا ہوگا۔"

"فارہ! فارہ! بس کرو۔"

انہوں نے اسے چپ کرانا چاہا، مگر وہ چپ ہونے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے روتے ہوئے بولی۔

"ممی! ڈیڈی آپ کے بہت اچھے شوہر تھے، میرے بہت اچھے باپ تھے، مگر آپ اچھی بیوی نہ بن سکیں، میں اچھی بیٹی نہ بن سکی۔

میں نے اپنا یہ گناہ قبول کر لیا آپ کب کریں گی؟ ابھی وہ بوڑھا انسان زندہ ہے اور ہم ازالہ کر سکتے ہیں۔"

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ایک دو منٹ تو اس سے کچھ بولا بھی نہ جا سکا۔

"ممی! میں بس آپ سے ایک آخری بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک آخری بات۔ اس کا جواب آپ مجھے ابھی مت دیں۔ بعد میں

سوچ کر دے دیجئے گا۔

ممی! کیا کوئی شخص ایک ہی وقت میں اچھا شوہر، باپ، اچھا بیٹا اور اچھا بھائی نہیں بن سکتا؟

کیا محبت کے لئے اللہ نے ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی سی جگہ رکھی ہے؟ ہم ایک وقت میں اپنے بہت سے قریبی رشتوں سے ایک جیسی محبت کر ہی نہیں سکتے؟" زاروقطار روتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

✿✿✿
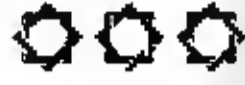
زرمینہ مزید چار روز رہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ آغا جان کی صحت کی طرف سے گو وہ ابھی بھی متفکر تھی مگر بہر حال وہ اپنے گھر کو بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

آغا جان کے پاس ولی کے ساتھ اب فارہ بھی ہے، یہی اطمینان لئے وہ اپنے گھر رخصت ہوئی تھی۔

"اب میں یہاں آیا کروں گی تو تم مجھے یہاں ہر بار اسی طرح رخصت کرنے آیا کرو گی ناں؟" پورچ میں آ کر رکتے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ اس سے بولی۔

ان گزرے دنوں میں ان کے بیچ دوستی، اعتماد اور پیار کا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

"ہاں میں تمہارا ہر بار استقبال بھی خود کروں گی اور رخصت کرنے بھی خود آیا کروں گی۔" مسکرا کر اس نے اسے یقین دہانی کرائی تھی۔

بچوں کے دم سے گھر میں کتنی رونق تھی، اب ایک دم خاموشی سی ہو گئی تھی۔ گھر کے مکین وہ کل تین نفوس تھے، ان میں سے دو آپس میں کچھ خاص زیادہ بات نہیں کرتے تھے تو گھر میں خاموشی ہی کا احساس ہوتا تھا۔

ان دونوں کی آپس میں ہر بات آغا جان ہی کے حوالے سے ہوتی تھی۔ صبح اکثر وہ دونوں بھی آغا جان کے ساتھ ان کے کمرے ہی میں ناشتہ کر لیا کرتے تھے، اس کے بعد وہ چلا جاتا اور فارہ، آغا جان کی ڈاکٹر، نرس اور کک کی تمام ذمہ داریاں زرمینہ ہی کی طرح سنبھال لیتی۔

لنچ ٹائم میں ولی اکثر آغا جان کی وجہ سے گھر آ جایا کرتا تھا، مگر لنچ ٹائم سے قبل بھی دو تین بار اس کی فون کال آتی اگر کال کسی ملازم نے بھی ریسیو کی ہوتی تو وہ اس کو بلوایا کرتا۔

اس سے ان کی پوری طبیعت پوچھتا۔ انہوں نے دوا لے لی، تم نے بی پی چیک کر لیا وغیرہ مگر یہ مختصر بات وہ بہت فاصلہ رکھ کر کیا کرتا۔ اس میں کسی بھی طرح کا کوئی ذاتی یا بے تکلفانہ انداز ہرگز شامل نہ ہوتا تھا۔

پھر آغا جان کی خیریت معلوم کر لینے کے بعد وہ مزید کوئی غیر متعلقہ بات کئے بغیر فون بند کر دیتا۔ شام میں وہ اکثر بہت جلد ہی گھر آ جاتا، ہاں کبھی کبھار معمولی سی دیر ہو جاتی تھی، تب وہ فون کر کے آغا جان کو اپنے دیر سے آنے سے آگاہ کیا کرتا تھا۔

گھر آنے کے بعد پھر وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ اس کی کیا کوئی سوشل مصروفیات، دوست احباب کچھ نہیں تھے یا ان دنوں آغا جان کی وجہ سے اس نے تمام مصروفیات ترک کر رکھی تھیں۔

وہ حیران ہو کر سوچتی۔ اس ینگ ایج میں جو سنجیدگی اور بڑھاپا اس نے خود پر طاری کر رکھا تھا وہ اس پر خاصی متعجب تھی۔

”آغا جان کی تیمارداری اور دفتری کام کیا اس کی زندگی انہی ذمہ داریوں کے گرد گھوما کرتی تھی۔ شام میں گھر آنے کے بعد پھر وہ تقریباً سارا وقت آغا جان کے ساتھ گزارتا۔ وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ جاتی۔

اگر آغا جان اس سے چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق کر رہے ہوتے تو ولی خاموش بیٹھا رہتا اور ولی سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں ہوتے تو وہ چپ رہتی۔

پھر وہ تینوں ایک ساتھ وہاں کھانا کھاتے۔ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور وہ بھی آغا جان کو دوا دینے کے بعد اپنے کمرے میں آ جاتی۔

اپنے پورشن میں دن میں بھی اس کا آغا جان کی وجہ سے بہت ہی کم وقت گزرتا تھا کہ اگر وہ زیادہ وقت وہاں ہوتی تو یہاں وہ بالکل تنہا ہو جاتے اور رات میں تو اس الگ تھلگ اور مکینوں سے خالی غیر آباد حصے میں جا کر سونے کی وہ ہمت کر ہی نہیں سکتی تھی سوا اپنے ڈیڈی کا کمرہ سونے کے لئے استعمال کر رہی تھی۔

ہاں، وہ اپنے اس پورشن کی خود جا کر روز صفائی کرواتی، دن میں نہانا، لباس تبدیل کرنا اور ظہر کی نماز پڑھنا بھی سب وہیں پر کیا کرتی۔

ہر رات اپنے کمرے میں آتے ہی تنہائی ملتے ہی دن بھر آغا جان کے لئے چہرے پر سجائی تمام مسکراہٹیں اس کے چہرے پر سے غائب ہو جاتیں۔ اسے ممی کا خیال آنے لگتا۔

وہ جو کچھ کہہ سکتی تھی اس نے کہہ دیا، اب کیا کرے؟ ان کی طرف سے جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ آغا جان سے جو اتنے وعدے اسپتال میں کیے تھے ان کا کیا ہوگا، وہ ممی کی نفرتوں کو کس طور ختم کر پائے گی؟

فروری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، یہ فروری کے مہینے کی بالکل ابتدائی تاریخیں تھیں اور وہ ممی کی اس مسلسل اور پیہم خاموشی پر بے حد دلبرداشتہ اور اداس تھی۔

وہ اپنا ذہن بٹانے کے لئے ٹی وی دیکھنے، کوئی میگزین پڑھنے کی کوشش کرتی تب بھی اس کا ذہن اور دل ممی ہی میں اٹکا رہتا۔

زرمینہ تقریباً ہر روز چاہے کھڑے کھڑے ہی آ جائے آغا جان کی خیریت پوچھنے آ رہی تھی۔ کبھی عباد ساتھ ہوتا، کبھی وہ ڈرائیور کے ساتھ آ جاتی اور کبھی کسی کام سے نکلی ہوتی تو خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتی یہاں کا بھی ایک طوفانی دورہ کر لیا کرتی۔ فون پر تو اس کا فارہ اور آغا جان سے تفصیلی گفتگو کرنا لازمی ہوا ہی کرتا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے آغا جان کی طرف سے بہت مطمئن تھی۔

ولی باقی ہر چیز کا بہت اچھی طرح دھیان رکھ لیتا تھا مگر آغا جان کا کھانا پینا۔ وہ نوکروں کو ہدایات تو دے دے گا مگر وہ کیا کر رہے ہیں اور کیسے پکا رہے ہیں، یہ تو وہ کھڑا رہ کر نہیں دیکھ سکتا۔

کارن آئل ختم ہو گیا، زیتون کے تیل کا ڈبا نہیں کھلا، چھوڑو، کون تردد کرے یہ سامنے گھی رکھا ہے، کھانا اسی میں پکا کر جان چھڑا لو۔

بکرے کا گوشت اگر بغیر چکنائی کمل طور پر ہٹائے بھی پکا لیا تو کیا حرج ہے۔

نوکر تو نوکر ہوتے ہیں اور جب کوئی ان کے سر پر کھڑا ہو کر دیکھنے والا نہ ہو تو وہ اپنی سہولت اور موڈ کے لحاظ سے ایسی کارگزاریاں دکھا سکتے ہیں۔

فارو آغا جان کے لئے پرہیزی کھانا زرینہ کی طرح خود پکاتی تھی، اس پر زرینہ مطمئن تھی اس کے روز و شب ان دنوں آغا جان کے ساتھ گزر رہے تھے۔

اور فروری کے ان ابتدائی دنوں میں سے ایک دن آغا جان نے اس سے اس کے لاہور واپس جانے کی بابت پوچھا تھا۔ اس کے ہاؤس جاب کی تو خیر انہیں جو فکر تھی سو تھی مگر اصل فکر انہیں ممی کی تھی۔

''بیٹا! تمہاری ممی وہاں تنہا ہیں۔ تمہیں اب ان کے پاس چلے جانا چاہئے۔ میری طبیعت یوں بھی اب پہلے سے بہتر ہے۔''

وہ ان کے دل کو رنج پہنچاتی کوئی بھی بات ان سے کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے ہلکے پھلکے خوشگوار انداز میں انہیں یہ بتانے لگی کہ وہ ٹورنٹو خالہ سے ملنے گئی ہوئی ہیں اور ابھی چند ماہ وہیں رہیں گی، لہٰذا ان کے لاہور میں اکیلے ہونے کا کوئی مسئلہ ہی درپیش نہیں اس لئے وہ یہاں اطمینان سے خوب لمبا رہ سکتی ہے۔

یہاں آ کر اس نے اب تک کبھی یہ بات انہیں بتائی ہی نہیں تھی، وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ لاہور میں ہیں اور اس نے ان کی غلط فہمی دور نہ کی تھی، اب جب انہیں یہ بات بتائی تو اس کے ہلکے پھلکے انداز کے باوجود وہ جیسے کچھ بھانپ سے گئے۔

انہوں نے اسے کریدا۔ پہلے وہ بات کو یہاں وہاں گھماتی رہی مگر ان کے پیہم بضد انداز پر آخر اسے سچائی بتانی ہی پڑی۔

''وہ کینیڈا مجھ سے ناراض ہو کر گئی ہوئی ہیں۔''

''کیا یہاں آنے پر؟'' وہ بے اختیار لیٹے سے اٹھ بیٹھے، حد درجہ متفکر اور پریشان۔

''آپ اور کس کس ناکردہ گناہ کا الزام اپنے سر لیں گے آغا جان! یہاں آنے پر نہیں وہ اس سے بہت پہلے سے مجھ سے ناراض ہو کر ٹورنٹو چلی گئی تھیں۔ جب میں یہاں آئی تو انہیں گئے پندرہ روز ہو چکے تھے۔ آپ ولی سے پوچھ لیں، میں اپنے گھر کو تالا لگا کر آئی تھی۔''

اس نے خود کو رونے سے بدقت روکا تھا۔ وہ ان کے سامنے بالکل بھی نہیں روتی تھی۔ وہ ان کے سامنے کوئی تکلیف دیتا موضوع چھیڑا بھی نہ کرتی تھی مگر اب ان کے اصرار پر اسے یہ دکھ دیتا موضوع اٹھانا ہی پڑا تھا۔

''اور تم پندرہ دنوں سے اکیلی رہ رہی تھیں؟'' انہیں نجانے کون کون سے وہم اور پریشانیاں ستانے لگیں۔

''آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں آغا جان تب جو کچھ بھی ہوا، اب تو میں آپ کے پاس ہوں، بالکل محفوظ اور امان میں اور آپ ممی کی ناراضی کی فکر مت کریں، انشاء اللہ بہت جلد وہ اپنی ساری ناراضی بھلا دیں گی۔

اور میرے ہاؤس جاب کی بھی آپ فکر مت کریں۔ ہاؤس جاب اور میرا پروفیشن، میں ہر چیز کے متعلق پوری سنجیدگی سے سوچوں گی مگر ابھی نہیں۔ پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جائیں۔ اٹھ کر چلنے، پھرنے اور اپنے سارے کام خود کرنے کے قابل ہو جائیں، تب تک کا یہ وقت میں

صرف اور صرف آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔

اور یہ تو خیر آپ بھول ہی جائیں کہ میں آپ کو چھوڑ کر یہاں سے کہیں جانے والی ہوں۔ آپ کو تنگ کرنے کو رہوں گی تو میں اب ہمیشہ یہاں پر ہی۔"

وہ ممی کی اس سے ناراضی اور کینیڈا گئے ہونے کا سن کر خاصے متفکر ہوئے تھے۔ اپنی بیماری کی وجہ سے نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں وہ اس کی خیریت نہ خود پتہ کر سکے نہ ولی سے کروا سکے تھے جیسے ہمیشہ کر لیا کرتے تھے ورنہ تو اس کے اکیلے رہنے کا انہیں پہلے ہی پتہ چل جاتا۔

وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے مسکرا رہی تھی اور وہ اسے اپنے لئے پریشان ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے مسکرا رہے تھے۔

۞۞۞

"آپ دل کو دماغ پر فوقیت دیتے ہیں؟" اس نے آغا جان سے پوچھا۔

وہ ان کے ساتھ بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔ لنچ کے لئے ان کا پرہیزی سالن چڑھا کر آنے کے بعد اب وہ ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور ادھر ادھر کی باتوں کا ذکر نکلتے نکلتے وہ انہیں یہ بتانے لگی کہ ان کی کچھ باتیں اسے اس کے ڈیڈی نے بچپن میں بتائی تھیں۔

وہ دلچسپی سے اس کے لبوں سے اپنے ہی فقرے سن رہے تھے اور یقیناً یہ جان کر بے پناہ خوش بھی ہو رہے تھے کہ ان کے بیٹے نے ان سے دور چلے جانے اور بظاہر خفا نظر آنے کے باوجود بھی درحقیقت انہیں ہمیشہ اپنے دل میں آباد کئے رکھا تھا تب ہی تو ان کی باتیں اپنی بیٹی کو بتایا کرتا تھا۔

وہ اس کا سوال سن کر مسکرائے۔

"ہاں، اقبال کا سچا معتقد ہوں ناں اس لئے۔" پھر اسے بغور دیکھتے وہ اسی دھیمی مسکراہٹ کو چہرے پر لئے نرم لہجے میں کہنے لگے۔

"تم اللہ کو، اپنے رب کو دل سے مانتی ہو یا دماغ سے؟ یقیناً دونوں سے مانتی ہو گی مگر ان دونوں کے ماننے میں فرق بہت ہے۔ دل اللہ کو بے دلیل اپنا رب مانتا ہے اور دماغ دلیل کے ساتھ۔"

اسی مسکراہٹ کو چہرے پر لئے مزید کہنے لگے۔

"تمہاری میڈیکل سائنس کی زبان میں اگر بات کروں تو طب کی ایک کتاب میں پڑھی کچھ باتیں تم سے شیئر کروں۔" زمانہ قدیم کے طبیبوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ چونکہ دماغ رئیس الاعضاء ہے اور دوسرے تمام اعضاء کی طرح دل بھی دماغ کے پوری طرح تابع ہے اور دماغ ہی نے دل کو دھڑکنے کے لئے ابتدائی مہمیز دی اور اسی کے احکام پر دل دھڑکتا ہے اس غلط فہمی کو ایک مشہور عالم نے دور کیا۔

اس نے یہ چونکا دینے والا اور حیرت انگیز انکشاف کیا کہ پیدائش سے قبل جب بچے کے اعضاء نشوونما پانے کے مرحلے سے گزر رہے ہوتے ہیں تب بچے کا دل اس وقت دھڑکنا شروع کر دیتا ہے جب کہ ابھی دماغ کی پوری طرح تشکیل بھی نہیں ہوئی ہوتی۔

اس بات نے دنیا بھر کے ڈاکٹروں، سائنس دانوں کو آج تک سرگرداں رکھا ہے کہ وہ کیا قوت ہے جو دل کو اول اول دھڑکنا سکھاتی ہے۔" وہ پڑھی لکھی کتابی قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔

''ارسطو نے کہا تھا کہ دل ہی ایک عضو ہے جو سب سے پہلے حرکت کرتا ہے اور سب سے آخر میں اس کی حرکت بند ہو کر سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بھئی، یہ اللہ کی مشیت اس کا قانون اور اس کا فیصلہ ہے کہ اس نے دل کو دوسرے تمام اعضاء پر فوقیت دی ہے۔''

''آپ اپنے جسم کے جس عضو سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں اسی نے آپ کو کس قدر تنگ کر کے رکھا ہوا ہے۔'' وہ ان کی بیماری کا لطیف پیرائے میں ذکر کرتی شرارت سے مسکرائی۔

وہ بھی جواباً کھل کر ہنسے۔ کچھ دیر ان کے بیچ یہی موضوع رہا۔ وہ دل کے قصیدے پڑھتے رہے، وہ سنتی رہی اور جوابی تبصرے کرتی رہی۔

کافی دیر بعد جب یہ موضوع ختم ہوا تب کچھ خیال آنے پر وہ اس سے بولے۔

''بیٹا! میں اپنی وصیت تیار کروا رہا ہوں۔ یہ گھر میں روحی کے نام کر رہا ہوں اور تمہارے۔'' وہ بولتے بولتے اس کے چہرے کے رنگوں کو یکدم ہی پھیکا پڑتا دیکھ کر یک لخت چپ ہوئے۔

ابھی وہ اتنا مسکرا رہی تھی، ان کے ساتھ شوخی و شرارت بھری باتیں کر رہی تھی اور اب۔

''فارہ! بیٹا کیا ہوا؟''

''آغا جان! آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔ آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔'' وہ ان کے پاس بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ یکدم ہی ان سے دور ہٹنے لگی۔

''نہیں فارہ! ایسا نہیں۔''

''اور میں نے یہ سوچ کر کبھی آپ سے اپنے کسی پچھلے رویے کی معافی نہیں مانگی تھی کہ مجھے لگتا تھا میرا اور آپ کا رشتہ، آپ کی مجھ سے محبت، معافی کے ایک لفظ سے بہت اونچی ہے۔ میں معافی مانگ کر آپ کی محبت کی توہین کروں گی، آپ کو ایک دم ہی بالکل پرایا اور اجنبی کر دوں گی۔ آپ میرے معافی مانگنے سے ہرٹ ہوں گے، آپ کو لگے گا، فارہ اب بھی مجھ سے سچے دل سے پیار نہیں کرتی۔ بس صرف شرمندہ اور نادم ہوتی ہے۔''

وہ اہسپتال میں جو پہلے دن ان کے سامنے روئی تھی، اس ایک دفعہ کے بعد وہ پھر دوبارہ کبھی ان کے سامنے نہ روئی تھی مگر اس وقت اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

''فارہ! ایسا نہیں بیٹا تم غلط سمجھ رہی ہو۔ یہ میں کسی ناراضی یا غصے میں یا روحی کے مطالبے کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ یہ تو مجھ پر فرض ہے، یہ کام تو مجھے ہر حال میں کرنا ہی ہے۔'' انہوں نے اسے اپنے قریب کر کے رسانیت سے سمجھانا چاہا۔

''آپ مجھے دولت جائیداد کا لالچی سمجھتے ہیں، جبکہ سچ یہ ہے کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ صرف ممی کا تھا میرا نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں، میں اس مطالبے میں ان کی ہم نوا تھی؟ میرا ممی سے اختلاف ہی اس بات پر ہوا تھا آغا جان! وہ مجھے چھوڑ کر کینیڈا چلی ہی اس لئے گئیں کہ میں ان کی مخالفت کرنے کا جرم کر بیٹھی تھی۔''

اس روز ممی کے جانے کے اسباب ان سے ہنسی میں چھپا لینے والی اس وقت روتے ہوئے سب کچھ بتانے لگی تھی۔

''میں جانتا ہوں یہ میری بیٹی کا مطالبہ نہیں تھا۔ یہ صرف روحی کا مطالبہ تھا لیکن بیٹا! اس کے اس مطالبے میں ایسا غلط تو کچھ بھی نہیں جو تم ماں سے خفا ہو جاؤ۔ اس کا اپنا حق مجھ سے مانگنا بالکل جائزہ تھا اور ہے۔

لیکن میں اس وقت اس مطالبے پر قصداً خاموش اس لئے رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ یہ مطالبہ وہ خود اتنا نہیں کر رہی جتنا دوسرے کچھ لوگ اس سے کروا رہے ہیں۔ کچھ اور لوگ اسے اکسا رہے ہیں۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں تمہارے اور روحی کے حق پر وہ دوسرے لوگ بعد میں قابض نہ ہو جائیں، تم لوگوں کا حق چھین نہ لیں بس اس لئے خاموش رہتا تھا۔ بیٹا! ماں کی طرف سے دل برا مت کیا کرو۔ وہ بس سادہ اور کم عقل ہے، وہ دوست، دشمن میں فرق نہیں کر پائی۔

یہ سب کسی ناراضی میں نہیں اپنا فرض، اپنی ذمہ داری سمجھ کر اور تم سب کی محبت میں کر تا رہا ہوں۔

تم، ولی، زرینہ، روحی مجھ پر فرض ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہر ایک کو اس کا جائز حق اپنے ہاتھوں دے دوں۔ تمہیں اگر میں اپنے ہاتھ سے کچھ دوں تو کیا تمہیں مجھ سے لینا اچھا نہیں لگے گا؟ میں چاہتا ہوں میرے جانے کے بعد بھی میری بیٹی کو کبھی کوئی تکلیف، کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ وہ ہمیشہ بہت پر سکون، پر آسائش اور آسودہ زندگی گزارے۔''

وہ بہت تدبر اور رسانیت سے بولے مگر وہ ان کے کسی بھی لفظ کا کوئی اثر قبول کئے بغیر اسی ضدی لہجے میں روتے ہوئے بولی۔

''مجھے آپ سے محبت کے سوا اب کچھ بھی نہیں چاہئے آغا جان! مجھے دولت، جائیداد کچھ نہیں لینی۔ آپ جس کے نام چاہیں اپنی جائیداد کر دیں مجھے مطلب نہیں اور آغا جان! آپ سے سچ کہہ رہی ہوں، اگر آپ نے اپنی جائیداد میں سے کوئی ایک چیز بھی میرے نام کی تو میں آپ کو چھوڑ کر ہمارے اس گھر کو چھوڑ کر زندگی بھر کے لئے کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گی کہ پھر آپ عمر بھر مجھے تلاش کرتے رہیں گے اور میں ملوں گی نہیں۔'' وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

''میرے ضدی بیٹے کی ضدی بیٹی جو تم کہو گی وہی ہو گا۔ اب یہ آنسو فوراً صاف کر لو ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔'' اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر انہوں نے اسے بہت پیار بھری خفگی سے ڈانٹا۔

❁❁❁

وہ آغا جان کے جائیداد کی بات کرنے سے بے حد مضطرب ہوئی تھی۔ گو انہوں نے وہ موضوع وہیں ختم کر کے پھر اس پر کچھ بھی نہ کہا تھا مگر وہ حقیقتاً ڈسٹرب ہوئی تھی۔ دوسری طرف ممی کی طویل خاموشی تھی۔

وہ ان کی اس خاموشی کے کیا معنی نکالے۔ تیسری طرف ولی اور اس کی پراسرار خاموشی تھی آغا جان اور زرینہ دونوں نے اس کی سچائی اور خلوص کو اس کے بدل جانے کو سچے دل سے قبول کر لیا اور ولی، کیا وہ سمجھتا ہے۔

وہ بدلی نہیں صرف اپنے طے کئے تین مہینے گزار رہی ہے؟ کیا آغا جان سے جائیداد کی تقسیم کی بات بھی اس نے کروائی تھی؟

آغا جان اور زرینہ نہیں جانتے لیکن ولی بخوبی جانتا ہے کہ وہ یہاں کس طرح آنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں میں کس مقام پر

تھی اسے اندازہ تھا۔

وہ اس سے آغا جان کے متعلق بات کرنے کے علاوہ کسی بھی اور موضوع پر کبھی ایک لفظ نہیں بولتا تھا۔ان کا ہر تعلق صرف آغا جان کی وجہ سے تھا اور اگر ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے یا بولتے تھے تو صرف ان کی خاطر، ان کی وجہ سے کاغذ پھاڑ کر پھینک دینے یا جلا دینے سے وہ اپنی اس روز کی باتوں سے مکر نہیں سکتی تھی لیکن وہ پھر بھی اس سے اپنے پچھلے رویوں پر معذرت کر کے اسے اپنا یقین دلا کر اس کی نگاہوں میں کچھ عزت پانا چاہتی تھی، اس لئے کہ اب وہ ولی کے ساتھ اپنے رشتے کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ہاں یہ سچ تھا۔سو فیصد سچ۔ یہ اس کے باپ کا مرنے سے پہلے بیٹی کے حق میں آخری فیصلہ تھا، اسے اپنے باپ کے اس آخری فیصلے کی عزت اور اس کا پاس رکھنا تھا۔

''فارہ! تمہیں کیا لگتا ہے، تمہارے ڈیڈی تمہارے ساتھ کیا کبھی کچھ برا کر سکتے ہیں؟''

''نہیں، آپ میرے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں کر سکتے۔''

یہ سوال روز رات اس کے کانوں میں گونج کرتا تھا، پر اس کا جواب اس نے آج رات روتے ہوئے بے آواز دیا تھا۔

برسوں باپ کے اس ایک فیصلے پر شاکی وہ اس سے دل ہی دل میں خفا رہتی تھی مگر اب جانتی تھی کہ بہت چاہنے والا باپ اپنے مرنے سے صرف تین دن پہلے بیٹی کے حق میں کچھ برا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ فیصلہ ان کے دل کا فیصلہ تھا۔

فیصلہ کرنے کے لمحے میں شاید انہوں نے اپنے دل کی آواز سنی تھی، جو کسی سانحے کے رونما ہونے کی انہیں پیشگی خبر دے رہا تھا۔

معیز اس کی پسند، اس کی خواہش ضرور تھا، محبت ہرگز نہیں لیکن اگر وہ اس کی محبت ہوتا تب بھی وہ ایک بیٹی کا فرض نبھاتی، اسی راستے کا انتخاب کرتی جو راستہ اس کے لئے اس کے باپ نے چنا تھا۔

اور جب وہ یہ سوچ چکی، فیصلہ کر چکی تو اب اسے ولی کے پاس جانا تھا۔وہ خاموش بیٹھ کر سکون سے وقت نہیں گزار سکتی۔

اسے اس کے سامنے اپنے تمام بدترین اور بدصورت رویوں کی وضاحت کر کے، معافی طلب کر کے اس سے سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنے کی بات کرنی تھی۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔

بہت ہی زیادہ مشکل۔جس سے وہ ہمیشہ چیخ چیخ کر طلاق کا مطالبہ کرتی رہی ہے، جس سے اس نے ہمیشہ علی الاعلان نفرت کا اظہار کیا ہے جس کے ساتھ وہ یہاں آئی ہی طلاق ملنے کی امید پر ہے، اس سے کہنا کہ آؤ سب بھلا کر زندگی نئے سرے سے جئیں۔کوئی آسان اور معمولی بات نہیں تھی۔

سوچ لینے، فیصلہ کر لینے کے باوجود اسے ولی کے پاس جانے کی ہمت کرنا مشکل ہو رہا تھا، مگر زندگی میں جو جو کچھ غلط وہ کر چکی تھی اسے ٹھیک کرنا، سنوارنا بھی تو اسے خود ہی تھا۔

☼☼☼

اگلے روز دوپہر میں آغا جان کے کھانے کے بعد سو جانے پر وہ اپنے پورشن میں آ گئی۔ آج اسے ولی سے بات کرنا تھی مگر اس سے بات کرنے سے قبل وہ معیز سے بات کرنا چاہتی تھی۔

پہلے نفرتوں میں اندھے ہو کر کبھی سوچا نہیں تھا۔ اب سوچتی تو اسے خود پر شرم آیا کرتی۔ کسی کی منکوحہ ہو کر وہ کسی اور کا شادی کا پیغام قبول کیے بیٹھی تھی۔

اگر یہ طے کر چکی تھی کہ اسے ولی کے ساتھ نہیں رہنا، اس سے طلاق لینی ہے تب بھی جب تک اس کے نکاح میں تھی۔ کیا اخلاقی لحاظ سے یہ مناسب تھا کہ وہ کسی دوسرے کا شادی کا پرپوزل قبول کر لیتی۔

جب دوران عدت عورت کو کسی کا شادی کا پیغام قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے تو کسی کے نکاح میں ہوتے یہ مذہباً کیسا فعل ہوگا۔ معیز نے تو اسے پرپوز کیا ہے اور اس کا پرپوزل قبول کیے اسے دس گیارہ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں بیتا جب کہ ممی تو یہی رشتہ تجمل ماموں کے ساتھ آج سے دو ڈھائی سال پہلے طے کر چکی تھیں۔

وہ ممی پر اس رشتے کو قبول کر لینے کا الزام ڈال کر خود کو بے قصور ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ میڈیکل فائنل ایئر کی طالبہ اتنی نادان اور ناسمجھ نہیں ہوتی کہ اسے اچھے برے، صحیح اور غلط کی پہچان نہ ہو اور اگر اسے یہ پہچان نہیں ہے تو اس پہچان کے نہ ہونے میں بھی قصور اس کا اپنا ہی ہے۔

یہ فروری کا وسط تھا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل معیز یہاں سے اس سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ آغا جان کی تیمارداریوں میں مصروف نہ کبھی اس نے معیز کو سوچا نہ وہ اسے یاد آیا نہ اسے اس کی ناراضی فکر ہوئی۔

وہ اس سے ناراض تھا تو وہ تم روٹھے، ہم چھوٹے کی عملی تفسیر بنی اس سے یکسر بے نیاز و لاتعلق، اسے مکمل فراموش کیے آغا جان کے ساتھ اپنے روز و شب گزارتی رہی مگر پھر کچھ دنوں کی ناراضی کے بعد اس کے موبائل پر معیز کی کالز اور Massages آنے لگے تھے۔

وہ اس کی کالز ریسیو نہیں کر رہی، اس کے Massages کا کوئی جواب نہیں دے رہی، پھر بھی وہ ہمت نہ ہارتا۔ اسے تقریباً ہر روز کالز کر رہا تھا اور بے حساب SMS روز بھیج رہا تھا۔

وہ اسے واضح الفاظ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ سنا کر اس قصے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔

وہ معیز کو کال ملا چکی تھی۔ وہ اس کی کال ریسیو کرتا خاصا خوش اور پرجوش تھا۔

''شکر تم واپس آ گئیں۔ مجھے یقین تھا تمہارا یہ بچپنا یا ایڈونچر جو بھی اسے کہیں، جلد ختم ہو جائے گا۔'' وہ جیسے سب ناراضی اور شکوے بھلا چکا تھا۔

''معیز! میں پشاور سے کال کر رہی ہوں۔ آغا جان کے گھر سے، اپنے گھر سے۔'' اس نے پرسکون انداز میں اس کی غلط فہمی دور کی۔

وہ ایک پل بالکل خاموش ہوا، شاید جواب میں فوراً کچھ کہہ نہ پایا تھا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ فارہ! یہ تمہیں دادا جان کی محبت کا اچانک بخار چڑھ کیوں گیا ہے۔ ساری زندگی تم ان سے بے زار رہی ہو اور اب ایک دم ہی..... ممی کی طرح جادو ٹونوں پر مجھے ذرا یقین نہیں مگر اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے واقعی تم پر کسی نے جادو ہی کر دیا ہے۔ تم مجھے وہ فارہ نہیں لگ رہیں۔''

''آپ نے ٹھیک کہا معیز! مجھ پر جادو ہو گیا ہے۔ محبت کا جادو اور محبت کے جادو کے اثر سے میں اب زندگی بھر نکل نہیں پاؤں گی۔ ہاں میں وہ فارہ نہیں ہوں جسے آپ جانتے تھے۔ میں بدل چکی ہوں۔ میری خواہشات میری ترجیحات سب بدل گئی ہیں۔''

''اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کہو گی کہ تم اپنی ساری زندگی ولی صہیب خان کے ساتھ گزارنے کے لئے تیار ہو چکی ہو، طلاق کے مطالبے سے دستبردار ہو چکی ہو۔''

''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ میں نے دراصل آپ کو یہی اطلاع دینے کے لئے فون کیا تھا کہ میں ولی کے ساتھ اپنے رشتے کو قبول کر چکی ہوں۔ یہ رشتہ میرے ڈیڈی کا قائم کیا ہوا ہے اور میں اسے اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک نبھاؤں گی۔''

''تم پاگل ہو چکی ہو فارہ! تم واقعی ہوش و حواس بالکل گنوا رہو چکی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، وہ گھمنڈی انسان تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے کوئی عزت دے کر ساتھ رکھے گا؟! اتنا اعلیٰ ظرف تو کوئی عام مرد بھی نہیں ہوتا کجا کہ اس جیسا مغرور انسان۔ تم ہمیشہ اسے مسترد کرتی رہی ہو۔ وہ تمہیں اپنا کر صرف اپنی انا کی تسکین کرے گا اور پھر زندگی بھر تم سے اپنے مسترد ہونے کا انتقام لیتا تمہیں اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائے گا۔ ابھی جو یہ عزت کروں گی اور نبھاؤں گی کے ڈیلا گز بول کر تم خود کو کسی جذباتی فلم کی ہیروئن سمجھ رہی ہو اس وقت پھر سر پکڑ کر روؤ گی۔'' دوستانہ نرمی والا انداز ترک کر کے وہ یکدم ہی غصے سے بولا۔

''میں سر پکڑ کر روؤں گی یا پچھتاؤں گی، تو بھی مدد مانگنے آپ کے پاس ہرگز نہیں آؤں گی اور یہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جو فیصلہ میں کر چکی میں صرف آپ کو اس سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی، میں نے اس لئے فون کیا تھا۔''

وہ سکون سے بات مکمل کر کے اب خدا حافظ کہہ دینا چاہتی تھی مگر ایسا کر نہ سکی کیونکہ معیز فوراً ہی بولنے لگا تھا۔

''میں نہیں جانتا وہ خبیث تمہیں کیا کہہ کر پشاور لایا تھا مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ سب ان متکبر دادا پوتے کی تمہارے اور پھوپھو کے خلاف کوئی انتہائی گہری، گھناؤنی اور گھٹیا سازش ہے۔''

''معیز! اپنے کسی بھی قریبی رشتے کے متعلق میں کوئی غلط لفظ اب ہرگز نہیں سنوں گی۔ میں اس کہنے والے کو زندگی بھر کے لئے چھوڑ دوں گی۔ چاہے وہ میرا اچھا، مخلص اور پرانا دوست معیز تجمل ہی کیوں نہ ہو۔'' اس بار وہ سکون سے نہیں غصے اور تنبیہی لہجے میں بولی۔

''بہت بے عزت کروایا میں نے اپنے دادا کو، اپنے مرحوم باپ کو، اپنے شوہر کو، اب نہیں۔ اب ہرگز نہیں۔ اب جسے مجھ سے دوستی اور محبت کا دعویٰ ہے اسے ہر اس رشتے کی عزت کرنی ہوگی جس کی میں عزت کرتی ہوں، جس سے میں پیار کرتی ہوں۔

ماں، باپ، دادا، شوہر ان تمام رشتوں پر اگر کوئی لڑکی کزن اور دوست کے رشتے کو ترجیح دے تو وہ کس کردار کی لڑکی ہوگی؟ اور میں ایسے کردار کی لڑکی کبھی بھی نہیں بنوں گی۔''

دوٹوک اور مستحکم لہجے میں بولتی وہ بغیر خدا حافظ کہے فون بند کر چکی تھی۔

✿✿✿

''تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔'' رات کے کھانے کے دوران آغا جان ولی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔

مختلف مشہور مصرعوں میں وہ اپنی مرضی کے الفاظ جوڑتے توڑتے اسے ستا رہے تھے۔

''خود ہی نے یہ نام رکھا تھا، اب خود ہی میرے نام کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔''

''رکھتے وقت سوچا تھا کہ نام کا اثر لازمی پڑے گا، مگر ہائے افسوس!'' وہ اس کے شکوے کے جواب میں مسکرا کر بولے۔

وہ اس چھیڑ چھاڑ سے لاتعلق سر جھکا کر نوالے بنانے اور منہ میں رکھنے کے عمل کو ایک کے بعد ایک دُہرا رہی تھی کل رات فیصلہ کرلیا تھا کہ آج رات آغا جان کے سوجانے کے بعد وہ ولی کے پاس جا کر بات کرے گی، مگر اب جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں، اس کی ٹینشن اور گھبراہٹ بھی بڑھتی جارہی تھی۔

پریشانی میں اس کی بھوک بالکل مرگئی تھی اور اس وقت اسے آغا جان کی کسی انتہائی پرلطف بات پر بھی ہنسی نہیں آرہی تھی، وہ جبراً چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر لا رہی تھی۔

وہ اپنے کس کس عمل کی اسے کیا توجیہہ پیش کرے گی، وہ اس کا چاہتیں لٹاتا وا نہیں جو کوئی وضاحت مانگے بغیر اسے سینے سے لگالے، اس کے ساتھ کزن کا رشتہ ہو یا شوہر کا، اس کے دونوں ہی رشتے انا رکھنے والے رشتے تھے۔

بس صرف ایک امید اس کی آغا جان سے بے تحاشا محبت تھی۔ وہ آغا جان سے بے تحاشا والہانہ محبت کرتا ہے اور شاید ان کی خاطر وہ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر اسے معاف کرسکے۔

کھانے اور دوا کے تمام مراحل سے فارغ ہونے کے بعد جب آغا جان سونے لیٹ گئے تو وہ دونوں بھی روز کی طرح اپنے اپنے کمروں میں آگئے۔

آغا جان گہری نیند سو جائیں، اس نے کچھ وقت صرف یہی سوچ کر اپنے کمرے میں گزارا اور جب کافی دیر بعد یہ اطمینان ہوگیا کہ اب تک وہ گہری نیند سو چکے ہوں گے تب وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں پر آئی۔

وہ لوگ آغا جان کی وجہ سے جلدی کھانا کھالیا کرتے تھے اور ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں کیا کررہا ہوگا۔ کیا وہ کمرے میں جاتے ہی سوگیا ہوگا یا کچھ دیر ٹی وی دیکھ رہا ہوگا یا کسی دوست سے فون پر بات کررہا ہوگا یا کچھ پڑھ رہا ہوگا یا انٹرنیٹ استعمال کررہا ہوگا۔

وہ اس کی اس ڈل اور روکھی پھیکی زندگی پر حیرت کے ساتھ اب افسوس بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ آغا جان کی وجہ سے کہیں نہیں جاتا تھا، اس کا اپنا سوشل سرکل یقیناً تھا مگر وہ اسے چھوڑے فرائض اور ذمہ داریوں میں الجھا رہتا تھا۔ آغا جان اس کے لئے صحیح آزردہ رہتے تھے۔

بہت ینگ ایج میں وہ، وہ زندگی گزار رہا تھا جیسی کوئی پچاس پچپن سال کی عمر میں بھی گزارنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ گھر، دفتر، کام، ذمہ داریاں اور صرف ذمہ داریاں، اس ایک جیسی روٹین والی لائف میں تفریح تو کہیں نظر ہی نہ آتی تھی۔

وہ آغا جان کے برابر والے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ آغا جان نے اسے بتایا تھا کہ پہلے ولی کا بیڈروم فرسٹ فلور پر تھا مگر ان کی طبیعت کے مسلسل خراب رہنے پر اس نے یہ برابر والا کمرہ اپنا بیڈروم بنا لیا تھا تاکہ رات میں کسی بھی وقت آغا جان کو ضرورت ہو تو وہ ان کی ایک آواز پر فوراً ان کے پاس آسکے۔

دروازہ پر آہستگی سے دستک دے کر اس نے خود کو پرسکون رہنے کی تلقین کی اسے کمرے میں اندر آنے کی اجازت دیتے غالباً اس کے ذہن میں کوئی اور تھا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو حیرت پھیلی اس نے اسے بتا دیا کہ اس وقت وہ اپنے کمرے میں کسی کی بھی آمد کی توقع کر سکتا تھا سوائے اس کے۔

"اگر تم بزی نہ ہو تو مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" اپنے اندر اعتماد اور جرأت پیدا کرتے وہ آہستگی سے بولی۔

اندر ہی اندر اس پر گھبراہٹ اور کچھ پریشانی طاری تھی مگر وہ اسے عیاں ہونے نہیں دے رہی تھی۔

وہ بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور کمرے میں کوئی میٹھی سی دھن بھی مدہم سروں میں بج رہی تھی۔

ٹانگیں سمیٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھا ریموٹ سے میوزک بند کیا اور ساتھ ہی اس سے بھی کہا، "بیٹھو۔" کتاب بند کر کے سائڈ میں رکھتے اُس نے فارہ کو دیکھا۔ اب اُس کے چہرے پر حیرت نہیں صرف سنجیدگی اور خاموشی تھی۔

اسے کیا کہنا ہے وہ بہت کچھ سوچ کر اور جملے مرتب کر کے آئی تھی مگر بات کا آغاز کرنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے ہمارے نکاح کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

یہ بات کہتے وہ اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہیں کر پائی تھی اس لئے نظریں دانستہ اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

وہ اس کے کچھ کہنے کی منتظر تھی، مگر وہ بالکل خاموش تھا اور خاموشی کا وقفہ بے حد طویل ہو گیا تھا۔

کیا وہ کمرے سے اٹھ کر چلا گیا، وہ یہاں پر اکیلی بیٹھی ہے، اس نے بوکھلا کر سر اوپر اٹھایا، وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری سنجیدگی کس جذبے کا اظہار کر رہی ہے، وہ سمجھ نہ پائی۔

"میں چاہتی ہوں، ہمارا رشتہ ختم نہ ہو۔ آغا جان کی اس رشتے میں اتنی خوشی ہے۔ کیا ان کی خوشی کی خاطر ہم اس رشتے کو نبھا نہیں سکتے؟"

وہ اس کی مسلسل خاموشی سے اپنا اعتماد کھونے لگی تھی۔

یہ کچھ تو بولے، الزامات ہی عائد کرے، برا بھلا ہی کہے، کچھ تو کہے۔

"میں جانتی ہوں، تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ میں نے ماضی میں ایسا کچھ کیا بھی نہیں جس کے بل بوتے پر مجھے اپنی اچھائی کا کوئی دعویٰ ہو۔ زرمینہ نے اسپتال میں مجھے جو کچھ کہا اگرچہ وہ بھی میرے گزشتہ اعمال کے مقابلے میں بہت کم ہی تھا، مگر تم نے مجھے اتنا بھی کچھ نہیں کہا مگر تمہارے

کچھ کہے بغیر بھی میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اس سے بھی زیادہ برا سمجھتے ہو، شاید مجھ سے نفرت بھی کرتے ہو۔

تم مجھے کیسا سمجھتے ہو، یہ اس بات سے واضح ہے کہ تم نے لاہور میرے پاس آ کر بجائے یہ کہنے کہ آغا جان شدید بیمار ہیں، مجھے دیکھنے کو ترپ رہے ہیں، لہٰذا میں تمہارے ساتھ چلوں، مجھے اپنے ساتھ لانے کے لئے ایک معاہدہ میرے سامنے رکھا۔

میں اپنی کسی بھی پچھلی برائی سے انکار نہیں کر رہی، جو غلطیاں میری ہیں، وہ میری ہی ہیں، انہیں کسی اور کے کھاتے میں ڈال کر میں خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی۔ میں نے زندگی میں اب تک جو کچھ غلط کیا مجھے اس کا احساس ہے اور میں اسے ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔ جو کاغذ تم نے مجھے دیا تھا وہ میں کب کا جلا کر ضائع کر چکی ہوں۔ میں اب یہاں سے کبھی بھی کہیں جانا نہیں چاہتی۔ میرے پاس میری کسی بدتمیزی، کسی بدسلوکی، کسی برے رویے کی کوئی توجیہ، کوئی جواز نہیں جو کچھ میں نے کیا وہ سب کا سب سراسر غلط تھا۔

پھر بھی اگر تم اعلیٰ ظرفی سے کام لے کر مجھے معاف کر سکو تو میں چاہتی ہوں یہ رشتہ جڑا رہے۔ اس رشتے سے میرے ڈیڈی اور تمہارے پاپا کی بہت سی خواہشات وامیدیں جڑی ہیں۔ اس رشتے سے آغا جان کی بے شمار خوشیاں وابستہ ہیں۔ اتنے دکھ دینے کے بعد میں اب انہیں مزید کوئی دکھ اپنی وجہ سے نہیں دے سکتی۔ کیا آغا جان کی خوشیوں کے لئے ہم دونوں پچھلی ہر بات بھلا کر اس رشتے کو نبھا نہیں سکتے؟''

ٹھہر ٹھہر کر بہت سنبھل کر اور محتاط ہو کر اس نے ایک ایک لفظ ڈرتے ڈرتے ادا کیا۔

اور جب کہہ چکی تب خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''آغا جان کی خوشی کے لئے اس رشتے کو نبھائیں؟'' وہ ایک پل بالکل خاموش رہا۔

اس پل بھر کی خاموشی کے بعد اس نے اس کے الفاظ بہت سکون اور سنجیدگی سے دُہرائے۔ وہ غصے، نفرت یا اشتعال میں نہیں بلکہ بہت پرسکون اور ہموار لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

''تمہاری غلطی پتہ ہے کیا ہے فارہ! تم نے ہمیشہ آغا جان کے ساتھ اپنے رشتے کو اس نکاح کے ساتھ ملا کر ایک ہی تناظر میں رکھا۔ یہی غلطی تم اب کر رہی ہو۔ تم نے ہمیشہ آغا جان کے ساتھ برے رویے بھی اسی لئے اختیار کئے کیونکہ تم اس رشتے سے ناخوش تھیں۔ آغا جان کے ساتھ تمہارا دادا پوتی کا رشتہ تو ایک بہت الگ رشتہ تھا فارہ!

آج اگر ہمارا رشتہ ختم ہو جائے تو کیا آغا جان سے، اس گھر سے، یہاں تک کہ مجھ سے بھی تمہارا ہر رشتہ ختم ہو جائے گا؟

تم دو الگ الگ چیزوں کو ساتھ کیوں ملاتی ہو۔ پہلے جب انہیں اپنے دادا کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہ تھیں، اس گھر میں آنے پر راضی نہ تھیں تو اس رشتے کو ختم کر دینے کا اعلان کرتی تھیں۔ آج جب آغا جان کی محبت قبول کر لی اور یہاں رہنے پر آمادہ بھی ہو گئیں تو تمہیں یہ کیوں لگتا ہے تمہارے یہاں رہنے کی شرط یہ نکاح اور اس کا قائم رہنا ہے؟''

اس نے کسی وضاحت کے لئے لب کھولنا چاہے مگر وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

''اب یہ موضوع چھڑا ہے تو پھر مجھے ساری بات کر لینے دو۔ تم اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو، پچھتا رہی ہو، اپنی غلطیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہتی

ہو یہ سب ٹھیک ہے لیکن ان غلطیوں کے ازالے کے لئے ایک ایسا رشتہ جسے کبھی تمہارے دل نے قبول نہ کیا کیوں نبھانا چاہتی ہو؟ شادی دلی خوشی کا نام ہے فارہ! کسی جبر اور زبردستی کا نہیں۔ ایک لڑکی جو میرے ساتھ اپنے رشتے کو قبول نہیں کرتی، میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، میں اسے ایک معاہدہ کر کے اپنے ساتھ لے آؤں۔ وہ بوڑھے بیمار دادا کو دیکھے گی، یہ جانے گی کہ دادا کی یہ حالت میرے سبب ہے تو بری طرح شرمندہ ہوتے اپنے انکار سے تائب ہوتی اس رشتے کو قبول کر لے گی؟ یہ تو بہت سستی جذباتیت بلکہ انتہا درجہ کی گھٹیا ترین حرکت ہے۔

اگر تم سے اس رشتے کو ایسے ہی کسی طرح منوانا میرا مقصد ہوتا تو اس گھٹیا ترین جذباتی ہتھکنڈے سے لاکھ گنا بہتر تھا کہ میں تمہیں تمہارے برسوں پہلے کے خوف کے عین مطابق گن پوائنٹ پر اغواء کر کے اپنے ساتھ لے آتا۔ تمہیں زبردستی اور جبراً اٹھا لانے میں پھر بھی شاید کچھ مردانگی، کچھ عزت اور کچھ وقار موجود ہوتا مگر آغا جان کی بیماری کو ہتھیار بنا کر تمہاری جذباتی کمزوری کا فائدہ اٹھانا اس سے پست حرکت تو میری نظر میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر اس نے پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

"میں نے زندگی میں اپنے مقام اور وقار سے نیچے اتر کر کبھی کوئی کام نہیں کیا فارہ! میں تمہیں یہاں اس لئے ہرگز ہرگز نہیں لایا تھا کہ آغا جان کی حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھ کر شرمندہ و نادم ہوتے تم مجھے قبول کر لو۔

آغا جان تم سے شدید محبت کرتے ہیں، یہ بات اب تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم ان کے پاس آ کر رہنے لگو ان کے بیٹے کی فیملی پھر سے ان کے پاس آ جائے یہ نجانے ان کی کتنے برسوں پرانی خواہش ہے۔

مگر جب یہ خواہش پوری ہونے کے بجائے انہیں لگا کہ تم ان سے اپنا ہر تعلق ختم کر دینا چاہتی ہو تب وہ شدید بیمار پڑ گئے۔ وہ تمہیں اپنے قریب رکھنے کے لئے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ وہ پوری پوری رات بے قراری سے روتے رہتے تھے، تب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی بھی طرح تمہیں ان کے پاس لے آؤں۔

میں نے اسی وقت Divorce (طلاق) دینے کے بجائے تین مہینے بعد کا وعدہ کیوں کیا اس لئے کہ تم نے Divorce (طلاق) کے ساتھ جائیداد میں حصے کا مطالبہ بھی کر رکھا تھا۔ تمہاری طرف سے یہ دونوں مطالبے ایک ساتھ کئے گئے تھے۔ تم یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ چاہتی تھیں۔

میں اپنا اور تمہارا رشتہ خاموشی سے ختم کر کے تمہیں یہاں لا سکتا تھا اور آغا جان کو یہ بات پتہ بھی نہ چلتی مگر جائیداد کی تقسیم خاموشی سے ہونے والا کام نہ تھا اور میں ایک مرتے ہوئے شخص کو یہ اذیت دینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی اولاد کے مابین ہر رشتے اور ہر تعلق کو اپنی آنکھوں سے ختم ہوتا دیکھے۔

جائیداد کی وہ تقسیم اس وقت اس انداز میں انہیں جائیداد کی نہیں بلکہ اپنے گھر اور اپنی اولاد کی تقسیم لگتی۔"

جائیداد کے نام پر جو تاثر اس کے چہرے پر پھیلا وہ اس تاثر کو بغور پڑھتا فوراً بولا۔

"ہاں، یہ بات میں اب جانتا ہوں کہ فارہ! کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ تمہارا نہیں تھا مگر تب میں یہی سمجھا کرتا تھا، اسی لئے تب میں نے

ان دونوں چیزوں کو کچھ مہینے بعد طے کرنے کا تم سے وعدہ کیا تھا اور میں نے تین مہینے ہی کیوں کہے تھے تو صرف اس لئے کہ مجھے تمہارے سامنے کوئی نہ کوئی ٹائم پیریڈ رکھنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فارہ! کہ اس وقت مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ آغا جان تین مہینے بعد زندہ ہوں گے بھی یا نہیں۔ تم نے ان کی وہ حالت نہیں دیکھی جو میں نے دیکھی ہے، تب مجھے کیا ان کے ڈاکٹرز تک کو ایسا لگا کرتا تھا کہ شاید اب وہ زیادہ جی نہ سکیں گے۔

تمہیں یہاں لاتے وقت میں بس یہ چاہتا تھا کہ اگر یہ آغا جان کا آخری وقت ہے تو مرنے سے پہلے تمہیں اپنے پاس دیکھ لیں۔ تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا دیں اور جو کچھ وہ ان برسوں میں تم سے کبھی کہہ نہ پائے وہ سب کہہ ڈالیں۔

اگر وہ ان کا آخری وقت تھا تو میں تمہیں اس آخری وقت میں ان کے قریب لا کر ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دینا چاہتا تھا فارہ!''

اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ پھیلا ہوا تھا۔ وہ اب کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے بجائے خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آغا جان اور تمہارے تعلقات میں رکاوٹ کا سبب ہمیشہ یہ نکاح ہی بنا۔ ان گزرے برسوں میں تم شاید کبھی ان کی محبت کو قبول کر ہی لیتیں مگر تمہیں یہ بات بھولتی نہیں کہ والہانہ محبتیں نچھاور کرتے اس دادا نے تمہیں ایک جبر کے رشتے میں باندھا ہے۔'' ولی نے بغور اسے دیکھتے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''میں تمہیں بہت سی باتوں کے لئے غلط سمجھتا ہوں لیکن جبراً قائم ہوئے اس رشتے سے انکار میں تم حق بجانب ہو۔

مر جانے والوں کی خواہشات پر زندہ لوگوں کو قربان کر ڈالنا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟'' جب یہ نکاح ہوا ہم اس روز سے پہلے کبھی ایک دوسرے سے ملے تک نہ تھے، ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔

میں شاید انکار کر دیتا مگر تب پاپا کے انتقال کو اتنے تھوڑے دن ہوئے تھے میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھا۔ مجھ سے بہروز پاپا نے اس رشتے کے لئے کہا اور میں ان لمحوں میں انہیں انکار نہیں کر پایا لیکن کچھ عرصہ میں جب میری ذہنی حالت بہتر ہوئی، میں پاپا کی موت کے صدمے سے باہر نکلا، میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ جبراً اس رشتے کو نہیں نبھاؤں گا۔ آغا جان کہتے تھے ابھی فارہ کی تعلیم مکمل ہونے دو، اس موضوع کو نہ چھیڑو، مگر میں نے ان سے بالکل واضح انداز میں کہہ دیا تھا کہ میں فارہ سے براہ راست بات کئے بغیر، اس سے اس کی مرضی جانے بغیر کبھی اس شادی کے لئے آمادہ نہیں ہوں گا۔

میں نے ایک بار تمہیں فون کر کے بھی یہی یقین دلانا چاہا تھا تم اس نکاح سے ڈسٹرب نہ ہو۔ تمہاری مرضی کے خلاف کبھی بھی کچھ نہیں ہوگا۔

کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ تم مجھ سے خائف رہتی ہو، تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہیں زبردستی اٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز تم سے بات نہ ہو سکی لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرنے لگا مجھ پر یہ بہت اچھی طرح واضح ہوتا چلا گیا کہ تم اس رشتے سے کس قدر بے زار اور نالاں ہو۔

میں جبر کے اس رشتے کو برقرار رکھنے کے کبھی بھی حق میں ہی نہ تھا مگر آغا جان کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں فارہ! وہ اس نکاح کو ختم کرتے اس لئے ڈرتے تھے۔ مجھے اس لئے روکتے تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ یہ رشتہ انہیں ان کے مرحوم بیٹے کی فیملی کے ساتھ جوڑ کر رکھ سکتا ہے۔

اس نکاح اور رخصتی کی خواہش میں ان کی صرف یہی غرض پوشیدہ تھی فارہ کہ اس طرح پھر تم ان کے قریب، ان کے پاس آ جاؤ گی۔

وہ اس رشتے کے ٹوٹنے سے ڈرتے تھے فارہ! انہیں لگتا تھا کہ اگر وہ رشتہ ٹوٹا تو شاید پھر تم ان سے اپنا ہر رشتہ توڑ ڈالو گی، ان سے کبھی ملو گی نہیں۔

لیکن یہ شادی ایسے ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تمہارے فائنل ایئر تک میں آغا جان کی وجہ سے مصلحتاً خاموش تھا مگر فائنل ایئر کے بعد میں خود تم سے یہ کہنے کے لئے تم سے ملنے آ رہا تھا کہ تمہاری مرضی نہیں ہے چنانچہ ہم اس رشتے کو باہمی خوشی ختم کر دیتے ہیں۔

لیکن یہ سب کہنے کے ساتھ میں تم سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ تم آغا جان کے ساتھ اپنے رشتے کو اس نکاح سے ہٹ کر دیکھو اور ان کے ساتھ اپنے رشتے کو قبول کر لو۔ ان کے دل کی خوشی کے لئے ایک بار یہاں ہمارے گھر ضرور آ جاؤ۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں تم سے آ کر علیحدگی اور طلاق کی بات کرتا تمہاری طرف سے یہ مطالبہ لڑائی جھگڑے اور جنگ وجدل کے ساتھ پیش ہو گیا۔

دو پڑھے لکھے لوگوں کے مابین جو ایک معاملہ خوش اسلوبی اور ڈیسینٹ طریقے سے حل ہو سکتا تھا، وہ انتہائی جاہلانہ انداز میں سامنے لایا گیا۔

طلاق جائیداد میں حصے کا مطالبہ، بات نہ کرنا، رابطہ رکھنا پسند نہ کرنا، ان سب کا آغا جان کیا مطلب لیتے یہی ناں کہ تم اس نکاح کو نہیں درحقیقت انہیں رد کر رہی ہو۔ ان سے قطع تعلقی کا اعلان کر رہی ہو۔ ان کی طبیعت کی اس درجہ خرابی کی وجہ بھی یہی بات تھی۔''

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا پھر اسی دھیمے لب و لہجے میں دوبارہ گویا ہوا۔

''یہ سب تفصیل میں نے تمہیں اس لئے بتائی ہے کہ تم سمجھ سکو کہ آغا جان کی خوشیوں کا تعلق تمہارے ان کے قریب ہونے، ان کے پاس آ کر رہنے سے ہے نہ کہ ہمارے نکاح یا رخصتی سے۔

وہ ہم سے کوئی قربانی نہیں صرف محبت مانگتے ہیں۔ ان کی خوشیاں ہم لوگوں کی خوشیوں میں پوشیدہ ہیں۔'' اس بار جیسے ہی وہ رکا وہ مضطرب سی ہو کر فوراً بولی۔

''لیکن اس رشتے میں ان کی خوشی تو تھی ناولی!''

''آغا جان کی خوشی تمہیں اپنے پاس دیکھنے میں ہے فارہ! تم یہاں ان کے پاس آ گئیں سب بدگمانیاں دور ہو گئیں۔ تم نے ان کی محبت کو پورے دل کے ساتھ قبول کر لیا تو تم خود دیکھ لو وہ کیسے صحت مند اور خوش نظر آنے لگے ہیں۔

اور اب جب کہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے تو پھر اب آغا جان کے رنجیدہ ہونے کے لئے کیا وجہ باقی بچی ہے۔''

''لیکن ولی! اگر ہم نے طلاق کی بات کی تو انہیں تکلیف تو پہنچے گی۔ کتنا بھی کچھ کہیں بہرحال اس نکاح سے ان کے دونوں بیٹوں کی یادیں ان کی آرزوئیں جڑی ہیں۔ کیا آغا جان کے دل کو دکھ نہیں ہو گا ہمارے اس رشتے کو ختم کرنے پر۔'' وہ پھر بے چینی اور اضطراب میں گھر کر بے ساختہ بولی۔

''آغا جان کے دل کو اس وقت زیادہ تکلیف اور دکھ پہنچے گا فارہ! جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی پوتی صرف ان کے دل کی خوشی کے لئے قربانی دے کر ایک سمجھوتے کی زندگی کا انتخاب کر رہی ہے۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

''ساری زندگی ساتھ گزارنے کے فیصلے کسی کے لئے اور کسی کی خاطر نہیں کئے جاتے۔ تمہاری شادی وہیں ہونا چاہئے جہاں تمہارے دل کی مرضی ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جو میرا ساتھ میرے لئے میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔ تم میرے تایا کی بیٹی ہو، میرے لئے ہمیشہ قابل احترام رہو گی۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں، اس غلط فہمی کو اپنے دل سے نکال دو۔ ہم اس رشتے کو خوش اسلوبی سے بغیر کسی جھگڑے اور فساد کے ختم کر دیں گے۔ تمہیں اس حوالے سے کسی بھی طرح کی ٹینشن لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں گارنٹی دے رہا ہوں کہ آغا جان نہ تم سے خفا ہوں گے نہ مجھ سے بلکہ وہ ہم دونوں کی خوشی میں مکمل طور پر خوشی اور راضی ہوتے ہنسی خوشی ہم دونوں کی وہاں شادیاں کروائیں گے جہاں ہم کرنا چاہئیں گے۔''

اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا اور اس کے کہنے کے لئے اس نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ اس نے اسے کمرے سے جانے کے لئے نہیں کہا تھا لیکن اب وہ یہاں بیٹھ کر کیا کرتی۔

وہ ساری بات ختم کر چکا تھا نہ الزامات عائد کئے، نہ برا بھلا کہا، وہ اس سے کیا کیا کچھ سننے کی امید لے کر آئی تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے گا، اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کرتا پتا نہیں اسے کیا کیا کچھ سنائے گا، کڑوی کسیلی باتیں کرے گا، اس سے نفرت کا اظہار کرے گا۔

''تم سے شادی کرلوں؟ تم ہو کیا چیز فارہ بہروز خان! کیا سمجھتی ہو خود کو مس ورلڈ، مس یونیورس، کہیں کی کوئی راج کماری، شہزادی اور میں تمہارا اونی غلام۔

تم کہو گی شادی نہیں کرنی، طلاق دے دو، میں دے دوں گا۔ تم کہو گی طلاق کا موڈ نہیں، چلو شادی کر لیتے ہیں، میں شادی کرلوں گا۔''

نفرت سے بولتا وہ اس کی اوقات یاد دلائے گا۔

''فارہ بہروز خان! تم جیسی گھٹیا لڑکی کو میں اپنی بیوی کی حیثیت دوں گا؟ یہ خوش فہمی تمہیں لاحق ہو کیونکر گئی کہ میں تمہیں اپنی بیوی کے مرتبے پر فائز کر دوں گا۔''

وہ یہ اور اس سے بھی زیادہ دل دکھاتے نفرتوں میں ڈوبے فقرے ولی کی جانب سے سننے کی امید لے کر آئی تھی۔

وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا، خوش شکل تھا، اچھے خاندان سے تھا، دولت مند تھا، اس میں کسی چیز کی کمی تھی جو وہ ایک ایسی لڑکی کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا جو زندگی بھر اسے ٹھکراتی آئی تھی۔

اس کی نفرت آج وہ اسے لوٹا سکتا تھا، لیکن ولی صہیب خان نے اس کے ساتھ نفرت کا رشتہ بھی نہیں رکھنا چاہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ کوئی بھی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ واقعی اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں تھا، وہ عنقریب اسے چھوڑ دینے والا تھا۔

جو ٹھنڈے، پرسکون، مہذب لہجے میں فاصلہ رکھتے ذاتیات کو درمیان میں لائے بغیر بات کرے اسے کیا کہیں گے۔

اس نے تو آپ کے ساتھ سرے سے کوئی رشتہ چاہے وہ نفرت اور دشمنی ہی کا کیوں نہ ہو، رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔

ڈیڈی کی آخری خواہش کا احترام ان کے قائم کردہ رشتے کی عزت، سعادت مند، فرمانبردار بیٹی کا فرض، وہ کیا کیا بلند عزائم لے کر اس

کے پاس آئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے طلاق کے مطالبے کو درست سمجھتا ہے۔

مردہ قدموں سے زینہ چڑھتے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چلا چلا کر روئے۔ شاید اس کی فرسٹریشن اسی طرح دور ہو پائے۔

وہ پوری رات شدتوں سے روتی رہی تھی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی تھی۔ اذان کی آواز کانوں میں پڑی تب وہ بستر سے اٹھ گئی۔ یہ اس کے ڈیڈی کا قائم کردہ رشتہ ہے، اسے ٹوٹتا دیکھنا اس کے لئے جسم سے روح نکال دینے والا عمل ہوگا۔ ٹوٹتا دیکھنا تو بہت دور کی بات اسے تو صرف یہ جان کر ہی کہ ولی نے اس کے اس رشتے کو توڑنے کا جو وعدہ اس سے کر رکھا تھا۔

وہ اپنے اس وعدے پر پوری طرح قائم بھی ہے اور عنقریب اسے توڑ بھی دینے والا ہے، اسے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی ہیں، نماز کے لئے سر پر دوپٹہ لپیٹے اس نے سوچا۔

"مجھے طلاق چاہئے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔" جائے نماز بچھاتے اس کے اپنے لفظ اس کے کانوں میں گونجے۔

پہلے وہ صرف یکم جنوری کی دوپہر کو بدلنا چاہتی تھی۔ آج ماضی کے کئی لمحے تھے جنہیں وہ بدلنا چاہتی تھی جنہیں وہ دوبارہ جینا چاہتی تھی۔

ولی کی فون کال...... اب وہ اس سے بات کرے گی، وہ اس کی بات سنے گی۔

زرینہ کی شادی کا کارڈ۔ اب ممی حقارت آمیز برتاؤ کریں، کارڈ ہاتھ میں نہ پکڑیں، وہ سامنے صوفے سے اٹھ کر ولی کے پاس آئے گی، اس سے کارڈ لے گی۔

ہاسپٹل کے داخلی دروازے پر وہ اس کا منتظر کھڑا ہے اور پیچھے کہیں معیز بھی موجود ہے اس کی سالگرہ کا دن منانے وہ معیز کے پاس بعد میں جائے گی پہلے ولی کی بات سنے گی۔

وہ بے وجہ تو نہیں آیا، یقیناً کچھ کہنے، کوئی بات کرنے آیا ہے، وہ معیز کے ساتھ ڈنر کر رہی ہے، ولی اسے اس کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر غصے سے اٹھ کر چلا گیا ہے۔

وہ اسی روز گھر آ کر اسے فون کرے گی، بتائے گی کہ معیز صرف اس کا دوست ہے، ڈیڈی کے انتقال کے بعد جب ممی کے بدلتے رویوں کے سبب وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی تب اس کے قریب معیز کے علاوہ اور ایسا کوئی نہیں تھا جس سے وہ دل کی باتیں کہہ سکتی، اس کے باقی سب دوست اس کے ہم عمر، امیچور لاابالی اور غیر سنجیدہ تھے جبکہ وہ اس سے سات سال بڑا تھا، میچور اور سمجھدار تھا۔

وہ آغا جان کے ساتھ اس کے رزلٹ کا سن لینے کے بعد آیا ہے، ممی تجمل ماموں اور معیز ڈرائنگ روم میں ان لوگوں سے اعلانیہ طلاق کا مطالبہ اور جھگڑا شروع کریں، اس سے پہلے وہ خود ڈرائنگ روم میں چلی جائے گی۔

ولی اس کی پڑھائی ختم ہو جانے ہی کا انتظار کر رہا تھا نا۔ آج یقیناً وہ خود اس کی علیحدگی ہی کی کوئی بات کرنے آیا ہے وہ اس کی ہر بات پورے دھیان اور توجہ سے سنے گی۔

کاش، ماضی کے ان لمحوں پر اب اسے اختیار مل جائے۔ کاش، کاش، ماضی کا المیہ یہی تو ہے کہ وہ یاد ہمیشہ رکھا جا سکتا ہے، بدلا کبھی نہیں جا سکتا۔

سنتوں کی ادائیگی کے بعد اس نے فرض کی نیت باندھی۔ وہ نماز یکسوئی سے نہیں پڑھ رہی تھی۔ نماز کے دوران آنے والے خیالات پر گرفت نہیں مگر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنا تو چاہیے۔ ذہن کو یکسو کرتے اس نے فرض ادا کیے۔

دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سمجھ میں نہ آیا، وہ اللہ سے کیا مانگے۔ زندگی کے پچھلے کئی برسوں سے وہ اللہ سے ولی صہیب خان سے نجات پانے کی دعا مانگتی آئی تھی آج کیا مانگے؟

''اب مجھے اس سے نجات نہیں اس کا ساتھ چاہیے؟''

''وہ سب بھلا کر مجھے اپنانے کے لئے تیار ہو جائے؟''

وہ پھر کبھی بھی مجھے چھوڑنے کی بات نہ کرے۔''

وہ دعا میں سوائے آنسو بہانے کے اللہ سے کچھ بھی نہ مانگ پائی۔ بہت دیر خاموش آنسو بہاتے رہنے کے بعد وہ جائے نماز پر سے اٹھی۔

''میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جو میرا ساتھ میرے لئے، میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔''

جائے نماز کارپٹ پر سے واپس اٹھاتے ہوئے اسے ولی کے الفاظ یاد آئے اور ان لفظوں کے ساتھ کچھ اپنے بھی مغروریت لئے لفظ خود پسندی و تکبر والی سوچیں۔

''اور اگر معیز کا ساتھ کسی سبب اسے نہ مل سکا، اس کے لئے دنیا میں آخری مرد ولی صہیب خان بچا تو وہ کنواری رہنے اور تنہا زندگی گزارنے کو اپنے لئے منتخب کرے گی۔'' وہ جائے نماز تہ کرنے لگی۔

''اس کی دنیا میں آنے والا پہلا مرد ولی صہیب خان ہے، اس کی دنیا میں آنے والا آخری مرد ولی صہیب خان ہوگا۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں میں سے بھی اسے کسی ایک کو چننے کو کہا جائے تو وہ اپنے لئے اسی کو چنے گی۔'' اس نے اپنے دل کی آواز سنی۔

جائے نماز تہ کرتے اس کے ہاتھ یک لخت ہی ساکت ہوئے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھتی وہ ایک دم ہی جائے نماز ہاتھ میں لئے لئے ہی کارپٹ پر گر سی گئی۔

''جو میرا ساتھ میرے لئے، میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔''

محبت کا کوئی Litmus Test نہیں ہوتا۔ کھرے کھرے ہاں یا ناں کا پتہ نہیں چلتا، بعض اوقات تو خود اپنی ہی کیفیات انسان بہت دیر بعد جا کر سمجھ پاتا ہے۔

وہ آج ساری رات کیوں روئی ہے، اس لئے کہ جس سے وہ محبت کے رشتے میں بندھ گئی ہے وہ اس سے ہر رشتہ توڑ دینے کی بات کہہ رہا ہے۔

وہ اسے اپنا یقین نہیں دلا سکی، اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکی اسی لئے مضطرب ہے، اس لئے بے قرار ہے۔

محبت؟ ولی صہیب خان سے؟ جس سے وہ نفرتوں کا اعلان کرتی آئی ہے اس سے؟ ہاں، ہاں اس سے۔ یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔

معیز سے اسے کبھی بھی محبت نہیں تھی اگر ہوتی تو وہ اس سے ملتی یا رابطہ چاہے نہ کرتی، اسے دل میں یاد ضرور کرتی۔

یہاں اس گھر میں آئے اسے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا اور ان ڈیڑھ مہینوں میں آغا جان، ممی اور ڈیڈی کے بعد جس چوتھے شخص کو اس نے ہمہ وقت سوچا، وہ صرف ولی صہیب خان تھا۔

یہ محبت تھی یا ان کے بیچ موجود مضبوط رشتے کی کشش، وہ تو ابھی یہ بھی نہیں سمجھ سکتی۔

لیکن وہ اتنا ضرور جانتی ہے کہ جب آغا جان اہسپتال داخل ہوئے تھے، جب اس نے اور ولی نے اہسپتال میں وہ رات ساتھ گزاری تھی، جب وہ کوریڈور کے آخری، اندھیرے میں ڈوبے حصے میں عبادت کر رہا تھا اور وہ چند انچوں کی دوری پر زمین پر بیٹھی اسے عبادت کرتا دیکھ رہی تھی تب اس اندھیرے میں ایک روشنی پھیلی تھی۔

وہ روشنی اسے ولی صہیب خان کا ظاہر، باطن سب دکھا رہی تھی، وہ روشنی اسے اس شخص کی محبت میں مبتلا کروا رہی تھی۔

اس رات کے، ان لمحوں کے بعد جب وہ اس کے پاس سے اٹھی تب سے آج تک گزرنے والے ہر لمحے میں وہ اس کے مخالف نہیں اس کی سمت، اس کی طرف جانے والے راستے پر بھاگ رہی تھی۔

محبت کی روشنی بکھیرتی اس رات کی اگلی صبح آغا جان کے گھر پر معیز اس کے سامنے کھڑا تھا اور ولی برابر میں، تو اسے معیز کی نہیں ولی کی پرواہ تھی۔

اسے معیز کا ولی کو گالی دینا برا لگا تھا۔

وہ اس سے پہلے معیز سے بالکل سکون سے بات کر رہی تھی لیکن ولی کے لئے اس کی اس بدکلامی کے بعد وہ یکدم بھڑک اٹھی تھی۔

آگہی کا یہ لمحہ، ادراک کا یہ پل بے حد قیمتی تھا۔ وہ اپنے دل میں اس شخص کے لئے محبت پا رہی تھی جو کہہ رہا تھا وہ صرف اس سے شادی کرے گا جو اس کی محبت میں اس تک آئے گی، جو کسی کے لئے اور کسی کی خاطر نہیں صرف اس کے لئے اس کی خاطر اس سے رشتہ باندھے گی۔

وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اپنی زبان سے، اپنے عمل سے، ہر طرح اس نے ہمیشہ ولی کو یہی بات سمجھائی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ولی صہیب خان کو نہیں، صرف معیز تجمل کو شامل کرنا چاہتی ہے پھر آج اگر وہ جا کر اس سے محبت کا اقرار کرے تو کیا وہ اس کا یقین کرے گا؟

اسے معیز سے محبت نہیں، ولی سے محبت ہے، وہ چیخ چیخ کر بھی ولی کو بتائے گی وہ تب بھی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ بے شمار بار، بے حساب بار وہ اپنے لفظوں اور رویوں سے سب کچھ اس کے برعکس ثابت کر کے دکھا چکی ہے۔

اپنے راستے میں یہ کانٹے اس نے خود بچھائے تھے، وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔

وہ جھوٹی اور منافق لڑکی نہیں تھی، یہ اس میں شاید واحد خوبی تھی۔ اس میں اتنی جرأت تھی کہ جس سے نفرت کرتی ہو اس سے نفرت کا اظہار کر سکے اور جس سے محبت کرتی ہو اس سے محبت کا اقرار کر سکے۔

مگر جس سے وہ ہزاروں بار نفرت کا اظہار کر چکی ہے، اب یہ کیسے کہے کہ "میری آن واحد میں دل کی دنیا ہی بدل گئی، میں پوری کی پوری بدل گئی۔"

محبت کے ہونے کا ادراک پا کر رونا، یہ بھی شاید صرف فارہ بہروز خان ہی کی طرح زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑنے والے لوگوں ہی کے نصیب میں ہوتا ہے۔

محبت پانا، محبت کرنا، وہ ان سب سے بھی پہلے ادراک و آگاہی کے اس پہلے ہی لمحے میں شکست کھاتی بری طرح رو رہی تھی۔

✿✿✿

''آپ اچھی بیوی نہ بن سکیں، میں اچھی بیٹی نہ بن سکی۔ میں نے اپنا یہ گناہ قبول کر لیا، آپ کب کریں گی؟''

وہ ان دنوں اپنے گناہوں کو یاد کرنے اور قبول کرنے کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ بیٹی نے ایک سوال ان کے آگے رکھا تھا اور وہ اس کا جواب تلاشتی اپنے پورے ماضی کو دُہرا رہی تھیں۔

''کیا کوئی شخص ایک ہی وقت میں اپنے تمام رشتوں کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا؟ کیا محبت کے لئے اللہ نے ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی سی جگہ رکھی ہے؟

''ہم ایک وقت میں اپنے تمام قریب ترین اور عزیز ترین رشتوں سے ایک جیسی محبت کر ہی نہیں سکتے۔''

کیوں نہیں کر سکتے۔ بالکل کر سکتے ہیں۔ اچھا شوہر، برا بیٹا ہو گا اور اچھا بیٹا بہت برا شوہر، یہ کہاں لکھا تھا، یہ کس نے کہا تھا؟

اس شخص محمد بختیار خان سے انہیں پرخاش تھی کیا؟ یہ نفرت، یہ دشمنی تھی کن بنیادوں پر؟ اس شخص سے برسرِ پیکار نفرت کے جس مضبوط قلعے میں وہ برسوں سے مقید تھیں، ان کی بنیادیں کھڑی کسی چیز پر تھیں کس جذبے پر تھیں۔

ایک آواز ابھر رہی تھی ان کے اندر سے، صرف ایک آواز، حسد، حسد اور صرف حسد۔ وہ اس بوڑھے کمزور انسان سے حسد کرتی تھیں، روزِ اول سے کرتی تھیں۔ اپنی شادی شدہ زندگی کے پہلے روز سے کرتی تھیں۔

ماں باپ کو چھوڑ کر، ان کے دلوں کو دکھا کر، انہیں ناراض کر کے سمجھیں کہ ہم خوش رہ لیں گے تو حقیقت میں ایسا ہوا نہیں کرتا۔

ہمارے ہر گناہ، ہر غلطی کی سزا ہمیں روزِ آخرت، جزا و سزا کے دن ملے گی، مگر ماں باپ کی نافرمانی وہ واحد گناہ ہے جس کی سزا آخرت کے ساتھ ہم اس دنیا میں بھی دل کی بے سکونی اور بے اطمینانی کی صورت پاتے ہیں اور ساری زندگی پاتے رہتے ہیں۔

ان کی محبت میں اپنے باپ کو، بھائی کو، اپنے گھر کو، چھوڑ کر آنے والا ان کا وہ محبوب شوہر راتوں کو سوتے سوتے بے قراری سے اٹھ کر کیوں بیٹھ جایا کرتا تھا۔

اکثر ان کے ساتھ باتیں کرتے، مسکراتے، وہ یک لخت چپ کیوں ہو جایا کرتا تھا، کبھی بہت کھلکھلا کر ہنستے یک دم ہی اس کی آنکھوں میں اداسیاں کیوں چھا جاتی تھیں۔

شادی کے پانچ سالوں بعد بہت منتوں مرادوں کے بعد وہ بیٹی پیدا ہوئی، جس کے پیدا ہونے سے پہلے وہ اتنے پُرجوش، اتنے خوش تھے تو اسے پہلی بار دیکھنے، گود میں اٹھانے پر بجائے مسکراہٹ کے ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں اُمڈ آئے تھے۔

اس پل کس کی کمی محسوس کی تھی انہوں نے اپنی زندگی میں؟ صرف اس پل نہیں زندگی کے ہر لمحے میں، ہر خوشی کے موقع پر، ہر کامیابی کی منزل طے کرنے پر۔

شاہانہ ٹھاٹ، باٹ، عیش و آرام، دولت کی فراوانی چھوڑ کر آنے والے اس شخص نے اپنی اور ان کی وہ دنیا جو بنائی تھی۔ محنت کر کے، اپنے زور بازو پر بھروسہ کر کے، اس محنت کے بعد ملازمت میں ترقیاں مل رہی ہیں تو لبوں پر تو مسکراہٹ ہے مگر آنکھوں میں درد پھیلا ہوا ہے۔ بہت محنت و جدو جہد کے بعد اپنا ذاتی گھر تعمیر کیا ہے تو اس میں پہلا قدم رکھتے چہرے پر خوشی نہیں دکھ رقم ہیں۔

بیٹی کی پہلی سالگرہ، اس کے اسکول کا پہلا دن، اس کی پہلی تعلیمی کامیابی، ان کی زندگی کی ہر خوشی پر اداسیوں کے رنگ چھائے رہتے۔ ان محبت کرنے والے میاں بیوی کے بیچ ان کی شادی شدہ زندگی کے پہلے دن سے ایک شخص موجود تھا۔

وہ شخص جوان کے شوہر کو کبھی سچے دل سے ہنسنے اور خوش ہونے نہیں دیتا تھا۔ جب وہ دونوں تنہا ہوتے، ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہوتے، تب کہیں سے وہ ایک شخص اچانک ان کے بیچ آ کھڑا ہوتا۔

اس کی آمد کی خبر انہیں شوہر کے چہرے پر پھیلتی اداسیاں دیا کرتیں، اس کی آنکھوں میں بکھرتا درد دیا کرتا۔

باپ، بھائی، گھر ان سب کو چھوڑ آنے والا وہ شخص درحقیقت ان سب کو اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔

تب نہیں مگر آج جانتی تھیں کہ وہ اس گھر، اس کے در و دیوار اور وہاں بستے ایک ایک فرد سے حسد میں مبتلا تھیں۔ وہ سب ان کے شوہر کی زندگی میں موجود نہ ہوتے اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھے۔

اور ان سب میں وہ سب سے زیادہ حسد کرتی تھیں اس انسان سے جوان کے شوہر کا باپ تھا، جس کی یادوں میں جب ان کا شوہر کھوتا تو انہیں تو کیا خود اپنے آپ تک کو بھول جایا کرتا تھا۔

وہ ان میاں بیوی کی تنہائیوں میں شامل تھا، وہ ان کی خلوتوں میں شامل تھا، وہ ان کی مسکراہٹوں میں شامل تھا، وہ ان کی خوشیوں میں شامل تھا، وہ ان کی زندگی کے ہر لمحے اور ہر پل میں شامل تھا۔

وہ اسے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دینا چاہتی تھیں، مگر وہ ایسا کبھی نہیں کر سکیں۔ وہ اس ان دیکھے، ان جانے شخص سے جلن، حسد اور رقابت میں مبتلا تھیں جو شوہر کے ساتھ بتائے ان کی زندگی کے تیئیس برسوں میں کبھی ان سے نہ ملا مگر وہ ہر پل، ہر آن اپنی موجودگی کا، اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہا۔

وہ بھائی کی موت پر اپنے گھر تیئیس برس بعد گیا تو انہیں اس کے بھائی کی موت کا غم نہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ تیئیس برسوں تک ان کے شوہر کے دل پر حکمرانی کرتے وہ سب لوگ پھر اس کی زندگی کا حصہ بن جانے والے ہیں۔

جب وہ نہیں تھے، تب تھے، تو اب تو وہ ہوں گے، اب تو وہ واقعی پس منظر میں چلی جائیں گی۔

وہ شوہر کو اب کبھی نظر نہیں آئیں گی، شوہر انہیں فراموش کر دے گا۔

حاسد کسی بھی دوسرے انسان سے زیادہ سب سے زیادہ اپنے ہی آپ کو نقصان پہنچایا کرتا ہے، انہوں نے بھی یہی کیا۔

یہ نہ سوچا، یہ نہ سمجھا کہ دن کے کچھ گھنٹے باپ کے اور دوسرے خونی رشتوں کے ساتھ گزارنے کے بعد جب وہ ان کے پاس آئیں گے تو پورے کے پورے ان کے ہو کر آئیں گے۔

ان کی تنہائیوں میں پھر کوئی تیسرا شامل نہیں ہوگا۔ پہلے شوہر ان کے ساتھ ہوتا تھا مگر پورا کا پورا ان کیساتھ نہیں ہوتا تھا، اس کے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ کہیں اور ہوتا تھا۔

اگر وہ حاسد نہ ہوتیں، سمجھدار اور عقل مند ہوتیں تو سمجھداری ہی کا فیصلہ کرتیں، شوہر کی محبت کو ہنسی خوشی اس کے باپ کے ساتھ بانٹ لیتیں۔

یہی غلطی تھی ان کی، یہی قصور تھا ان کا اور یہی گناہ تھا ان کا۔ شوہر کا بھائی مرا ہے، اسے تسلی نہیں دی، ہمدردی و محبت کے دو بول نہ بولے۔ اس کے باپ کو احترام سے سلام تک نہ کیا، شوہر سے، اس کے باپ سے، اس گھر کے ہر فرد سے روٹھ کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

اس پہلے سے غمزدہ و شکست خوردہ اپنے شریکِ حیات کو اپنی ذات سے کوئی راحت، کوئی تسکین دینے کے بجائے، مزید دکھ، مزید پریشانیاں، مزید الجھنیں دیں۔

گناہوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، غلطیوں کی نہ ختم ہونے والی فہرست تھی۔

وہ کتنا اچھا انسان تھا، کتنا سچا، کتنا باوفا کتنا محبت کرنے والا اور وہ اپنے حسد کی آگ میں جلتی اسے اس کی موت سے قبل کتنی اذیتوں سے دوچار کر گئی تھیں۔

ان دنوں ان کی زندگی کے پچھلے تیس سال ان کے سامنے بکھرے پڑے رہتے تھے اور وہ ان ماہ و سال کے رنج والم، درد وغم، پچھتاوے، دکھ، ملال، غلطیاں، گناہ ہر ایک چیز دیکھتی شمار کرتی جارہی تھیں۔

ان کا دل شاید سیاہ ہو گیا تھا شاید پتھر کا ہو گیا تھا تب ہی تو اس پر کچھ بھی اثر ہوتا نہیں تھا مگر فارہ کا فون، اس کی باتیں، انہیں یوں لگا جیسے اس پتھر کو کسی نے یک دم ہی ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا۔

فارہ رو رہی تھی اور اس کی باتیں سنتی وہ بھی بے آواز رو پڑی تھیں۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی اور یہ روتے ہوئے سن رہی تھیں۔

''جب وہ اپنی زندگی کے آخری بارہ گھنٹے جی رہا تھا تو اس کی بیوی ناراض ہو کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھی۔

اس کی منتظر نگاہیں پلٹ پلٹ کر دروازے کی طرف بھی جارہی تھیں۔ ابھی اس دروازے سے شاید اس کی بیوی آجائے، تمہاری وفا کا ثبوت میرے پاس ہمارے ساتھ گزارے تیس سال ہیں۔

اس کی بیوی اور بیٹی اس پر اعتبار کرتی ہیں، اس کا یقین کرتی ہیں، اس کی محبت کو دل کی گہرائیوں سے مانتی ہیں، وہ سننا چاہتا تھا، وہ دیکھنا چاہتا تھا اس لئے کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔''

فارہ روتے ہوئے فون بند کر چکی تھی اور وہ روتے ہوئے ریسیور ساتھ ہاتھ میں لئے زمین پر گرتی چلی گئی تھیں۔

کئی روز وہ اسپتال داخل رہی تھیں، کئی روز وہ شدید بیمار رہی تھیں مگر انہوں نے اپنی بہن کو فارہ کو اطلاع دینے سے سختی سے روک دیا تھا۔
وہ اس سے روٹھ کر ان دنوں سات سمندر پار بیٹھی ہیں۔

وہ ویزا اور دوسری قانونی مشکلات کے سبب ان کے پاس آنہ سکے گی تو وہاں اکیلی نجانے کس قدر پریشان ہوگی۔ اسپتال سے آئے بھی اب انہیں کافی دن ہو چکے تھے مگر ابھی بھی وہ سارا وقت بستر پر لیٹ کر اپنے کمرے میں بند گزارا کرتی تھیں۔

شوہر کے ساتھ بتایا ہر پل ان دنوں ان کے سامنے آرہا تھا اور اس ہر پل کا اختتام آخر میں ایک ہی پچھتاوے پر ہوتا تھا۔

''وہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس سے روٹھ کر دور کیوں ہوئیں؟'' ان پچھتاوؤں سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا۔

وہ روز قیامت شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی؟ جو اس کے ساتھ روا رکھا وہ سلوک ہی کم نہ تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ۔

اس شخص سے حسد کرتی تھیں اس لئے اس کی محبت قبول نہ کرتی تھیں، حسد، بغض و کینہ، خود کے دل میں تھا اور الزام اس پر لگاتی تھیں۔

وہ دکھی انسان کسی سے کیا چھیننے آتا تھا؟ وہ تو فقط محبتیں بانٹنے، چاہتیں برسانے ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ حسد کو نفرت کے پردوں میں چھپا کر وہ واقعی اندھی ہوگئی تھیں۔

برے سے برا اور غلط سے غلط کام کرتے بھی انہیں نہ افسوس ہوتا تھا، نہ شرمندگی، نہ ملال نہ پچھتاوا۔

وہ اپنی پوتی سے نہیں ملے گا، اسے جلدی جلدی فون بھی نہیں کرے گا، یہ پابندی اس پر لگائی تو وہ بغیر اختلاف کے ان کی بات مانتا یوں ہی کرنے لگا، ہاں ان سے رابطہ کر کے بہت جلدی جلدی اپنی پوتی اور ان کی خیریت پوچھا کرتا۔

وہ جواباً کس طرح بات کرتیں۔ یہ ایک الگ گناہ تھا، پوتی کو وہ ہر ماہ خرچے کے لئے دی جانے والی رقم سے ہٹ کر خود کچھ نہیں دے سکتے۔ ان پر یہ پابندی لگائی تو وہ اسے بھی مانتے۔ پوتی اور ان دونوں کے لئے تحائف کبھی ولی کے ہاتھ، کبھی کسی ملازم سے کبھی کسی اور ذریعے سے ان ہی کو بھجوا دیا کرتے کہ وہ خود اسے یہ سب دے دیں۔

بیٹی کے دل پر دادا کی چاہتیں والفتیں کہیں اثر نہ کر جائیں اس خوف سے وہ، وہ تحائف کبھی اسے دیا ہی نہ کرتیں، اکثر اپنی کسی بھانجی بھتیجی یا بھتیجوں یا بھانجوں کو دے دیا کرتیں۔

اگر کبھی اس کے لئے آئی کوئی چیز اسے دیتیں بھی تو یہ کہہ کر کہ یہ میں تمہارے لئے بازار سے خرید لائی تھی یا ماموں نے تمہارے لئے لی ہے یا ممانی نے دی ہے، یا خالہ نے بھجوائی ہے۔

اس کے لئے آئی بہت قیمتی چیزیں تو اسے دیا ہی نہ کرتیں کہ کہیں اسے شک نہ ہو جائے کہ بے وجہ اور بے موقع ماموں یا خالہ قیمتی تحفہ نہیں دے سکتے اس کے لئے برسوں سے آتے قیمتی قلم، پرفیوم، ڈیزائنر ہینڈ بیگز، سوئٹرز، شالیں، ملبوسات، امپورٹڈ جیولری و کاسمیٹکس۔

سونے کی کئی زنجیریں، انگوٹھیاں، بالیاں، بریسلٹ یہاں تک کہ بہت مہنگا موبائل بالکل نئے ماڈل کا لیپ ٹاپ اور ڈیجیٹل کیمرہ تک بھی ان کی بیٹی نہیں کوئی بھتیجا یا بھتیجی یا بھانجی یا بھانجا استعمال کیا کرتے۔

بے حد فخر و ناز سے پھوپھا یا خالہ کا قیمتی تحفہ جان کر اسے قبول کرتے ہوئے۔ ان کے حسد نے کسی اور کے ساتھ تو کیا انہیں ان کی بیٹی تک کے ساتھ مخلص نہ رہنے دیا۔

وہ اس سے جھوٹ بولتی تھیں، وہ اس سے غلط بیانیاں کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی دادا کا بھجوایا پیسہ بہت سنبھل کر، بڑی احتیاط سے اور صرف خاص خاص ضرورتوں کے لئے استعمال کرتی اور وہ اس پیسے کو پانی کی طرح بہاتیں۔ ان کے پرس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا اور وہ اپنے بھائی بہن کی سب سے واری بہن، بھاوج کی سب سے چہیتی نند، بھتیجوں بھتیجیوں کی سب سے اچھی سب سے پیاری پھوپھو اور بھانجے بھانجیوں کی سب سے لاڈلی خالہ بنی رہتیں۔

حسد میں پاگل ہوتے انہوں نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اگر محمد بختیار خان کا مالی تعاون مسلسل ان کے ساتھ نہ ہوتا تو شوہر کی وفات کے بعد وہ اور ان کی بیٹی کہاں کھڑی ہوتیں۔

اس جواں عمری کی موت کے بعد ان کا شوہر جو چھوڑ کر ان کے لئے گیا وہ کسی عیش پرستی و شاہ خرچی کا تو کیا ایک عام و متوسط درجہ کی زندگی گزارنے کے لئے بھی ناکافی تھا۔

وہ اس باحیثیت خاندان کی بہو نہ ہوتیں، اپنے سسرال کی انہیں مکمل مالی سپورٹ حاصل نہ ہوتی پھر دیکھتیں کہ کونسا بھائی کونسی بہن، کونسی بھاوج، کونسا بھانجا اور کونسا بھتیجا انہیں پوچھ رہا ہے۔

اپنی بیٹی کو تنہا چھوڑ کر جس بہن کے پاس بہت اترا کر غرور سے وہ کینیڈا آئی تھیں کہ بہن نے بڑی چاہت سے انہیں اپنے پاس بلایا تھا۔ اگر وہ شخص انہیں اپنی بہو نہ مانتا، اپنی دولت سے انہیں بے تحاشا نہ نوازتا، تو بھی کیا یہ بہن اتنی ہی محبت سے انہیں پاس بلاتی؟ ڈھائی مہینے سے وہ یہاں رہ رہی ہیں۔ کیا وہ رہ پاتیں۔

محمد بختیار خان کو اذیتیں دینے پر کمر بستہ، وہ تو اپنی ہی بیٹی کی زندگی اجاڑنے چلی تھیں۔ مائیں بیٹیوں کا گھر بسانے کی فکر کرتی ہیں اور وہ اجاڑنے کا سوچا کرتی تھیں، اس کی بسی بسائی زندگی اجاڑ دینے کے درپے تھیں۔

جسے بیٹی کے لئے باپ نے چنا تھا، وہ خونی رشتوں کا احترام کرتا تھا، ان کی عزت اور ان سے پیار کرتا تھا

اور جسے انہوں نے بیٹی کے لئے چنا، وہ ایک مادہ پرست لالچی اور سطحی انسان تھا۔

کیا وہ جانتی نہ تھیں کہ معیز کو فارہ سے شادی پر کیا چیز اکساتی ہے، فارہ ناتجربہ کار دنا سمجھ ہے مگر وہ ایک عمر کے تجربات اور اتنی زندگی گزارنے کے بعد کیا انسانوں کو پہچاننے کے قابل نہ ہو سکی تھیں؟

وہ جانتی تھیں۔ وہ بالکل جانتی تھیں کہ اپنا کیریئر بنا لینے اور زندگی میں ہر طرح اسٹیبلش ہو جانے کے باوجود ان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہینڈسم، بہترین کیریئر رکھنے والا اور دیگر بے شمار ظاہری خوبیوں کا مرقع بھتیجا اپنے لئے موجود کئی کنواری غیر شادی شدہ لڑکیوں کے بہترین رشتوں کو چھوڑ کر ان کی نکاح شدہ بیٹی سے شادی کا کیوں خواہش مند تھا۔

خوبی فارہ میں نہیں اسے وراثت میں ملنے والی کروڑوں کی دولت، جائیداد میں تھی۔ وہ جائیداد کا مطالبہ بھی خلع کے ساتھ ہی کر دیں، انہیں یہ مشورہ دینے والا ہی معیز تھا۔

جو شادیاں لالچ میں کی جاتی ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے، کیا وہ جانتی نہ تھیں؟

بس ولی صہیب خان نہ ہو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔ وہ ان کی بیٹی سے محبت کرے یا نہیں اس کے ساتھ مخلص ہو یا نہیں۔

آج جب اپنے گناہ شمار کر رہی تھیں تو روتے ہوئے اپنے مرحوم شوہر کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ وہ جاتے جاتے بیٹی کو نکاح جیسے مضبوط رشتے میں باندھ گیا۔

اگر وہ اس روز فارہ کا نکاح نہ کرتے، صرف زبانی بات طے کرتے یا منگنی ہی کر دیتے تو وہ کب کی وہ منگنی کی انگوٹھی ولی صہیب خان محمد بختیار کے منہ پر مار کر فارہ کی معیز کے ساتھ خوب دھوم دھام سے شادی کروا چکی ہوتیں۔

یہ ان کی بیٹی کے باپ اور دادا کی دعائیں اور ان کے درست فیصلے ہی تھے جو وہ اپنے تمام تر حسد ونفرت اور انتقام کی آگ میں پاگل ہو جانے کے باوجود بیٹی کی زندگی کو کسی بڑے سانحے سے دو چار نہ کر پائی تھیں۔

جوان بیٹی کو دنیا کے رحم وکرم پر بالکل تنہا چھوڑ کر خود یہاں ایک دوسرے ملک آ بیٹھیں، ایسا کرتے نہ دل کانپا نہ وجود پر لرزش طاری ہوئی۔

آج وہ ان کے کیے کا بھگتان بھگت رہی ہے، ان کی پیدا کردہ مشکلات میں گھری زندگی گزار رہی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کیسے معافی مانگیں؟ وہ تو ان سے روٹھ کر دور دیس جا بسا ہے۔

''میں نے اپنا گناہ قبول کر لیا، آپ کب کریں گی؟ اس زندگی میں کر لیں۔ ابھی وہ بوڑھا انسان زندہ ہے۔ ابھی ہم اپنے گناہوں کی اس سے معافی مانگ سکتے ہیں۔''

کئی ہفتوں سے متواتر بیٹی کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے مگر وہ خود میں اتنا حوصلہ تو پیدا کر پاتیں کہ اس کا سامنا کر سکیں، اس سے معافی مانگ سکیں۔

اس صبح کانپتے ہاتھوں سے وہ محمد بختیار خان کے گھر کا فون نمبر ملا رہی تھیں۔ کسی ملازم نے فون اٹھایا تھا اور انہوں نے بیٹی کے بجائے سسر سے بات کرنا چاہی تھی۔

''ہیلو روحی بیٹا! یہ تم ہو؟'' ان کی سماعتوں سے وہ بوڑھی نحیف آواز ٹکرائی تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''آغا جان، مجھے معاف کر دیں۔''

انہیں اس احترام والے لقب سے انہوں نے زندگی میں پہلی بار مخاطب کیا تھا، ورنہ گفتگو بغیر کسی لقب کے صرف آپ سے شروع ہوا کرتی تھی۔ وہ کیا بولیں، ان سے کچھ بولا ہی نہ جا رہا تھا۔

گناہ اتنے تھے، وہ کس کس کا اعتراف کریں، کس کس کی معافی مانگیں۔ ''روحی بیٹا تم!'' ان کا محبت میں ڈوبا لہجہ انہیں ندامتوں کی عمیق گہرائیوں میں دھکیلنے لگا، ان پر جیسے کوئی کوڑے برسا رہا تھا۔

''میرے گناہوں کی گٹھڑی بہت وزنی ہے آغا جان! بہت وزنی۔ آپ سے اپنے کس کس قصور کی معافی مانگوں؟ چاہتی تو یہ ہوں کہ آپ کے پاس آ کر آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں۔

میں تو آپ کے سامنے آ کر کھڑے ہونے کی جرأت بھی خود میں نہیں پاتی۔'' وہ رو رہی تھیں۔

''اپنوں میں رنجشیں، گلے، شکوے، لڑائیاں سب کچھ ہو جایا کرتا ہے بیٹا! انہیں یاد رکھنا اور دل سے لگانا نہیں بھول جانا چاہئے۔ تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا میرے لئے یہی بہت ہے۔ تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، میں تم سے خفا نہیں۔ بس اب سب کچھ بھول کر یہاں آ جاؤ۔''

یہ اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی انہیں مزید کچھ اور ندامتوں کے سمندر میں دھنسا گئی۔

''میں آپ کے پاس آؤں گی آغا جان! ضرور آؤں گی۔ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی، مگر مجھے کچھ وقت دے دیں۔''

''میں ولی کو بھیجوں تمہارے پاس یا کہو تو فارہ کو، تم ان کے ساتھ۔'' وہ ان کی شرمندگی و پشیمانی اور تذبذب کو دیکھ کر بے اختیار بولے۔

''نہیں کسی کو نہیں۔ آپ وعدہ کریں مجھے لینے کسی کو نہیں بھیجیں گے۔ واپسی کا یہ سفر میں خود طے کروں گی۔ اس بار آپ نہیں میں آپ کے پاس آؤں گی۔ بس مجھے کچھ مہلت، کچھ وقت دے دیں۔'' پھر انہوں نے فارہ سے بات کروانے کی درخواست کی۔

''السلام علیکم ممی!'' وہ شاید وہیں کہیں پاس ہی موجود تھی، تب ہی تو لائن پر اگلے ہی پل وہ موجود تھی۔

''فارہ! دیکھنا آغا جان مجھے لینے کسی کو نہ بھیجیں، ورنہ میں پستیوں میں کچھ اور دھنس جاؤں گی انہیں ایسا مت کرنے دینا فارہ! میں کوشش کر رہی ہوں، تم دعا کرو میں خود میں جلد اتنا حوصلہ اور ہمت جمع کر پاؤں کہ یہاں تم سب کے پاس آ سکوں۔'' وہ اس سے روتے ہوئے بولیں۔

''تم مجھے بہت یاد آ رہی ہو بیٹا! میں جلد تمہارے پاس آؤں گی۔'' وہ خاموشی سے ان کی آواز سن رہی تھی۔

اس روز اس نے بہت کچھ کہا تھا شاید آج وہ صرف انہیں بولنے کا موقع دے رہی تھی۔

''فارہ! معیز تمہارے قابل نہیں۔ جو میں نے چنا، وہ غلط جو تمہارے ڈیڈی نے چنا وہ صحیح تھا۔'' اپنے آنسوؤں پر قابو پانے وہ دھیمی آواز میں بولیں۔ ''نفرتوں کو انتہاؤں تک لے جانے میں، میں نے کوئی کمی نہیں رکھی لیکن اگر ولی ابھی بھی اس رشتے کے لئے راضی ہو جاتا ہے تو تم اس رشتے کے لئے فوراً ہاں کر دینا فارہ! جو اپنے والدین اور اپنے خونی رشتوں کے ساتھ مخلص ہے، وہ دنیا کے ہر رشتے کے ساتھ مخلص ہو گا۔'' وہ ولی سے کہنا چاہتی تھیں کہ ان کے گناہوں کی سزا وہ ان کی بیٹی کو نہ دے، وہ معصوم ہے، وہ بے قصور ہے، وہ بہت بچی، بہت اچھی ہے۔ وہ اسے اپنا لے، اپنا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا رہنے دے، انہیں چاہے کبھی معاف نہ کرے، ان سے چاہے کبھی نہ ملے، کوئی رابطہ، کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہ رکھے۔

مگر اس سے یہ سب کہنے کا وہ منہ کہاں سے لاتیں؟ ان کا منہ نہیں تھا اس سے کچھ بھی کہنے کا۔ اب بس صرف دعاؤں پر انہیں بھروسہ تھا، صرف دعاؤں پر ماں کی دعا، اس کی اولاد کے حق میں جو اللہ رد نہیں کرتا۔

❁❁❁

وہ آغا جان کو روتا دیکھ کر ان کے پاس آگئی تھی اور یہ جان کر کہ یہ فون اس کی ماں کا ہے وہ ان کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

ماں کیا کہہ رہی ہے، اسے پتہ نہیں تھا مگر جواب میں آغا جان کیا کہہ رہے تھے، وہ سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے۔

محبت جیت گئی تھی۔

مگر محبت کی جیت کے ان انمول اور یادگار لمحوں میں جب وہ پورے دل سے خوش ہو رہی تھی، خوشی و مسرت کے آنسو برسا رہی تھی تب ماں کی اس آخری بات نے اسے یاد دلایا تھا کہ خوشی اس کے حصے میں اب زندگی بھر کبھی بھی پوری آ نہیں سکتی۔

وہ جانتی تھی ولی کتنا بھی متحمل مزاج اور بظاہر غصہ اور ضد کرنے والا نہ لگتا ہو مگر وہ اسے کبھی بھی دل سے معاف نہیں کر سکتا۔

''آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے۔ آج سے لے کر اکتیس مارچ تک تمہیں وہاں ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اگر تم ایسا کرنے پر آمادہ ہو تو یکم اپریل کو جو تم چاہو وہ تمہیں مل جائے گا۔ تمہاری تسلی کے لئے آج پہلی اور آخری بار تمہیں یقین دہانی کروا رہا ہوں کہ تین مہینے سے اگلا ایک دن بھی تمہیں نہ یہاں رہنا پڑے گا اور نہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو جوڑے رکھنا پڑے گا اور میں اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں۔''

اور وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں۔ تین مہینے بعد وہ یہاں رہنا چاہئے گی یا یہاں سے جانا چاہے گی، یہ اس کی ذاتی مرضی ہے۔ اس میں وہ مداخلت نہیں کرے گا کہ اس بات سے آغا جان بھی وابستہ ہیں مگر تین مہینے بعد وہ اسے چھوڑ دے گا۔ یہ ایک طے شدہ بات تھی۔

آغا جان، ان کا بیٹا بہروز خان، پوتیاں فارہ اور زرینہ سب غصے کے تیز، ضدی، جذباتی اور انا پرست لوگ تھے، جبکہ ان کا دوسرا بیٹا صہیب خان اور اس کا بیٹا ولی ٹھنڈے مزاج کے، صبر و برداشت والے، متحمل و نرم طبیعت لوگ تھے۔

مگر اس نرمی، برداشت اور تحمل کے باوجود وہ تھے تو اسی خاندان سے جو ضد اور انا ان سب میں تھی وہ ان میں کیوں نہ ہوتی۔ وہ ولی سے جس رات بات کر کے آئی تھی، اسے گزرے چودہ دن ہو چکے تھے۔

یہ مارچ کی بارہ تاریخ تھی۔ وہ جانتی تھی Count Down شروع ہو چکا ہے۔ آج صرف انیس دن باقی بچے ہیں کل اٹھارہ پھر سترہ پھر سولہ۔

اس کی نگاہ کیلنڈر پر جاتی تو وہ اسے دیکھ کر مسکراتا۔

''فارہ بہروز خان! وقت کو روک سکتی ہو تو روک لو۔''

ولی سے اس رات بات کر کے آنے کے بعد اس رات کی صبح اس سے محبت کا ادراک پانے کے بعد سے وہ ہر پل وقت کے رک جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔

اس رات سے آج تک تمام دنوں میں وہ سارا دن آغا جان کے ساتھ مصنوعی قہقہے لگاتی اور رات میں بستر میں منہ چھپا کر بے آواز رویا کرتی۔

جس سے اسے محبت ہے وہ اسے معاف کیوں نہیں کر دیتا!

✿✿✿

ان کی بہو نے ایک عمر گزارنے کے بعد آخر کار ان کی محبت کو تسلیم کرلیا' محبت کی جیت کی یہ سرشاری ایسی تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش اور مطمئن نظر آنے لگے۔

اب انہیں اٹھانے بٹھانے کے لئے سہارا دینے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ باتھ روم خود چلے جاتے تھے' کسی کسی وقت ہمت ہوتی تو آہستہ آہستہ چلتے اس کے پاس کچن میں آ جایا کرتے، وہ کام کرتی رہتی، وہ کچھ دیر کچن ٹیبل پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہتے پھر تھکنے لگتے تو واپس اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

ولی صبح یا کبھی کبھی شام کے وقت انہیں تھوڑی بہت چہل قدمی بھی کروانے لگا تھا۔

کبھی ان کی طبیعت میں کوئی تھوڑی بہت خرابی ہوتی، کوئی دوا سوٹ نہ کر رہی ہوتی، کسی کا کوئی سائیڈ افیکٹ ہونے لگتا تو فارہ ان کی دواؤں میں معمولی سی ردوبدل، مقدار میں کمی یا تبدیلی کر دیا کرتی۔

ہاں ایسا وہ ہمیشہ ڈاکٹر نثار سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد کیا کرتی۔ آغا جان اسے چھیڑنے کو مذاقاً کہتے کہ ان کی تیمارداری کے بہانے وہ ایک سینئر ڈاکٹر کی زیر نگرانی اپنے تجربات اور قابلیت کو بڑھانے میں مگن ہے۔

ان دنوں ان کے ساتھ ہنسنا بھی کتنا دشوار عمل لگا کرتا تھا مگر وہ اپنے کسی بھی انداز سے اپنی کوئی ٹینشن اور الجھن ان پر ظاہر کیا نہ کرتی تھی۔

زرمینہ کے ساتھ بھی اس کا محبت بھرا تعلق مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

اس حد تک کہ ان دنوں جب وہ اپنی پڑھائی کی شدید نوعیت کی مصروفیات و پریشانیوں میں گھری تھی تب اس کی ٹینشن کو کچھ کم کرنے اور پڑھنے کا بھرپور موقع فراہم کرنے کو وہ عشنا اور حذیفہ دونوں کو ڈرائیور کے ساتھ جا کر یہاں لے آتی تھی۔

اس نے تو یونہی فون پر فارہ سے عائشہ آنٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی مصروفیات اور پڑھائی کے لئے مناسب وقت نہ ملنے اور اسائمنٹس وغیرہ کی تاریخوں کا ذکر کر ڈالا تھا مگر فارہ، آغا جان کو سب بتا کر اسی روز اس کے گھر جا پہنچی تھی۔ عباد گھر پر نہ تھا اور زرمینہ اس کی اجازت کے بغیر اس طرح بچوں کو اس کے ساتھ بھیجتے ہچکچا رہی تھی۔

عباد ناراض ہوں گے فارہ! انہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ میں اپنی روزمرہ کی چھوٹی موٹی مشکلات کے حل کے لئے اپنے میکے کی طرف دوڑوں۔"

"میں عشنا اور حذیفہ کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ عائشہ آنٹی آئیں گی تو یہ واپس آ جائیں گے۔ تم ان کے یونیفارم، اسکول بیگز وغیرہ سب چیزیں جلدی سے میرے سپرد کرو اور پانچ چھ دنوں کے لئے ان کے کپڑے بھی۔ تب تک میں عباد بھائی سے فون پر بات کر رہی ہوں۔" یہ بھی بہت پہلے کا قصہ تھا جب اسے عباد کو عباد بھائی کہنا زبردستی کا رشتہ جوڑنا لگا تھا۔

"عباد بھائی! کیا عشنا اور حذیفہ میرے کچھ نہیں لگتے؟" اس نے زرمینہ ہی کے گھر سے عباد کا موبائل نمبر ملایا اور سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی بولی۔

''ہائیں! تم نے یہ پوچھنے کے لئے مجھے زندگی میں پہلی بار فون کال کی ہے؟'' وہ اس کے انداز پر حیران بھی ہوا اور محظوظ بھی۔

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میرا ان دونوں کے ساتھ کوئی معمولی سا بھی رشتہ ہے تو مجھے یہ اجازت دیجئے کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جب تک عائشہ آنٹی کراچی سے واپس نہیں آ جاتیں اس وقت تک کے لئے۔''

''اس پورے جملے میں اجازت کا لفظ زبردستی گھسایا ہوا لگ رہا ہے اس لئے کہ آپ کا انداز مکمل طور پر دھونس و دھمکی دینے والا ہے۔''

''چلیں، میں اس لفظ کو کیا اپنے جملے ہی کو بدل لیتی ہوں۔ میں عشنا اور حذیفہ کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔''

''ہاں یہ انداز فارہ بہروز خان کو زیادہ سوٹ کرتا ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا بھی تھا۔

جواباً وہ بھی بے ساختہ مسکرائی تھی اور ان کی باتیں خاموشی سے سنتی زرینہ بھی۔ یوں وہ بچے آج کل اپنی ننھیال میں رہ رہے تھے۔

صبح وہ دونوں یہیں سے اسکول جاتے، وہ انہیں تیار کروا کر ڈرائیور کے ساتھ روانہ کرتی کہ ولی آفس آغا جان کے ساتھ ناشتہ کر لینے اور ان کے ساتھ کچھ دیر باتیں کر لینے کے بعد ذرا تاخیر سے جایا کرتا تھا۔

اس کے بعد باقی کا سارا دن پھر وہ دونوں آغا جان اور فارہ کے ساتھ بھرپور شرارتیں کرتے اور کھیلتے کودتے گزارتے۔

شام میں ماموں کے گھر واپسی پر باہر گھما کر لانے اور آئس کریم کھلانے کی فرمائش ہوتی جو ہر بار ہی پوری کی جاتی۔

آغا جان کے ساتھ باتیں کرتے وقت کے سوا اگر کسی وقت ولی کے چہرے کی دبیز سنجیدگی بے تحاشا مسکراہٹ اور والہانہ ہنسی میں بدلتی تو صرف اپنے بھانجی، بھانجا کے لئے۔

رات اس نے دیکھا تھا کہ حذیفہ اس کے ساتھ ریسلنگ کر رہا تھا، اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھا وہ اس کے کندھے ایک، دو تین، کی گنتی کرتے کارپیٹ سے لگانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اور ریفری کے فرائض انجام دیتی عشنا بھی کچھ دیر بعد اس کے کندھے پر جھولتی نجانے کون کونسی داستانیں فراٹے سے اسے سنانے میں مگن تھی۔

اس کے ساتھ آئس کریم کھانے کے لئے جانے والی عشنا واپسی میں اپنی باربی کے لئے سائیکل، ڈریسنگ ٹیبل، کچھ نئے کپڑے، جیولری اور سینڈلز خرید کر لائی تھی۔

اور حذیفہ درجن بھر چھوٹے سائز کی سپورٹس کارز، جن کا مقصد و مصرف محض اتنا ہوتا تھا کہ پھر فراغت کے اوقات میں میکینکل انجینئر صاحب ان کے ٹائر اور دیگر سارے پرزہ جات الگ الگ کر کے کسی نئی ایجاد و دریافت میں کوشاں ہو جاتے تھے۔

بہن کو باربی کا گھر سجانے سے فرصت نہ تھی اور بھائی کو گاڑیاں توڑنے سے۔ ان بچوں کے ہونے سے گھر میں بے حد رونق اور ہنگامہ تھا۔

اب وہ تینوں کھانا کھاتے تو وہاں آغا جان کی باتیں اور ان دونوں کی سنجیدگی جیسا کوئی ماحول نہ ہوتا تھا۔

آج شاید ان دونوں کے یہاں قیام کا آخری دن تھا کہ عائشہ آنٹی کی آمد آج متوقع تھی۔ آج جمعہ کا دن بھی تھا۔ کئی ماہ کی بیماری کے بعد آج آغا جان کا جمعہ کی نماز مسجد میں جا کر ادا کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ گھر پر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور جمعہ کے دن جب وہ مسجد نہ جا پاتے تھے اور مسجد سے جمعہ کے خطبہ اور اذانوں کی آوازیں آیا کرتیں تو وہ بے قرار سے ہو اٹھتے تھے۔

آج مسجد جانے کا پروگرام انہوں نے رات ولی کے ساتھ طے کر لیا تھا اور وہ انہیں مسجد لے جانے حسب وعدہ نماز کے وقت سے کافی پہلے گھر پر موجود تھا۔

وہ اس وقت نہانے اور جمعہ کا بھرپور اہتمام کرنے میں مصروف تھے۔ ساتھ ساتھ فارہ کو یہ بھی بتاتے جا رہے تھے کہ انہوں نے ہمیشہ جمعہ کی نماز کا اہتمام بھی بالکل عید کی نماز کی طرح کیا ہے اور جب اس کی دادی زندہ تھیں تو وہ انہیں اور اپنے دونوں بیٹوں کو جمعہ کی تیاری میں خوب مدد کرواتی تھیں۔

وہ اتنے مہینوں بعد مسجد جانے کی ایکسائٹمنٹ میں بے حد خوش تھے۔ وہ آغا جان کی پرجوش تیاریوں کو دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

حذیفہ اس سے ضد کر کے اپنا بھی لباس تبدیل کروا چکا تھا۔ کلف لگے کڑھائی ہوئے شلوار قمیص اور سواتی ٹوپی کے ساتھ غالباً اس کا بھی نماز کے لئے جانے کا ارادہ تھا۔

عشنا نے بھی جمعہ کے احترام میں سیلولیس ہی سہی قمیص شلوار اور دوپٹہ منتخب کر کے پہن لیا تھا۔

مگر اس بھرپور تیاری اور اہتمام کے بعد جب وہ دونوں بہن بھائی اسے کمپیوٹر پر ساتھ بیٹھ کر Lion King کھیلتے نظر آئے تو پتہ چلا احترام سارا ہو چکا، اب اپنا کام ہو رہا ہے۔

ولی آغا جان کو گاڑی میں بٹھا کر مسجد لے گیا تھا۔ وہاں سے واپس آ کر وہ تھکے ہوئے نہیں بلکہ بے حد خوش اور ایکٹو سے تھے۔ انہی کی فرمائش پر فارہ نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوایا۔

ایک طویل عرصہ بعد وہ اپنے گھر کے اس کمرے میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر گھر کے سربراہ کی وہ خصوصی کرسی آج ایک بار پھر ان کے وجود سے سج جانے والی تھی۔ فارہ نے آج ان کے لئے لنچ بھی تھوڑا اہتمام والا بنایا تھا اور باقی سب کا کھانا بنایا تو صدو نے تھا مگر میٹھے میں گاجر کا حلوہ فارہ ہی نے بنایا تھا۔

خوب محنت سے اور تمام تر لوازمات اس میں شامل کر کے۔ کھویا' میوے' ابلے انڈے' چاندی کے ورق اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔

آغا جان اتنے دنوں بعد مسجد گئے تھے تو ان کے پاس سنانے کے لئے کئی قصے تھے۔ وہ وہاں پانچ وقت کے جتنے پکے اور باقاعدہ نمازی تھے تو سب سے دوستیاں بھی خوب تھیں۔

اب وہ خوشی خوشی بتا رہے تھے کہ مسجد میں ان کے دیرینہ دوستوں اور ساتھیوں نے آج ان کا استقبال کس والہانہ گرم جوشی سے کیا ہے۔

وہ زرمینہ کے بیٹے کو انسان بنانے کی کوششوں کے ساتھ ان کی باتیں بھی پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔

اس کی پلیٹ میں چاول ڈالنے کے بعد اس نے اسے دھمکی دے دی تھی کہ اگر لنچ کے بعد وہ کمپیوٹر پر گیم کھیلنا چاہتا ہے اور شام میں اس کے ساتھ پارک بھی جانا چاہتا ہے تو بغیر کوئی سڑا ہوا منہ بنائے یہ پلیٹ خالی کر دے۔

ولی آغا جان کے برابر دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھا تھا جب کہ وہ عشنا اور حذیفہ کے ساتھ۔ اس کے سامنے والی کرسی پر، اپنی پلیٹ میں موجود کھانا ختم کر کے ولی، میز پر رکھے پھل اٹھا کر آغا جان کے لئے کاٹنے لگا۔

وہ بے چارے حسرت بھری نگاہوں سے گاجر کے حلوے کو دیکھتے صبر شکر کر کے پھل کھا رہے تھے۔ کبھی کبھار کی بداحتیاطی میں فارہ کوئی حرج نہ سمجھتی تھی۔

ایک شخص پورا اور مکمل پرہیز کرتا ہے اگر کبھی کبھی کچھ بداحتیاطی کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بہر حال وہ ایک زندہ جیتا جاگتا انسان ہے، آپ اس پر اللہ کی ہر نعمت بند نہیں کر سکتے۔

مگر ولی ان کے سخت پرہیز کا قائل تھا، فارہ اس سے ''میں ڈاکٹر ہوں یا تم'' کہہ کر کوئی بحث نہیں کر سکتی تھی سو خاموش رہی۔

ولی نے خود بھی آغا جان کے ساتھ پھل ہی کھائے تھے، گاجر کے حلوے کا ایک چمچہ بھی نہ کھایا تھا۔

کھانے کے اختتام پر شادی کے کسی بلاوے کا ذکر ہونے لگا۔ وہ کچھ کچھ رشتے داروں کو جاننے تو لگی تھی مگر بہت اچھی طرح سب سے ابھی بھی واقف نہ ہو سکی تھی۔

ہفتہ بھر پہلے وہاں سے شادی کا کارڈ آیا تھا اور اب آغا جان اسے یاد دلا رہے تھے کہ یہ شادی ان کے کسی رشتے سے لگتے نواسے کی ہے اور ولی، زرینہ اور فارہ نجانے اس بندے کے کس رشتے کے کزنز ہیں۔

آغا جان تو شادی کی تقریب میں ظاہر ہے شرکت نہ کر سکتے تھے کہ اتنی دیر بیٹھنا ان کے لئے ناممکن تھا مگر انہوں نے فارہ سے کہا تھا کہ ولی کے ساتھ وہ اس شادی میں شرکت کرے۔

وہ اس فیملی کی فرد ہے تو اسے سب کی خوشی اور غم میں بھی فیملی کے افراد ہی کی طرح شریک ہونا چاہئے۔

❂❂❂

وہ ولی کے ساتھ شادی کی تقریب میں جا رہی تھی۔ وہ بالکل خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی بالکل خاموش اور سنجیدہ ہی تھی۔

وہ حیران ہوتی تھی اس شخص کے سیلف کنٹرول پر۔ اسے خود پر، اپنے جذبات پر کتنا قابو تھا۔ اب تو خیر اسے اس سے بات کئے بہت دن ہو چکے تھے مگر جس رات وہ اس سے بات کر کے گئی، اس کی اگلی صبح اس نے ولی کو اتنا ہی نارمل اور پرسکون دیکھا تھا جیسے روز دیکھتی تھی۔

یہاں تک کہ اس نے فارہ سے بھی بالکل روزانہ والے انداز میں ''آغا جان کا بی پی چیک کر لو، میں ان کی دوائیں لے آیا تھا، دیکھ لو صحیح ہیں؛'' وغیرہ جیسی روٹین کی باتیں تک کی تھیں۔

کوئی اور تو کیا ان دونوں کے ساتھ صبح شام رہتے آغا جان تک ان دونوں کے مابین کوئی غیر معمولی انداز یا ماحول بھانپ نہ پائے تھے۔

ولی کا یہ لاتعلق و بے نیاز سا انداز اسے نفرت اور غصے سے کہیں بڑھ کر انسلٹنگ لگتا۔ وہ تو اسے اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ اس پر کوئی طنز ہی کر دے، معیز کے حوالے سے کوئی چبھتی بات کوئی طنزیہ فقرہ ہی کہہ دے۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ ولی سے کہے۔

”تم مجھ پر چیخ چلا لو ہر برا لفظ بول دو، اپنا سارا غصہ نکال لو مگر پلیز یہ لاتعلقی اور بے گانگی کی مار مجھے مت مارو۔ یہ طنز، تمسخر، غصہ اور نفرت سے کہیں زیادہ کڑی ہے۔“

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، کوئی میوزک تک نہ بج رہا تھا۔ وہ شاید میوزک، اجنبیوں کے ساتھ انجوائے کرنا پسند نہیں کیا کرتا تھا۔

اس نے اسٹیئرنگ پر جمے اس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کو دیکھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا، وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنے ہاتھ رکھے اور کہے۔

”ولی! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ پلیز پچھلی ہر بات بھلا کر مجھے صرف ایک موقع دے دو۔“

وہ یہ سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ محبت کے اظہار میں پہل کرتے اسے کوئی عار نہ تھی مگر اپنی جرأت اور صاف گوئی کا وہ آج سے پہلے بے شمار بار اتنے منفی انداز میں نفرت کے اظہار میں استعمال کر چکی تھی کہ آج اس کی محبت کا یقین کرتا کون؟ کاش جتنی اس میں جرات ہے، اتنی ہی عقل بھی ہوتی تو آج وہ یہ دن نہ دیکھ رہی ہوتی۔

وہ دونوں شادی کی تقریب میں پہنچے تو ان کے ساتھ ساتھ ہی زرمینہ اور عباد کی گاڑی بھی آ کر رکی۔

ان لوگوں کو دیکھ کر فارہ اور ولی ادھر ہی آ گئے۔

”تم اور لالہ گاڑی سے اترتے شاندار لگ رہے تھے۔“ عائشہ آنٹی اور عباد کو سلام کرنے بعد وہ زرمینہ کی طرف بڑھی تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر آہستگی اور محبت سے بولی۔

اس کی آہستہ آواز میں کہی بات عائشہ آنٹی کے بلند اور مخصوص نوعیت کے قہقہوں میں مزید دب گئی تھی۔

شکر تھا کہ اس کی آواز دب گئی، ورنہ اس کے اس جملے پر سب اس کا ردعمل اس کے چہرے پر پڑھنا چاہتے۔

اس نے پھر زرمینہ کی طرف دیکھا اس نے کوئی جواب طلب بات نہ کہی تھی، صرف اپنی ایک رائے ایک فیلنگ اس سے شیئر کی تھی، وہ ابھی بھی مسکراتی نگاہوں سے فارہ کو دیکھ رہی تھی۔

پتہ نہیں زرمینہ نے کس چیز اور کس بات سے یہ رائے قائم کی تھی کہ ان دونوں کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔

اگر وہ ان دونوں کی شادی میں ساتھ آنے کی وجہ سے ایسا سمجھ رہی تھی تو یہ صرف اس کی خوش فہمی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ زرمینہ کو کیسے بتاتی کہ اپنی طرف کھلتے خوشیوں اور محبتوں کے در اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیے ہیں، وہ یہاں پشاور ولی صہیب خان کے ساتھ ساری زندگی گزارنے نہیں بلکہ زندگی کے فقط تین مہینے گزارنے آئی تھی اور ان تین مہینوں کے اختتام پر وہ اسے اس کی حسب خواہش و فرمائش اپنے نام سے آزادی کا پروانہ دے دے گا۔

وہ یہاں ایک معاہدہ کر کے آئی تھی اور اب اپنی کہی کسی بھی بات سے وہ مکر نہیں سکتی، اسے بھلا نہیں سکتی اگر چاہے تو بھی نہیں۔

❁❁❁

ایک دم ہی اسے اتنی وحشت نے گھیرا کہ وہ اپنے پورشن سے نکل کر سیدھی آغا جان کے کمرے میں آ گئی۔

دوپہر کے کھانے کے وہ لیٹتے تھے مگر اب عصر کا وقت ہونے والا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ نماز کی تیاری کے لئے جاگ چکے ہوں گے۔

وہ پچھلے دنوں میں بے شمار بار آغا جان کے پاس یہ مسئلہ لانے کا سوچ چکی تھی مگر ہر بار جب اپنی کیم جنوری کی وہ حرکت یاد آتی اس کے اٹھتے قدم بے اختیار رک جاتے۔

یہ بات انہیں بتانے کے لئے حوصلہ کتنا چاہئے تھا۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی شدید بیماری کا سن کر، سب کچھ بھلا کر یہاں آ گئی تھی، اگر انہیں حقیقت پتہ چل گئی تو انہیں کس قدر دکھ ہوگا۔

وہ ان کا مان توڑنے کا خود میں حوصلہ کہاں سے لاتی؟ مگر اس وقت وہ ان کے پاس آنے سے خود کو روک نہ پائی۔ دن پر دن گزر رہے ہیں۔ کیا وہ خاموشی سے اس رشتے کو ختم ہو جانے دے گی۔ ولی کے پاس پھر جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''آغا جان!''۔

''آؤ میری جان!'' وہ بستر سے اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''آغا جان! میں آپ سے اپنے اور ولی کے رشتے کے بارے میں.....'' انہوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بولنے نہ دیا۔

''تمہیں اس رشتے کے متعلق کوئی ٹینشن کی ضرورت نہیں ہے جان عزیز! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ جو تمہاری خوشی ہے وہی میری بھی خوشی ہے۔''

وہ اس موضوع پر بات کرنے ہی کو آمادہ نہ تھے۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے کہ وہ صرف ان کی صحت کی طرف سے متفکر ہوتی اس رشتے کو کسی انجام تک پہنچائے جانے سے ڈر رہی ہے۔

آخر وہ آغا جان سے کہے گی کیا اور کیسے؟ اور ولی؟ کیا فائدہ آغا جان کو اس رشتے کے قائم رکھنے کے حوالے سے اپنا ہمنوا بنا لے تو وہ حکم کے غلاموں کی طرح عاجزی سے اس کی پسند اور خواہش پر سر جھکا دے گا۔ یوں آغا جان کا سہارا لے کر، ان کے ذریعے اپنی بات منوانے کی کوشش کر کے تو وہ خود کو اس کی نظروں میں مزید اپنی چلانے اور من مانی کرنے والی ضدی وخودسر لڑکی ثابت کر دے گی۔

اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ وہ آغا جان سے اس معاملے میں کسی بھی طرح مدد نہیں لے سکتی۔

ان سے مدد مانگنے کا صرف ایک معقول طریقہ ہے کہ آپ انہیں الف سے بے تک سب کچھ بتا دیں اور اتنی ہمت وہ خود میں ہرگز نہیں پاتی تھی۔

✿ ✿ ✿
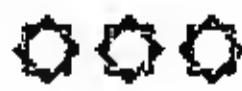
یہ اس روز سے دو دن بعد کی بات تھی جب ولی آفس سے واپسی میں کچھ دیر سے بھی آیا اور ساتھ کچھ شاپنگ بھی کر کے لایا۔

چند ایک چیزیں تو آغا جان کے لئے اور گھر کے لئے تھیں مگر شاپنگ کا بنیادی مقصد عباد اور زرینہ کی شادی کی سالگرہ کا تحفہ خرید کر لانا تھا۔

ان دونوں کے لئے خریدا گیا قیمتی تحفہ وہ آغا جان کو دکھانے لگا۔ انہوں نے تحفے کو کافی پسند کیا۔

فارہ پہلے سے جانتی تھی کہ وہ زرمینہ کی ویڈنگ اینورسری آنے والی ہے۔ آغا جان کئی روز پہلے سے یہ بات بتا چکے تھے اور یہ بھی کہ بچوں کی سالگرہ تو وہاں منائی ہی بہت دھوم دھڑ کے سے جاتی ہے اور یہاں سے اس میں شرکت بھی بھرپور ہوتی ہے۔

مگر زرمینہ اور عباد کی شادی کی سالگرہ پر بھی ہر سال یہاں سے ولی اور آغا جان کی طرف سے ان دونوں کے لئے ایک مشترکہ تحفہ جایا کرتا ہے۔

جب تحفہ سب گھر والوں کی طرف سے مشترکہ دیا جارہا تھا تو وہ بھی اسی گھر کا حصہ تھی، اس لئے اس کے الگ سے کچھ تحفہ دینے کی تک بنتی نہیں تھی۔

ہاں اس نے تب ہی آغا جان سے زرمینہ کی شادی کی سالگرہ کا تذکرہ سننے کے بعد ہی ضرور طے کر لیا تھا کہ وہ تحفے کے ساتھ وہاں لے جانے کے لئے ایک اچھا سا کیک ضرور بیک کرے گی۔

اس کا خیال تھا کہ ولی اسے چلنے کے لئے نہیں کہے گا مگر وہ واقعی کوئی چیپ اور تھرڈ کلاس جذباتی حرکتیں نہیں کیا کرتا تھا۔

اگلی شام جب وہ آفس سے گھر آ گیا تو آغا جان سے دعا سلام اور خیر و عافیت کے بعد اس سے بولا۔

''زرمینہ کے گھر چلوگی؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اسی غیر جذباتی و لاتعلقی سی ٹون میں بولا۔

''آٹھ بجے تک چلیں گے، تیار ہو جانا۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا، ان دونوں کا آپس کا یہ رشتہ نہ بھی رہے تب بھی وہ اس گھر کی فرد اور اس کی تایا کی بیٹی تو رہے گی اور وہ ثابت کر کے دکھا رہا تھا کہ وہ سب کچھ کتنی خوش اسلوبی اور ہلکی خوشی انجام دلوا دینے والا ہے۔

اس کے غیر جذباتی، سنجیدہ اور شائستہ انداز کے جواب میں خود بھی اسے رویے کا مظاہرہ کرتی سنجیدگی سے سر ہلا گئی۔

آٹھ بجنے میں بھی کچھ منٹ تھے جب وہ تیار ہو چکی تھی۔ چاکلیٹ کیک وہ دوپہر ہی میں تیار کر کے فریج میں رکھ چکی تھی۔ اس نے زرمینہ ہی کا کچھ روز پہلے تحفے میں دیا بلیو اور گرے رنگوں کے امتزاج والا سوٹ پہنا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد لپ اسٹک آئی لائنر اور مسکارے کے ساتھ تیاری کو مکمل کرتے وہ گرے اور بلیو شیشوں اور دھاگوں کے کام سے آراستہ دوپٹے کو سر پر لیتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹی تو خود ہی چونک سی گئی۔ بالکل زرمینہ ہی کے سے انداز میں ہر وقت دوپٹہ سر پر لئے رکھنا اس کی کب سے عادت بن گیا تھا اسے خود احساس نہیں ہو سکا تھا۔

ابتداً خاندان کے افراد کی آغا جان کی عیادت کے لئے آمد کے دوران ان کی مہمان نوازی و میزبانی کے دوران اس نے قصداً ایسا کرنا شروع کیا تھا مگر یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس وقت وہ کسی شعوری کوشش کے بغیر خود بخود ایسا کر گئی۔

اسے خود پر تعجب بھی ہوا اور اچھا بھی لگا۔ ان دونوں کی وہاں آمد جیسے ایک متوقع بات تھی۔

زرمینہ تو جیسے بے صبری سے میکے سے کسی کی آمد کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اسے اور عباد کو تحفہ دینے سے قبل ولی بچوں کو ان کے لئے لائی گئی چاکلیٹس دینے لگا۔

''ننھیال کے اس غیر ضروری لاڈ پیار نے میرے بچوں کا ستیاناس کر دیا۔'' عباد نے ایک سرد آہ بھری۔

''میں نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اب آئندہ باربی کے کپڑے، جوتے، زیورات، گھر کا آرائشی سامان، ان کا جم، بیوٹی سیلون وغیرہ وغیرہ کچھ خرید کر نہ دوں گا مگر میری سختی اثر کیا ہونا تھا، ماموں جان جو بگاڑنے کو موجود ہیں۔

وہاں سے ایسی بھرپور شہ لے کر آئی ہیں کہ اب مجھ سے فرمائش ہے انہیں باربی کا دولہا معہ اس کی مکمل وارڈ روب کے فراہم کیا جائے۔''

ولی اس کے شکوؤں پر دھیان دیے بغیر عائشہ آنٹی کی طرف متوجہ ہوا تو عباد فارہ سے کہنے لگا۔

''میری بہن! مجھے کنجوس مکھی چوس اور کوئی ظالم باپ نہ سمجھ لینا۔ مگر اس چھٹانک بھر کی باربی کے نخروں کی کوئی حد تو ہو۔ پہلی بار بڑی خوش خوشی خود بیٹی صاحبہ کے لیے وہ آفت کی پرکالہ خرید کر لایا تھا۔ کیا معلوم تھا گھر میں بیٹی کو باربی لا کر دینا گھر میں ہاتھی رکھ لینے کے مترادف ہے۔ گڑیا خرید کر آپ آئندہ اخراجات سے بچ گئے ایسا سوچیں بھی مت۔ کھلونوں کی دکانوں پر آنسہ کے کپڑوں، جوتوں سے لے کر دیگر تمام ضروریات زندگی کا وہ، وہ سامان موجود ہے کہ بندہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہ جائے۔ پچھلے مہینے ان کے کپڑوں کی استری کا مسئلہ حل کرنے کے لیے آئرن اسٹینڈ اور ایک استری خریدی گئی تھی۔ ساتھ ٹی پارٹی کا سب ساز و سامان اور اگر آنسہ کو پکنک پر بھی جانا ہو تو اس کے تمام لوازمات خرید کر دیے گئے تھے اور خیر اب تو دولہا میاں بھی چاہئیں۔ یعنی یک نہ شد دو شد۔''

وہ عباد کی باتوں کو انجوائے کرتی ہنس رہی تھی۔ ایک اتنا خوش مزاج، ایک اتنا زیادہ سنجیدہ۔

پتہ نہیں مزاج کے اس فرق کے باوجود اس میں اور ولی میں اتنی زیادہ دوستی کیسے تھی؟ چونکہ کھانے کا ٹائم ہو رہا تھا، اس لیے کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ہی زرمینہ کھانا لگوانے اٹھ گئی۔

بھائی کی آج آمد غیر متوقع نہ تھی، اس لیے اس نے ڈنر پر خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں کیک کا کوئی اہتمام نہ تھا بقول عباد کے بڑھاپے میں یہ چونچلے کون کرے۔ فارہ جو کیک لے کر گئی تھی اس پر چھری چلانے کے لیے بھی اماں ابا سے پہلے دونوں بچے بے چین و بے قرار تھے۔

ان کا آپس میں کیک کاٹنے پر جھگڑا ان کے چچا نے دونوں کے ہاتھ میں بیک وقت چھری تھما کر نمٹوایا۔

''ہاں بھئی یہ دیسی ٹیسٹ رکھنے والے کہاں کیک کھائیں گے۔'' کھانے کے اختتام پر میٹھے کی باری آئی تو ولی کو اخروٹ کا حلوہ پلیٹ میں ڈالتا دیکھ کر عباد بولا۔

''تعلیم امریکی حاصل کی ہے مگر کھانے انہیں سارے کے سارے دیسی پسند ہیں۔'' ولی کے علاوہ باقی سب نے میٹھے میں کیک ہی لیا تھا۔

''ہائے فارہ! تم نے اتنا زبردست کیک کیسے بنالیا؟ یہ تو گھر کا بنا ہوا معلوم ہی نہیں ہو رہا۔ پلیز مجھے اس کی ریسپی دے دو۔ میرا سادہ کیک صحیح بن جاتا ہے مگر کریم والے سارے کے سارے انتہائی فضول۔''

زرمینہ کیک کا پہلا ٹکڑا ہی منہ میں رکھ کر با آواز بلند بولی۔

''لیجیے یہاں خالص قسم کی خواتینی گفتگو عنقریب شروع ہونے والی ہے۔ چلو ولی! ہم لوگ لاؤنج میں چلتے ہیں۔''

عباد غائبانہ ریسپیز کے یہ تبادلے دیکھ دیکھ کر خاصا اکتایا ہوا تھا، تب ہی اپنی پلیٹ ہاتھ میں لے کر ولی کو بھی اٹھنے کا اشارہ کرتا فوراً کھڑا ہو گیا۔

وہ کیک کی ریسپی بتا چکی تو عائشہ آنٹی اپنی کچھ مشہور زمانہ ریسپیز ان دونوں سے شیئر کرنے لگیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ گفتگو کو اتنا انجوائے کر رہی تھی کہ گیارہ بجے گھر چلنے کے لئے اسے ولی ہی نے کہا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد کچن میں چند ایک کام نمٹا کر وہ آغا جان کو دوا دینے کے لئے آغا جان کے کمرے میں آنے لگی، تب ان کے برابر والے کمرے سے آتی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

ولی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید وہ آفس جا چکا ہے مگر وہ ابھی گیا نہیں تھا۔

''جی وحید صاحب! آپ پیپرز تیار کروا لیجئے۔ ہاں وہ پہلے میں نے آپ کو اس لئے روک دیا تھا کیونکہ اس وقت تک میں نے آغا جان سے بات نہیں کی تھی۔'' ایک لمحے کے لئے اس نے دوسری طرف کی کوئی بات سنی پھر دوبارہ بولا۔

''میں پانچ چھ دنوں کے لئے کراچی جا رہا ہوں۔ آج بائیس ہے نا، زیادہ سے زیادہ تیس یا اکتیس تک آ جاؤں گا۔ آپ پیپرز مجھے تب تک بھجوا دیجئے گا۔ جی ہاں، ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔''

اسے ریسیور رکھے جانے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ فوراً وہاں سے ہٹنے کا جو سب سے پہلا طریقہ اس کی سمجھ میں آیا وہ برابر والے کمرے میں داخل ہو جانا تھا اور وہ فوراً ہی ایسا کر بھی گئی تھی۔

ادھر وہ کمرے میں آئی، ادھر اپنے کمرے سے نکل کر ولی بھی آغا جان کے دروازے پر آیا۔

''آغا جان! میں جا رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔'' وہ شاید لیٹ ہو گیا تھا، اس لئے دروازے پر سے انہیں خدا حافظ کہتا فوراً واپس مڑ گیا۔

آغا جان نے ولی کو کچھ خاص توجہ سے نہ دیکھا، نہ خدا حافظ کہا۔ ان کی توجہ فارہ کی طرف تھی۔ ''کیا ہوا بیٹا!''

اس کی پریشانی' اس کا خوف' اس کا اضطراب اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ وہ آغا جان سے اپنے تاثرات چھپانا چاہتی تھی مگر ناکام ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا فارہ! روحی تو ٹھیک ہے نا۔ کل تو تمہاری اس سے فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ اگلے مہینے آنے کا وعدہ کر رہی تھی پھر اچانک۔'' اسے پتہ نہیں ایک دم ہی کیا ہوا، وہ دوڑتی ہوئی آئی اور آغا جان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''آغا جان! ولی مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں اس سے معافی مانگ چکی ہوں پھر بھی نہ اس نے مجھے معاف کیا اور نہ مجھ سے نفرت ختم کی۔ آپ کہتے ہیں وہ بہت میچیور، بہت معاملہ فہم، بہت صبر اور برداشت والا ہے۔

وہ میری اور زرمینہ کی طرح ضدی، جذباتی اور غصے والا نہیں مگر میں آپ کو بتاؤں، وہ مجھ سے اور زرمینہ سے بھی زیادہ ضدی اور غصے والا ہے۔ اس میں انا بھی ہم دونوں سے کہیں زیادہ ہے۔

ہم دونوں تو منہ پر بول کر دل صاف کر لیتے ہیں، وہ دل میں کینہ و بغض رکھنے والے لوگوں میں سے ہے۔ وہ منہ سے کہتا ضرور ہے مگر دل

سے اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"نہیں بیٹا! وہ تم سے نفرت نہیں کرتا" آغا جان نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"نہیں، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس نے اپنا دل میری طرف سے بالکل صاف نہیں کیا۔ میں آپ کو اس کی نفرت کی انتہا بتاؤں، وہ میرے ہاتھ کی بنی کوئی چیز تک کھانا پسند نہیں کرتا۔ اس دن میں نے گاجر کا حلوہ بنایا تھا، آپ کو یاد ہے؟ آپ ایک بار زرمینہ اور ولی کی بچپن کی باتیں بتاتے ہوئے بتا رہے تھے کہ ولی کو بچپن میں آمنہ چاچی کے ہاتھوں کے بنے حلوے بہت پسند تھے۔ وہ ان سے گاجر کا حلوہ فرمائش کر کے بنواتا تھا اور اس دن جب میں نے حلوہ بنایا تو اس نے اسے اگنور کر کے فروٹس کھانے شروع کر دیئے۔

کل زرمینہ کے گھر اس نے میرے بنائے کیک کے بجائے اخروٹ کا حلوہ کھایا۔ میرے بنائے کھانوں میں جیسے زہر ملا ہوتا ہے۔ یہ ہے اس کی مجھ سے نفرت...... پھر آپ کہتے ہیں، وہ مجبور ہے۔

اگر وہ مجبور ہوتا تو کیا اسے یہ نظر نہ آتا کہ میں اب بدل گئی ہوں۔ میں اب پہلے جیسی نہیں ہوں۔ میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں۔" وہ روتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے بولے چلی جا رہی تھی۔

مگر یک دم ہی اسے خود ہی احساس ہوا۔ اب ان سب باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ وہ آغا جان سے ساری بات کر چکا ہے اور ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے بعد اس نے وکیل کو طلاق کے کاغذات تیار کروانے کو کہہ دیا ہے۔

اب گلے شکوے، شکایتیں اور یہ آنسو کس کام کے ہیں؟ ان سے فائدہ کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

وہ اب آغا جان کے روبرو سوال جواب سے خائف تھی۔ وہ پتہ نہیں اس سے کیا پوچھیں گے اور وہ ان سے کیا کہے گی۔

اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں مگر شکر ہوا ابھی اس نے ان کی گود سے سر اٹھا کر شرمندگی میں بری طرح گرتے، آنسو صاف کرنے شروع کیے ہی تھے کہ ان کے ایک بہت پرانے واقف ان کے عیادت کے لئے آ گئے۔

وہ لندن سے آئے ہوئے تھے۔ آغا جان کی کئی برسوں بعد ان سے ملاقات ہو رہی تھی، سو ان کے ساتھ ان کا گفتگو کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جو لنچ کے بعد بھی کافی دیر جاری رہا تھا۔

بڑھاپے میں انسان کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس نے آغا جان کے صبح کی بابت کچھ نہ پوچھنے پر سکون کا سانس لیتے سوچا۔

ولی اسی شام کراچی چلا گیا تھا۔

آغا جان کہہ رہے تھے،، وہاں اسے آفس کا کوئی کام ہے۔ رات کے کھانے پر صرف وہ اور آغا جان تھے۔

کھانے کے بعد وہ کچھ دیر ان سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ ممی جو اگلے مہینے یہاں آ جانے والی ہیں، وہ موضوع کچھ دیر آغا جان نے بڑے خوشی کے ساتھ اس سے ڈسکس کیا پھر انہیں دوا دینے کے بعد کمرے کی لائٹس بند کر کے وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔

گھر میں ملازمین کے علاوہ صرف وہ اور آغا جان تھے۔ رات میں خدانخواستہ کسی وقت ان کی طبیعت خراب ہوتی یا انہیں کسی چیز کی

ضرورت پڑتی تو وہ فرسٹ فلور پر اپنے کمرے میں بے خبر پڑی سوتی رہ جاتی۔

کچھ سوچ کر اس نے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ وہ یہاں نہیں، اسے کیا پتہ چلے گا کہ فارہ یہاں سوئی تھی یوں بھی وہ اس کے کمرے کی کسی چیز کو استعمال کرنے یا خراب کرنے نہیں، صرف آغا جان کی وجہ سے یہاں لیٹ رہی ہے۔

بیڈ پر آ کر لیٹتے وہ جانتی تھی کہ یہ ایک جھوٹی تاویل ہے جو وہ خود کو پیش کر رہی ہے۔ وہاں ان دو بیڈ رومز کے سوا اور کوئی بیڈ روم نہیں باقی سب بیڈ رومز ہٹ کر ہیں یا فرسٹ فلور پر ہیں مگر وہ لاؤنج میں سو سکتی ہے۔

آغا جان کے کمرے ہی میں سو سکتی ہے پھر یہیں کیوں؟ اس لئے کہ اس کی زندگی میں الٹی گنتی چل رہی ہے۔

یہ کمرہ اس کا ہو سکتا تھا۔

وہ اس جگہ آ سکتی تھی مگر چند روز بعد جب ہر رشتہ ختم ہو جائے گا تب وہ اس کمرے پر اپنا کوئی حق باقی نہ رکھ پائے گی۔ ابھی وہ حق اس سے چھنا نہیں۔

الٹی گنتی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ تیئس تاریخ ہے۔ وہ جب تک کراچی گیا ہوا ہے وہ ان پانچ چھ دنوں تک یہ ایک معمولی سی چوری تو کر سکتی ہے۔

بیڈ کی جس سائیڈ پر اس نے اس رات اسے بیٹھے دیکھا تھا وہ اسی سائیڈ پر آ کر لیٹی اسی تکیے پر سر رکھ کر۔

اس تکیے پر سر رکھ کر بے آواز رونا اپنے کمرے میں رونے سے بہت بہتر لگ رہا تھا۔ یہاں ایک مانوس خوشبو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اس کے بیڈ پر اس کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹنا، اس کا بلینکٹ اوڑھنا۔ وہ ایک ایک خوشی، ایک ایک احساس کو اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اپنے اندر بسا رہی تھی۔

یہ سب اس کا ہو سکتا تھا۔ یہ سب اسے چوری سے، چپکے سے اور ڈر ڈر کر نہیں پوری عزت اور احترام کے ساتھ مل سکتا تھا، اگر وہ زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں سب کچھ برباد نہ کر چکی ہوتی۔

وہ بے بسی سے روتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آٹھ دن بعد جب سب کچھ آغا جان کی رضامندی و خوشی کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور پھر وہ اس کی کہیں اور شادی کروانا چاہیں گے پھر وہ انہیں کیا کہے گی۔

وہ اب کبھی بھی آغا جان کو کسی بات کے لئے نہیں کہہ سکتی لیکن دل کے علاوہ وہ کیسے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر پائے گی؟ وہ کیسے کسی دوسرے شخص سے محبت کر پائے گی؟

اس کے پاس آنسو بہانے اور پچھتانے کے سوا زندگی میں کچھ بھی نہ بچا تھا اور وہ اب یہی کر رہی تھی۔

✿✿✿

''آپ نے کہا تھا، آپ فارہ کو اپنی بہو بنائیں گے۔ آپ نے یہ بھی مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے اور میرے اکڑو ڈیڈی دیکھتے رہ جائیں گے۔ پھر آج جب آپ کا بیٹا آپ کی بہو کو چھوڑ دینے والا ہے تو آپ اسے روک کیوں نہیں رہے۔ صہیب چاچا؟''

رات کا وقت تھا اور وہ اپنے پورشن اور آغا جان کے کمرے کے بیچ بنی اس جھیل کے پاس بیٹھی تھی۔ چاند کہیں بادلوں میں چھپا تھا اور ارد گرد اس کا اجالا نہیں بلکہ بہت دور جلتا ایک بلب ہی یہاں پہ مدہم سی روشنی پھیلا رہا تھا۔

یہ اکتیس مارچ کی رات تھی۔ ولی آج شام واپس آ گیا تھا۔

رات کا کھانا ان تینوں نے ڈائننگ روم میں کھایا تھا اور کھانے کے بعد آغا جان اور ولی قہوے اور کافی سے بالترتیب لطف اندوز ہوتے، لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب کہ وہ کھانے تک بھی بمشکل ان دونوں کا ساتھ نبھاتی فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

آغا جان کے کمرے میں ایک کونے میں رکھی یہ البم وہ اپنے ساتھ اٹھا کر باہر جھیل کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ صہیب چاچا اور اپنے ڈیڈی کے کالج کی ایک تصویر دیکھتی، اپنے چاچا سے مخاطب تھی۔

کتنی خوشیاں، کتنی آرزوئیں جڑی تھیں ان دونوں بھائیوں کی اس رشتے کے ساتھ۔ اپنے شہر دل کے اجڑنے کے ساتھ اسے ان دونوں عزیز ترین ہستیوں کے خوابوں کی پامالی کا بھی دکھ ستا رہا تھا۔

اور اس دکھ میں یہ احساس شدت سے شامل تھا کہ ایسا کچھ ہونے کی وجہ بھی وہی خود ہے۔

ولی واپس آ کر اتنا ہی پرسکون، اتنا ہی کمپوزڈ تھا جتنا جاتے وقت تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس سے بھی سلام دعا اور خیر خیریت جیسی رسومات اور فارمیلیٹیز بخوبی اور با آسانی نبھائی تھیں۔

صہیب چاچا اور ڈیڈی کی تصویروں کو دیکھتے ہوئے وہ ولی کے کمرے کے دروازے اور کھڑکی کو دیکھنے لگی۔

آغا جان ہی کی طرح اس کے بھی کمرے کا پچھلا دروازہ یہاں جھیل کے سامنے کھلتا تھا اور اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر شاید وہ صبح کے وقت اس جگہ کی یہ ہریالی، سبزہ اور نیلگوں پانی کی خوب صورتیاں دیکھا کرتا ہوگا۔

وہ جھیل کے پاس اکیلی بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔ گھٹنے پر سر رکھ بے آواز بالکل گھٹ گھٹ کر یونہی روتے روتے اسے وقت کا خیال آیا، وقت کا احساس جاگا، بے اختیار چونک کر سر اٹھاتے اس نے اپنے موبائل میں ٹائم دیکھا گیارہ بج کر پچپن منٹ۔

بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی بچے ہیں اور بارہ بجے کیلنڈر کا نیا ورق الٹ دیا جائے گا۔

اگر وہ اپنی بات کا، اپنی ہٹ کا پکا ہے تو صبح ہونے کا بھی انتظار نہیں کرے گا وہ ٹھیک بارہ بجے اسے وہ لا دے گا جسے لینے تین مہینے پہلے وہ یہاں آئی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ بھی کیوں اگلا ہونے دے۔

وہ اچانک ہی بری طرح خوفزدہ ہوئی۔ خوف میں گھری وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وہاں سے اٹھی آغا جان اپنے کمرے میں جا چکے ہوں گے مگر وہ لاؤنج ہی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اور اسے اپنے کمرے میں جانے کے لئے لازمی طور پر لاؤنج سے گزرنا پڑے گا۔ ایک چیز ملتی طے ہے لیکن ابھی کیوں۔ کیا وہ خود فریبی کے یہ چند گھنٹے اور نہیں گزار سکتی؟

اس نے اپنے کمرے اور لاؤنج سے گزرنے کا ارادہ فوری طور پر رد کیا۔ اس کا رخ آغا جان کے اس طرف کھلنے والے دروازے کی سمت تھا۔ خوف سے اس کا دل انتہائی تیز رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے دل کی دھک دھک صاف سن رہی تھی۔

لمحوں کی چوتھائی میں وہ دروازہ کھول کر آغا جان کے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ نائٹ بلب تک روشن نہیں تھا مگر وہ سوئچ بورڈ تک جانے اور نائٹ بلب جلانے تک میں اک لمحہ بھی مزید ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگر ولی بارہ بجے جو کہ بس بجنے ہی والے ہیں، اسے ڈھونڈتا یہاں آغا جان کے کمرے میں آ گیا تو۔ وہ اس کے یہاں آنے سے پہلے بستر میں گھس جانا چاہتی تھی۔

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر برق رفتاری سے وہ بیڈ پر لیٹی، کمبل منہ تک اوڑھا حالانکہ موسم بدل رہا تھا اور کمبل کی اب ضرورت نہ تھی پھر بھی اور آنکھیں اتنی مضبوطی سے بند کر لیں جیسے بہت گہری نیند سو رہی ہے۔

اب اگر وہ یہاں آیا بھی تو اسے گہری نیند سوتا پا کر واپس لوٹ جائے گا۔ خوف سے اس کا دل ابھی بھی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بر طرح کانپ رہے تھے۔

اچھا خوشگوار موسم ہونے کے باوجود جسم پسینوں میں نہایا تھا اور دل اس رفتار سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس خاموشی میں اس کی ایک ایک بے ترتیب دھڑکن کو سن رہی تھی۔

آغا جان بستر پر موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ابھی تک ولی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کبھی بھی اتنی رات تک نہیں جاگ سکتے تھے۔

لیکن آج کی رات کوئی عام رات تو نہ تھی۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ جب اس کے اور ولی کے درمیان سب کچھ دوستانہ انداز میں ختم ہو تو وہ بھی وہاں موجود رہیں۔

وہ کبوتر کی طرح خطرہ دیکھ کر آنکھیں بند کر رہی تھی یا شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا رہی تھی۔ جو بھی تھا وہ اس پل کہیں چھپ جانا چاہتی تھی۔ بھاگ جانا چاہتی تھی۔

گھڑی میں بارہ بج چکے تھے اور وہ سانس روکے، آنکھیں مضبوطی سے بند کر کے لیٹی تھی۔

ایک، دو تین گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ مزید کئی سیکنڈز اور کئی منٹ گزر گئے مگر نہ آغا جان اپنے کمرے میں آئے اور نہ ولی اسے ڈھونڈتا یہاں آیا۔

اس نے آنکھیں بند کیے کیے نیند کی بڑی شدت سے آرزو اور دعا کی۔ اس رات کی صبح میں کیا ہو گا، وہ تو اسے دیکھنا ہی پڑے گا۔ مگر یہ چند

گھٹنے تو اسے مزید اس رشتے کے احساس کے ساتھ مل جائیں۔

اس کی رات کیسی گزر رہی تھی۔ انتہائی بے چینی والی۔ وہ سوگئی تھی مگر بہت بے قرار اور بہت بے چینی والی نیند۔

وہ پچھلی آٹھ راتوں میں پوری پوری رات روئی تھی۔ مگر آج رات خوف نے اسے رونے بھی نہ دیا۔ وہ نہ جاگتے میں روئی تھی نہ سوتے میں، بس خوف اور پریشانی سے وہ گہری نیند میں بھی چونک چونک جارہی تھی۔

اس کی اس درجہ چونکنے والی بے قرار نیند بالکل گہری نیند میں کب بدلی اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ ہاں اس آنکھ اس احساس سے کھلی کہ کسی نے اس کا کندھا آہستہ سے ہلایا تھا۔

''صبح ہوگئی؟'' آنکھیں کھولنے سے بھی پہلے بیداری کے ساتھ پہلا ڈراتا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا۔ اس صبح کے نہ ہونے کی اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔

''خاتون! اگر آپ برا نہ مانیں تو اٹھ جائیے۔ کیونکہ صبح کے سات بج چکے ہیں۔''

اپنے سر پر کھڑے ولی کو دیکھ کر وہ پوری کی پوری ہل گئی۔

وہ اسے چھوڑنے کے لئے اتنا بے قرار ہے کہ اس کے جاگنے کا بھی انتظار نہیں کرسکتا۔ خود آکر اسے جگا رہا ہے، سب سے پہلی دل دکھاتی سوچ اس کے ذہن میں یہ آئی، مگر اگلے پل ولی پر سے ہوتی اس کی نگاہیں جو کمرے کے در و دیوار سے ٹکرائیں تو بے اختیار وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ آغا جان ہی کے کمرے میں تو آئی تھی۔ اس نے آغا جان کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا یا جلدی اور بوکھلاہٹ میں۔ اس برابر والے کمرے میں گھس آئی تھی۔ رات اس گھپ اندھیرے میں پل بھر کے لئے کہیں یہ احساس جاگا تو تھا کہ بیڈ کی ترتیب اسی طرح ہونے کے باوجود یہاں کچھ مختلف ہے، کچھ مختلف ہونے کے اس احساس پر غالب آئے خوف نے اس سے کیا کروادیا۔ خوف عجلت اور بوکھلاہٹ میں وہ کتنی غلط حرکت کر بیٹھی ہے۔ اس کی خجالت سے بری حالت تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اپنی اس حرکت کی ولی کو کیا وضاحت پیش کرے؟

''گو آپ کو اتنی گہری نند سے جگانا مجھے اچھا معلوم نہیں ہورہا لیکن ابھی اگر کوئی ملازم یا آغا جان میرے کمرے میں آگئے تو میں کیا وضاحت دے پاؤں گا۔ امید ہے آپ میری مشکل سمجھ رہی ہوں گی۔''

وہ ہمیشہ سے مختلف انداز میں بات کررہا تھا۔ شاید وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس انتہائی بے تکی حرکت کو انجام دے کر اپنا تماشا تو اس نے خود لگوایا تھا۔

اب وہ جو مرضی چاہے کہتا، جتنا چاہے مذاق اڑا لیتا۔ دوپٹہ کھینچ کر سر پر لیتی وہ ایک پل میں بیڈ پر سے اتر گئی۔

''آئم سوری، رات میں باہر تھی۔ وہاں اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ میں آغا جان کا کمرہ سمجھ کر غلطی سے یہاں آگئی۔'' اس کی طرف دیکھتے اس نے سنجیدگی، بردباری والا لہجہ اپناتے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''ایسی حسین غلطیاں مجھ سے کیوں نہیں ہوتیں۔ میں تو جب آغا جان کا کمرہ سمجھ کر کسی کمرے میں گیا، وہ ہر بار ان ہی کا کمرہ نکلا۔''

وہ واقعی بالکل سیدھا سیدھا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس پر ہنس رہا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر مزید کوئی وضاحت دینا اپنا مزید تماشا بنوانا تھا۔

وہ چپلیں پاؤں میں ڈالے بغیر ایک جھٹکے سے وہاں سے ہٹی۔

مگر وہ آگے ایک قدم بھی نہ اٹھا سکی۔ ولی نے اسے ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

اس نے ایک نظر ولی کو اور ایک نظر اس کے ہاتھ میں جکڑے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اگر وہ بے وقوفی کی حد تک خوش فہم ہوتی تو شاید اس ہاتھ پکڑنے میں سے کوئی رومانوی معنی ڈھونڈ نکالتی۔

مگر وہ خوش فہم نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے یہاں روکنا چاہتا ہے۔ کیوں روکنا چاہتا ہے، یہ سوچتے ہی اسے پھر مضبوط قدموں سے زمین پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میرا ہاتھ چھوڑو۔''

''تمہیں پتہ ہے، آج کیا تاریخ ہے؟''

وہ ولی صہیب خان ہے کوئی جن یا بھوت نہیں مگر پھر بھی اس پل اس کی شکل دیکھتے وہ یوں خوفزدہ ہوئی جیسے کوئی بھوت یا آسیب دیکھ لیا ہو۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنا بھول گئی۔

اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ بیڈ پر آ بیٹھا، ساتھ اسے بھی بٹھا لیا۔ وہ اس کی طرف نہیں بلکہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ سے تلاش ہو رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

''میں نے تم سے فرسٹ اپریل کا وعدہ کیا تھا۔ آج فرسٹ اپریل ہے۔'' وہ کاغذوں کو الٹ پلٹ اوپر نیچے کرتا ہوا بولا۔

وہ بھاگ جائے، غائب ہو جائے، کھو جائے، گم ہو جائے، ہوا میں تحلیل ہو جائے۔ ایک پل میں نجانے کتنی بے شمار دعائیں اپنے وجود کے مٹ جانے کی اس نے کر ڈالیں۔ سانس روکے وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا بھی تھا اور بری طرح کپکپا بھی رہا تھا۔

''وکیل نے پیپر بھجوا تو دیئے تھے۔ پتہ نہیں گل خان نے لا کر کہاں رکھے ہیں۔'' وہ دراز میں مطلوبہ کاغذ تلاشتا خود کلامی کر رہا تھا۔

''پیپرز بالکل تیار ہیں۔ بس صرف مجھے ان پر.....'' بولتے بولتے وہ ایک دم خاموش ہوا۔

''لو یہ رکھا ہے۔ اس فائل کے نیچے۔'' اس نے کسی فائل کے نیچے دبا ایک لفافہ باہر نکالا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں یہاں تھا نہیں نا، اس لئے میں نے فون پر گل خان سے کہہ دیا تھا، وکیل کوئی پیپرز بھجوائے تو وہ احتیاط سے میرے کمرے میں رکھ دے۔'' بولنے کے ساتھ وہ لفافہ کھولنے لگا۔

اس نے وحشت زدہ ہو کر اس لفافے کو دیکھا۔ اس میں ایک انتہائی زہریلا سانپ تھا جو باہر نکل کر اس کی پوری زندگی کو ڈس لینے والا تھا۔

''مجھے طلاق نہیں چاہئے۔'' اب ان لفظوں کے کہنے سے کچھ ہو سکتا تھا یا نہیں، پھر بھی بے بسی اور بے اختیاری کی ملی جلی کیفیت میں وہ

کپکپاتی آواز میں بولی۔

''میں نے تم سے کہا تھا تمہیں آغا جان کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں میں.....'' وہ لفافہ کھول چکا تھا۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں مجھے طلاق نہیں چاہیے۔'' اس کی کپکپاتی آواز پہلے سے بہت بلند تھی۔

''آغا جان ہمارے فیصلے میں بہت خوش ہیں فارہ! وہ.....'' اپنے مخصوص سنجیدہ و مدبرانہ انداز میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

''آغا جان کی رضامندی اور خوشی سے میں نے سب کچھ کیا ہے۔''

یک دم ہی اسے کچھ ہوا تھا، اس نے جھپٹ لینے والے انداز میں ولی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کھینچا۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں، مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں، تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟'' وہ روتے ہوئے بہت زور سے چلائی۔

کھینچنے میں آدھا کاغذ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور آدھا ولی کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ کاغذ ہاتھ میں لئے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

دل کی مان کر اس گزرے پل میں جو ایک بات اس سے کہہ دی، پتہ نہیں اب اس کے کہنے سے کوئی فرق پڑ سکتا تھا یا نہیں مگر وہ دل کی بات کہہ چکی تھی اور اب سر جھکائے زار و قطار رو رہی تھی۔

''مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ میرے پاس دیکھنے کے لئے آنکھیں بھی موجود ہیں اور سوچنے کے لئے دماغ بھی۔ مگر میں یہ بات آپ کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ایک انا پرست اور ضدی لڑکی کی ضرورت سے زیادہ اونچی ناک اور اکڑ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔'' وہ اپنے ہی بولے لفظوں کی بازگشت سنتی سر جھکا کر بری طرح رو رہی تھی جب اس نے یہ آواز سنی۔

بے اختیار سر اوپر اٹھا کر اس نے ولی کو دیکھا۔ اس نے مسکراہٹ کو ضبط کیا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں کسی بات کا لطف اٹھاتی مسکرا رہی تھیں۔

ولی نے اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے کھینچ کر نکالا اور پھر اپنے اور اس کے دونوں ٹکڑوں کو ملا کر اس کے سامنے کر کے دکھایا۔ وہ آغا جان کی کسی پراپرٹی کی فروخت سے متعلق کوئی کاغذات تھے۔

اس بار اس کی الجھی، بوکھلائی شکل کو دیکھ کر وہ اپنی ہنسی روک نہ پایا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بڑی شریری ہنسی ہنس رہا تھا۔

''چھپ چھپ کر میرے کمرے کے باہر سے باتیں سن کر جب آغا جان سے میری شکایتیں کرنے گئی تھیں۔ گاجر کا حلوہ نہیں کھاتا اور کیک نہیں کھاتا وغیرہ تو اس وقت میں وکیل سے اسی پراپرٹی کی فروخت ہی سے متعلق بات کر رہا تھا۔''

وہ چھپ چھپ کر باتیں نہیں سن رہی تھی۔ کہنا چاہتی تھی مگر باقی ساری بات نے اس کے حواس ایسے گم کئے تھے کہ وہ یہ وضاحت کر ہی نہ سکی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اس کی بوکھلاہٹ زدہ شکل کو انجوائے کر رہا تھا۔

''دیکھو، میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ فرسٹ اپریل کو تمہیں فول نہیں بناؤں گا لیکن اگر کوئی خود اپنے آپ کو فول بنائے تو اس میں میرا کیا قصور؟'' وہ اس کی حماقت اور بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔

''آغا جان نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ فارہ کے معنی ذہین اور سمجھدار کے ہیں۔ صد افسوس تم نے تو اپنے نام کی بھی لاج نہ رکھی۔''

اس کا مطلب ہے یہ سب جھوٹ تھا، مذاق تھا، ولی نے اسے طلاق نہیں دی۔ وہ اب بھی اس کے ساتھ اسی رشتے میں بندھی ہے جس میں پہلے بندھی تھی۔ شرمندگی، خجالت یا جھینپ میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ ایک دم ہی پرسکون ہو گئی۔

اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ ایک پل میں ختم ہوئی۔ دل کی دھڑکن لمحہ بھر معمول پر آ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابھی بھی گر رہے تھے۔ مگر سکون، اطمینان اور طمانیت والے۔ وہ آنکھوں میں بڑی شریری چمک لئے ابھی بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ تو بقول خود اپنے موروثی و خاندانی صاف گو، منہ پھٹ لڑکی ہیں، پھر اتنی سی بات کہنے میں آپ کو کیا مشکل پیش آ رہی تھی؟''

''مجھے لگا تھا میں اپنی بات کہہ کر گنواؤں گی۔ نفرت کا جھوٹ تم سے ہمیشہ اتنی شدت سے بولا ہے کہ آج میری محبت کے سچ کا تم یقین نہیں کرو گی۔'' وہ روتے ہوئے نظریں جھکا کر بولی۔

''اور میں یقین کیوں نہیں کرتا؟ ایسا سخت دل بھی نہیں ہوں کہ ایک انتہائی خود سر، بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی میرے لئے نیک پروین، پردہ نشین بن جائے۔ معدے کے ذریعے میرے دل تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈے میں کیا کھاتا، کیا پیتا اور کیا کرتا ہوں کا چوبیس گھنٹے حساب رکھے۔ چھپ چھپ کر میرے کمرے کے باہر سے میری باتیں سنے، میں اس کی پکائی چیزیں نہیں کھاتا، مجھے اس کی محبت نظر نہیں آتی وغیرہ جیسی میری شکایتیں آغا جان سے کرے۔ میں گھر سے کہیں چلا جاؤں تو بڑے اطمینان سے پورے حق کے ساتھ میرے کمرے میں آ کر سونا شروع کر دے اور میں پھر بھی اس کی محبت کا یقین نہ کروں؟'' لبوں پر مسکراہٹ روکتا وہ بڑی سنجیدگی سے انگلیوں پر اس کی ایک ایک خوبی اسے گنوا رہا تھا۔

اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔

''میں اپنے کمرے کے متعلق بڑا حساس واقع ہوا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔ یہاں کی صفائی ستھرائی بھی میں اپنے سامنے کرواتا ہوں۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کل شام واپس آ کر مجھے یہ نہ پتہ چل پاتا کہ میرے پیچھے یہاں کوئی آیا تھا۔ مجھے کمرے میں گھستے ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہاں میرے پیچھے کوئی آیا ہے لیکن پھر مجھے زیادہ سوچنے کا تردد یوں نہ کرنا پڑا کہ آپ جیسی سمجھدار اور ذہین خاتون یہاں ایک عدد ثبوت بھی میری آسانی کے لئے چھوڑ گئی تھیں۔'' اس نے سائیڈ کی اس دراز میں سے اس کا براؤن کلر کا کچر نکال کر دکھایا۔

''یہ میرے بیڈ پر میرے تکیے کے بالکل پاس پڑا تھا۔ شکر کہ اسے میں نے ہی دیکھا۔ اگر آغا جان یا کوئی اور دیکھ لیتا تو مجھ بے چارے کی تو عمر بھر کی ساری پارسائی دھری کی دھری رہ جاتی۔ میں معصوم تو پھر عمر بھر اپنی شرافت ثابت کرتا ہی رہ جاتا۔'' وہ اس کی بوکھلاہٹ زدہ شکل سے حظ اٹھاتا ہنستے ہوئے بولا۔

شرمندگی و خجالت میں گھرتے وہ فوراً وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ ہر بات کی وہ اسے وضاحت دے دے، مگر راتوں کو اس کے کمرے میں آنے کی کیا وضاحت دیتی؟

وہ فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر وہ بھاگتی کیسے؟ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ بیڈ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اس نے مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔

''ابھی یہ سارا قصہ اتنی جلدی سلجھانے، نمٹانے اور ختم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جس لڑکی نے چھ سال مجھے اپنے پیچھے خوار کروایا ہے۔ میں کم از کم چھ مہینے تو اسے اپنے پیچھے خوار کرواتا، مگر تمہاری اس جرأت مندی اور بہادری نے مجھے اتنا امپریس کیا کہ میں اپنی ساری انتقامی کارروائی سے تائب ہو گیا ہوں۔

میرا خیال ہے اتنی بہادر، نڈر جرأت مند لڑکی مجھے اس کرۂ ارض پر دوسری کوئی بھی نہیں مل سکتی، جسے اگر میں اپنی زندگی میں شامل کرنے سے انکار کر رہا ہوں تو وہ میرے انکار کو خاطر میں نہ لاتی۔ بے خوف و خطر خود ہی میرے بیڈ روم اور میری زندگی میں داخل ہو جائے

سول و فوجی اعزازات میرے مشورے سے تقسیم نہیں کیے جاتے ورنہ کل رات کی تمہاری بہادری اور جرأت مندی پر میں تمہیں تمغۂ شجاعت یا ستارہ جرأت وغیرہ جیسے کسی اعزاز سے ضرور نوازتا۔'' وہ سر جھکا کر بری طرح نروس ہوتی اس کی بظاہر سنجیدگی سے کہی باتیں سن رہی تھی۔

اس سنجیدگی میں چھپی شرارت اور ہنسی اور با آسانی محسوس کر رہی تھی۔

''رات گیارہ بجے میں اور آغا جان اپنے اپنے کمروں میں آئے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ محترمہ کسی دکھیاری فلمی ہیروئن کی طرح جھیل کنارے رونے کا شغل فرما رہی ہیں۔ تسلی دینے کے لیے جانے کا گو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں دیکھتا کافی دیر رہا۔

پھر میں نے سوچا اب سو جانا چاہیے۔ اپنے لئے آنسو بہاتا آپ کسی کو کتنی دیر دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے میں بور ہو گیا۔ سونے سے پہلے میں باتھ روم گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محترمہ بصد اطمینان میرے بیڈ پر پورے حق سے موجود ہیں رونے کا شغل ختم کر کے اب سونے کی تیاری ہے اور وہ بھی میرے کمرے میں، میرے بیڈ پر اس جرأت مندی، بہادری اور جی داری پر عش عش کرتا میں اس سامنے رکھے صوفے پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اس جرأت مندانہ حرکت کے بعد یہ لڑکی ڈرزدہ کرتی ہے، کل صبح سارا ہنگامہ سمیٹ لیا جائے تمہاری بہادری اور جی داری نے واقعی مجھے بہت امپریس کیا ہے۔'' اس نے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کی۔ وہ واقعی اس وقت یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

شرم و خفت سے اس کا پورا کا پورا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''سنو! تم کیا مجھ سے شرما رہی ہو؟ اگر ایسا ہے تو یہ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ فارہ بہروز خان جیسی نڈر اور جرأت مند خاتون کسی سے شرمایا بھی کرتی ہیں۔''

''ولی! تم مجھے نروس کر رہے ہو۔ تمہیں پتہ ہے، میں رات کو یہاں جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ میں غلطی سے......'' اس نے منمنا کر کہنا چاہا۔

''رات نہیں آئی تھیں، اس سے پچھلی راتوں میں تو آتی تھیں؟ یا جب بھی غلطی ہو جاتی تھی اور غلطی سے تمہاری چیزیں خود چل کر یہاں آ جایا کرتی تھیں؟''

ہاں ان آٹھ راتوں میں وہ واقعی جان کر ارادتاً ہی اس کمرے میں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنے رشتے کے آخری دن گزار رہی تھی، اس

لئے لیکن وہ اس سے یہ بات کہہ تو نہیں سکتی تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔

''تم اور زرمینہ اپنے دل کی کوئی بات کسی سے بھی نہیں چھپا سکتیں۔ تم دونوں ایک سی ہو۔ واقعی جو دل میں ہے وہی چہرے پر ہے۔ تم دونوں کے چہروں پر تمہارے دل کو پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آغا جان کہتے ہیں، میری پوتیوں کے دل شفاف آئینوں کی طرح ہیں۔ ان کے دل ان کے چہرے پر دکھتے ہیں اور اس منافق دور میں یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ تو جب تیئس چوبیس سالوں سے اپنی زبان دراز، منہ پھٹ، صاف گو اور بدتمیز بہن صاحبہ کو بھگتا تا آ رہا ہوں تو اسی جیسی خصوصیات رکھنے والی ایک دوسری لڑکی کو کیوں نہیں سمجھ سکتا؟''

وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہولے سے کھینچتا ہوا شرارت سے بولا۔

''جب دھوم دھڑکے سے نفرت نفرت کا شور مچاتی تھیں، تب نفرت پوری طرح ظاہر ہوتی تھی اور جب میرے کمرے میں آ کر'' آغا جان کے لئے اس رشتے کو برقرار رکھتے ہیں، ان کی خاطر، ان کی خوشیوں کے لئے'' وغیرہ جیسے میلوڈرامیٹک ڈائیلاگز بول رہی تھیں' تب بھی تمہارا دل تمہارے چہرے پر دکھتا مجھے بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے تم سے محبت ہے، مگر اس کا اظہار کرتے اس کی مشہور زمانہ قسم کی انا آڑے آ رہی ہے۔ ناک اونچی رکھنے کے مسئلے درپیش ہیں اسے۔''

وہ بیڈ پر رکھا اپنے ہاتھ کے نیچے دبا اس کا ہاتھ بیڈ پر سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے ہاتھ کی لمبی مخروطی انگلیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''جب اس رات میرے پاس آئی تھیں تو تب تک میں نے کچھ بھی سوچا نہیں تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور نظر آتا تھا کہ میری بدتمیز اور خود سر بیوی تھوڑی سی تمیز دار ہوگئی ہے۔ کچھ سدھر گئی ہے اور ذرا نیک بن گئی ہے۔

عباد کہتا ہے ہم دونوں کی بیویاں ایک جتنی بدتمیز ہیں۔ مگر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم اس لحاظ سے شاید خوش قسمت ہیں کہ بدتمیز اور زبان کی کڑوی یہ دونوں لڑکیاں دل کی میٹھی ہیں مگر ان کے دل کی مٹھاس اور اچھائی جاننے کے لئے آپ کو ذرا رک کر ٹھہر کر انہیں دیکھنا ہوگا۔'' اس نے سر اٹھا کر دولی کو دیکھا۔

وہ اس بار اس کا مذاق نہیں اڑا رہا تھا' اس کی کسی کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا تو رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور سچائی تھی۔ پتا ہے میں نے تمہیں 14 سال کی عمر میں پہلی بار دیکھا تھا۔

''میں چودہ سال کا تھا' نو دس سال کی اسکول یونیفارم پہنی ایک کیوٹ سی لڑکی کی تصویر۔

پاپا مما کو وہ تصویر دکھاتے کہہ رہے تھے کہ وہ لڑکی ان کی بھتیجی ہے۔ اس کا نام فارہ ہے اور وہ اسے ایک دن اپنی بہو بنائیں گے۔ اپنے ولی کی دلہن بنائیں گے۔'' وہ اپنے لفظوں پر محظوظ سا ہوتا ہنس پڑا۔

''دیکھو اب یہ بات چاہے کتنی بھی ہنسنے والی اور بیوقوفانہ سی لگے مگر چودہ سال کی عمر میں'' ولی کی دلہن فارہ'' کے الفاظ میرے لئے بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ اس میچور عمر میں یہ الفاظ میرے دل اور دماغ میں بالکل پختہ ہوگئے تھے۔ ان دنوں میں اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ شاید اپنی

زندگی کا پہلا عشق شروع کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا، جب پاپا وہ تصویر اپنے ساتھ لائے۔
میں نے اس تصویر کو بہت غور سے دیکھا۔ بہت حق سے دیکھا۔ پاپا کہہ رہے ہیں تو غلط تو نہیں کہہ سکتے۔ ان کی ہر بات سچ ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔

یہ سب سوچتے تب میں نے سوچا تھا کہ زندگی میں چھوٹی موٹی پسندیدگی یا کشش کبھی کسی کی طرف محسوس ہو تو ہو، مگر مجھے اپنی زندگی اسی لڑکی کے ساتھ گزارنی ہے جسے پاپا نے دلی کی دلہن کہا ہے۔ میں اس لڑکی کے لئے پوزیسو ہو گیا۔

میں اس کی وہ تصویر اس بچکانہ عمر میں کئی بار آغا جان کے کمرے میں آ آ کر چپکے سے دیکھی بھی۔ عمر کا وہ بچکانہ دور ختم ہوا اور میں پڑھنے امریکہ چلا گیا تو وہ تصویر دیکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

مگر اس لڑکی کے لئے میری Possessiveness کبھی ختم نہ ہوئی۔ میں زندگی میں کہیں بھی چلا جاؤں، کسی سے بھی ملوں، کسی کو بھی پسند کروں مگر آخرکار مجھے زندگی اسی لڑکی کے ساتھ گزارنی ہے جسے پاپا نے میرے لئے پسند کیا ہے۔ یہ جیسے ایک طے شدہ بات تھی۔

مگر جب وہ لڑکی مجھے ملی، تو پتہ چلا دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ پاپا سے معصومیت سے ''آپ کیا بچوں کو اغوا کرنے والے ہیں؟'' پوچھنے والی تصویر میں بہت کیوٹ اور بہت سویٹ نظر آنے والی وہ لڑکی دل بھر کر بدتمیز، زبان دراز اور منہ پھٹ تھی۔ میرے دل کو پہلا صدمہ اس سچائی کو جان کر پہنچا۔''

وہ سنجیدہ باتیں انتہائی غیر سنجیدگی سے کر رہا تھا۔ وہ حیرت میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔
ولی اسے اتنے پہلے سے جانتا ہے اس کے لئے اتنے پہلے سے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے؟

''دیکھو میں بہت لمبی بات نہیں کرتا۔ شروع میں جو کچھ تم نے کیا اس سے چاہے مجھے دکھ پہنچا ہو، مگر تمہارے نظریہ سے اگر سوچوں تو شاید تم اتنی غلط تھیں بھی نہیں۔ تم ایک دم کسی بھی مسلط کردہ رشتے کو کیوں قبول کرتیں۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ جیسا تم مجھے سمجھتی ہو، میں ویسا نہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بہروز پاپا کے انتقال کے بعد تم خود کو بہت تنہا سمجھتی ہو۔ میں تمہارے اس احساس تنہائی کو بھی بانٹنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا ہم میں دوستی ہو تمہاری غلط فہمیاں دور ہوں اور پھر آہستہ آہستہ تم اس رشتے کو قبول بھی کر لو مگر میری کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا، تم تو مجھ سے بات کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوتی تھیں۔ امریکہ جانے سے پہلے وہاں سے واپس آ کر میں نے ہر بار کوشش کی مگر سب بیکار۔ پھر بھی میں تمہارے دل سے تمام غلط فہمیاں دور کرنے سے مکمل مایوس نہ ہوا تھا۔ جب تک کہ میں نے تمہیں اور تمہارے اس ڈیئر کزن کو ساتھ ڈنر کرتے نہ دیکھ لیا۔

میں تمہیں پہلے بھی اس کے ساتھ دیکھتا تھا۔ تمہاری زندگی میں اس کی غیر ضروری مداخلت مجھے کھلتی بھی تھی۔ تم اپنے ہاسپٹل میں مجھے اگنور کر کے اس کے ساتھ چلی گئی تھیں تب مجھے بہت برا ضرور لگا تھا پر تم سے نفرت محسوس نہ ہوئی تھی مگر تمہیں اس کے ساتھ اتنے خوش خوش، ہنستے مسکراتے بہت بے تکلفانہ انداز میں ڈنر کرتے دیکھ کر میرے دل سے تمہیں اپنانے کی ہر خواہش ختم ہو گئی تھی۔ میری طرف نفرت سے نگاہ اٹھاتی یہ لڑکی کسی کو اتنی محبت سے دیکھتی ہے۔

میں حق رکھتا تھا، میرا تم سے رشتہ تھا کہ میں تمہیں ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچتا ہوا لے جاؤں۔ تمہارے اس عاشق صادق کو دو چار ٹھیک قسم کے تھپڑ اور گھونسے رسید کروں اور تمہیں اپنے گھر میں قید کر کے کہوں، ''خبردار! یہاں سے باہر قدم بھی نکالا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' مگر میرا تم پہ حق جتانے کو بھی جی نہیں چاہا تھا۔

اس روز تم میرے دل سے اتر گئی تھیں۔ اس روز تم میری نگاہوں سے بہت نیچے گر گئی تھیں۔ یہ لڑکی کسی کے بھی ساتھ زندگی گزارے مگر میں اسے اپنی زندگی میں اب شامل نہیں کروں گا۔ اسے میرے ساتھ اپنے رشتے کا کیا پاس ہوتا اسے تو اپنے مرے ہوئے باپ کی بھی شرم نہیں۔ میں تم سے اس روز نفرت کرنے لگا تھا۔ فارہ! اور تب میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر کبھی آغا جان کی وجہ سے مجھے مجبوراً تمہیں اپنانا پڑ گیا تو میں تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت دے کر اپنے ساتھ رکھ کیسے پاؤں گا؟

جو لڑکی میرے نکاح میں ہوتے کسی دوسرے کے ساتھ محبت کا تعلق جوڑ رہی تھی میں اس لڑکی کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ میں اس لڑکی کو کبھی بھی اپنی بیوی کا مقام نہیں دے سکتا تھا۔

آغا جان، پاپا یا بہروز پاپا کے لئے بھی اگر ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا تب بھی تمہیں صرف ظاہری طور پر قبول کرتا۔ میں دل سے تمہیں کبھی بھی اپنا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس بیچ پھر اور کیا کیا ہوا' یہ گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوگی مگر یہ بالکل سچ ہے کہ آغا جان کی شدید بیماری کا جب تم سب بنیں اور پھر ان کی فون کالز تک سننے سے انکار کر دیا' تب تمہاری نفرت میرے دل میں مزید گہری ہوگئی، تب تم مجھے ایک سخت دل، بے حس اور خود غرض لڑکی بھی لگنے لگیں۔

مگر میری مجبوری یہ تھی کہ جس سے میں نفرت کر رہا تھا، آغا جان کی اس میں جان تھی۔ میں صرف آغا جان کی وجہ سے تمہارے پاس لاہور آنے اور تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آنے کے حوالے سے میں نے تم سے اس رات جو جو کچھ کہا تھا وہ سب سچ تھا۔

میں تمہیں اس وقت اتنا ہی برا سمجھا تھا کہ تم صرف طلاق کا لفظ سن کر ہی یہاں آنے پر آمادہ ہوگی اور آغا جان کی بیماری کے کسی تذکرے سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

تم یہاں آ کر بدل جاؤ گی۔ آغا جان کی حالت، ان کی محبت تمہیں تبدیل کر دے گی، ایسی کوئی سوچ میرے ذہن میں نہ تھی، نہ ہی ہو سکتی تھی۔ تمہارے یہاں آنے اور یہاں آ کر تبدیل ہو جانے اور پھر ہمارے اس رشتے کے مستقبل کے حوالے سے بھی میں نے اس رات جو کچھ کہا اور اپنی جو فیلنگز بتائیں وہ سب بالکل سچ تھا۔

یہ وضاحت دوسری بار اس لئے کر رہا ہوں کہ تم کبھی اپنی عادت کے مطابق بدگمان ہونے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگاتے ہوئے یہ سوچنے لگو کہ میری اس رات کی تمام باتیں جھوٹ اور اداکاری تھی۔

ہاں میں تم سے اپنی کچھ فیلنگز تب ضرور چھپا گیا تھا کیونکہ یہ تو گفتگو کے اختتام سے کچھ دیر قبل میری سمجھ میں آیا تھا کہ آغا جان کا نام لے

لے کراتنی بے قراری اور اضطراب سے ہمارے رشتے کے قائم رہنے کی بات کرنے والی یہ محترمہ درحقیقت میری محبت میں مبتلا نظر آرہی ہیں۔

''لیکن ولی! اگر ہم نے طلاق کی بات کی تو آغا جان کو تکلیف تو پہنچے گی اس رشتے میں ان کی خوشی تو تھی نا ولی!'' جیسے کچھ جملے جو میری بات کے جواب میں، بہت پریشانی کے عالم میں کہے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے چونکا دیا تھا، یہ بتایا تھا کہ بات صرف آغا جان کی نہیں کسی اور محبت کی بھی ہے۔

خیر میں کہاں نکل گیا' میں تمہیں تمہارے یہاں آنے کے بعد کی بات بتا رہا تھا۔ میں آغا جان کی حالت دیکھتے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنے دل میں تمہارے لئے بہت ساری نفرت رکھ کر تمہیں یہاں لایا تھا، لیکن تمہارے یہاں آنے کے اگلے ہی روز مجھے تمہارے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کرنے پڑے۔

تمہیں یاد ہے، اس رات جب آغا جان نے تمہیں اپنے کمرے میں روک لیا تھا۔

میں کچھ دیر بعد وہاں دوبارہ آیا تھا، تمہارے بدتمیز ماموں جان کا فون آیا تھا۔ میں انہیں ہولڈ کروا کر تمہیں ان کے فون کی اطلاع دینے آیا تھا۔

مگر جب میں وہاں آیا تو تم اور آغا جان دونوں آنکھیں بند کیے رو رہے تھے۔ تب آغا جان کے سینے پر سر رکھ کر روتی وہ لڑکی مجھے اتنی بے حس اور اتنی خودغرض و سخت دل نہ لگی جتنی لگا کرتی تھی۔ تمہارے لئے میرے خیالات تبدیل ہونے شروع ہوگئے۔

مجھے لگا کہ شاید میں تمہیں غلط سمجھتا ہوں یا شاید تم خود اپنے آپ کو ٹھیک سے نہیں سمجھتیں اس لئے اتنا غلط اور اتنا برا کرتی ہو۔

آغا جان کی بیماری، ان کا ہاسپٹل جانا، وہاں سے آنا، یہ سب واقعات ترتیب سے وہ تھے جب میں نے تمہیں صحیح سے جاننا شروع کیا۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ تمہارا اپنے کزن سے ایسا کوئی تعلق نہیں جیسا تم جان بوجھ کر مجھ غصہ دلانے کے لئے میرے آگے ثابت کیا کرتی تھیں۔

بہت اچھی اور نیک پروین بن جانے والی یہ خاتون میری محبت میں مبتلا ہوگئی ہیں۔ یہ بہرحال مجھے اس وقت تک پتا نہیں چلا تھا۔

کچھ لگتا تو تھا کہ محترمہ میری فکر میں ذرا زیادہ مبتلا رہتی ہیں۔ میں آغا جان سے بات کر رہا ہوں تو چپکے چپکے مجھے دیکھا کرتی ہیں مگر یہ سب بس صرف شک ہی تھا، یہ شک کنفرم تو اس رات ہوا جب مجھ سے اس رشتے کو آغا جان کی خاطر قائم رکھنے کی فرمائش کی گئی۔

''دیکھو تم نے مجھے صحیح سمجھا ہو یا نہیں مگر یہ بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ میں ضدی اور انا پرست ہوں۔ واقعی مجھ میں انا بہت ہے اور اب یہ واقعی میری انا کا مسئلہ تھا کہ ایک لڑکی جو زندگی بھر مجھے ٹھکراتی رہی ہے وہ خود آ کر مجھ سے کہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ اپنے لئے اپنی اس محبت کی وجہ سے میرے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دینا چاہتی ہے۔

اب تمہیں خود میرے پاس آ کر مجھ سے کہنا تھا کہ تم مجھے سے محبت کرتی ہو اور میرا ساتھ چاہتی ہو' اس سے کم تر میں کسی بھی بات کے لئے راضی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مگر بہت منہ پھٹ، بغیر لگی لپٹی رکھے بے سوچے سمجھے بولنے والی میری زوجہ محترمہ کو یہی ایک بات بولنے میں بہت مشکل پیش آرہی تھی۔

اس رات کی میری کسی بات کو نہیں، ہاں اس رات کے بعد کی تم میری ہر بات کو چاہو تو ڈرامہ، اداکاری، پوز کرنا یا بنا قرار دے سکتی ہو۔

آغا جان کو فکر ہو رہی تھی کہ ان کی پوتی اتنی اداس، اتنی خاموش کیوں رہنے لگی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو کیوں بھرے رہتے ہیں۔

انہوں نے مجھ سے باز پرس کی، میں نے ان سے کہا۔ "یہ میرا اور میری بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ اپنی پوتی کی کوئی طرف داری مجھ سے نہیں کریں گے۔ اس نے چھ سال تک میری زندگی کو جہنم بنائے رکھا ہے۔ میں جواب میں کیا چھ مہینے بھی پچھلی کسی بات کا کوئی حساب نہیں لے سکتا۔ اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کا یوں بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ صرف یہ دیکھ کر کہ محترمہ میرے لئے کھانے پکایا کرتی ہیں۔ میرے لئے پوری کی پوری بدل گئی ہیں۔ بہت نیک اور سعادت مند بن گئی ہیں۔ میری ممکنہ جدائی کے غم میں ساری ساری رات آنسو بہایا کرتی ہیں اور صبح جب اٹھ کر آتی ہیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ یہ رات بھر روتی رہی ہیں، ان کی ان کہی محبت کو قبول کرلوں۔

اب مجھے اظہار چاہئے تھا بالکل واضح اور صاف مجھ سے محبت کا اقرار۔ باقی ان رونے دھونے اور کھانے پکانے والی باتوں سے میں تبدیل ہونے والا نہیں تھا۔

ہاں منحصر یہ تم پر تھا کہ تم یہ بات کہنے میں کتنا وقت لگاؤ گی۔ میں اتنا انتظار کرسکتا تھا۔ تم فرسٹ اپریل سے خائف ہو اور یہ سمجھ رہی ہو کہ میں پہلی جنوری کی اتنی پرانی وہ ایک فضول سی بات اب تک یاد رکھے بیٹھا ہوں گا۔ یہ تو مجھے ابھی 23 مارچ کی صبح پتہ چلا۔

میں بالکل مگن آغا جان کے وکیل سے باتیں کررہا تھا' مجھے شک تو ہوا کہ شاید دروازے پر آکر کوئی کھڑا ہے مگر میں نے اسے توجہ نہ دی۔

آغا جان کو خدا حافظ کہہ کر جب میں چلا گیا اور پھر یہ خیال آنے پر فوراً ہی واپس بھی آیا کہ میں نے جلدی میں ان کے پاس جا کر ان سے پیار نہیں کروایا تو کیا دیکھتا ہو، دھواں دھار روتے آغا جان سے میری شکایتیں کی جارہی ہیں۔

بات تو ذرا ظالمانہ اور سنگ دلانہ ہے کہ ایک بندہ رو رہا ہے اور دوسرے اس کے رونے پر ہنس رہے ہیں لیکن اس وقت میرے ساتھ ساتھ آغا جان بھی ہنس رہے تھے۔ رونے کی مصروفیت سے سر اٹھا کر اگر تم اس وقت دیکھ لیتیں تو تمہیں ہنستے ہوئے نظر آتے۔

اب گاجر کا حلوہ نہیں کھایا اور کیک نہیں کھایا جیسی شکایتوں پر وہ ہنسنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہاں بعد میں انہوں نے میرے کان کھینچے کہ "تم نے میری پوتی کا پکایا حلوہ کیوں نہیں کھایا جو پکایا بھی تمہاری ہی خاطر گیا تھا۔"

میں نے ان سے کہا۔ "آپ اس سارے معاملے میں کچھ بھی نہ بولیں۔ اپنی مغرور اور گھمنڈی پوتی کی مجھ سے طرف داری بھی نہ کریں حلوہ پکانے میں تین چار گھنٹے برباد کرسکتی ہے تو" مجھے تم سے محبت ہے" کہنے کا ایک سیکنڈ بھی ضرور اپنے وقت میں سے نکال سکتی ہے۔"

ویسے سچ بات ہے تمہاری اس روز کی باتوں سے مجھے تمہارے فرسٹ اپریل کے خوف کا پتہ چلا اور پھر تو واقعی میرا ہر ہر عمل سو فیصد اداکاری ہی تھی۔

مجھے دل میں یہ سوچ کر ہنسی بھی آتی کہ وہ ایک پرانی بات جو میں نے اس فارہ سے کہی تھی جس سے میں نفرت کرتا تھا، وہ اس فارہ نے جسے میں نے اب جانا اور سمجھا ہے، جو اس پرانی لڑکی سے بالکل مختلف ہے اور جو مجھ سے محبت بھی کرتی ہے، اب تک یاد رکھ کر بیٹھی ہوئی ہے جب کہ سچ بتاؤں تو تمہیں جاننے اور سمجھنے کے بعد میں تو اس بات کو ہی بھلا چکا تھا۔

زیادہ ہنسی مجھے یہ سوچ کر آتی کہ اگر تمہیں وہ ساری بات یاد ہے تو یہ بھی ضرور یاد ہوگا کہ میں نے اس دن تم سے کیا کہا تھا، کیا وعدہ کیا تھا۔

میں نے یہ کہا تھا، میں فرسٹ اپریل کو فارہ بہروز خان کا ہر مطالبہ خواہ وہ کچھ بھی ہو پورا کرنے کا پابند ہوں گا۔

گو اس وقت ایسا اس لئے کہا تھا کہ میں تمہیں طلاق کے ساتھ کچھ دوسری چیزوں کا طلب گار بھی سمجھتا تھا لیکن فارہ بہروز خان اگر واقعی اپنے نام کے معنوں کے مطابق ذہین اور سمجھ دار ہوتیں تو وہ کاغذ ضائع کرنے کے بجائے اتنا رونا دھونا مچانے کے بجائے میرے اس وعدے کو آج اپنے حق میں استعمال کرتیں۔

آج میرے پاس آ کر کہتیں۔ یہ رہا تمہارا عہد نامہ، آج اسے پورا کرو۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اپنے لفظوں پر قائم رہتے میرے مطالبے کو تسلیم کرو مگر میری زوجہ اتنی ذہین ثابت ہوئی نہیں۔ 23 مارچ کو ہی پھر میں نے یہ سوچا کہ ایک بندی جو خود ہی اتنا ڈر رہی ہے پتہ نہیں آگے تک کا کیا کیا کچھ سوچ چکی ہے تو کیا حرج ہے اگر اسے تھوڑا سا میں بھی ڈرا لوں۔

آج فرسٹ اپریل کے لئے میں نے کچھ دوسری باتیں سوچ رکھی تھیں۔ تمہیں ڈرانے کے کچھ شاندار پلان تیار کر رکھے تھے مگر میرے کمرے میں میری بغیر اجازت پورے حق کے ساتھ گھس کر یہاں ساری رات گزار کر تم نے واقعی مجھے باقی سارے پلان بھلا دیئے۔ چھ سال جس نے مجھے خوار کیا، افسوس میں اسے چھ مہینے بھی خوار نہ کر سکا۔''

اسے پتہ ہی نہیں تھا' وہ ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ اوپر سے وہ اتنا سنجیدہ' اتنا روکھا اور خشک سا لگتا ہے اور اندر سے اتنا مختلف ہے' وہ اسے دوسروں کے ساتھ مسکراتے اور بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھتی تھی تو اسے ان دوسروں پر رشک آتا، ان سے حسد ہوتا تھا اسے بے اختیار اسے خود اپنے آپ پر رشک آیا۔

وہ اس کا یقین کر رہا ہے، اسے صحیح سمجھ رہا ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ کتنی محبت سے پکڑ رکھا ہے۔ اس کی مضبوط گرفت میں ایک محبت بھرا استحقاق ہے۔

''ولی! کیا تم میرا یقین کرتے ہو؟'' یک بارگی اس کا دل چاہا وہ بہت کچھ جو وہ پہلے اس کے یقین نہ کرنے کے خوف سے کہہ نہ پاتی تھی آج کہہ ڈالے۔

''ولی! معیز میری زندگی کا کوئی اہم انسان نہیں تھا۔ وہ صرف ایک کزن' ایک دوست تھا۔ میں ڈیڈی کے بعد تنہا ہو گئی تھی۔ ممی مجھ سے بہت دور ہو گئی تھیں تب میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا اور اس رشتے کو بھی میں مکمل طور پر ختم کر چکی ہوں۔ اب نہیں، اب سے بہت پہلے۔ تمہیں یاد ہے جب آغا جان ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے ہم دونوں گھر واپس آئے تھے اور معیز اسی وقت یہاں آیا تھا تب تمہیں پتہ ہے میں نے اس سے......'' ولی نے یک دم اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

''مجھے تمہارا یقین ہے فارہ! تمہیں اب مجھ پر کچھ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اس کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھ کر جو کچھ میں نے سوچا یا اس کی تمہاری زندگی میں غیر ضروری مداخلت پر جو کچھ میں سوچتا تھا یہ سب تب کی باتیں تھیں جب تم یہاں آئی نہیں تھی جیسے تم نے ان تین مہینوں میں مجھے سمجھا ہے ایسے ہی میں نے تمہیں ان تین مہینوں میں سمجھا ہے۔

ان تین مہینوں میں، میں نے جانا ہے کہ فارہ بہروز خان وہ نہیں جو پچھلے چھ سالوں میں جان بوجھ کر چیخ چلا کر بدتمیزیاں کر کے ہم سب پر

ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وہ ہم سب سے نفرت اس لئے کرتی تھی کیونکہ اسے ہم سب سے نفرت کرنی ہی سکھائی گئی تھی۔

اس نفرت کے سبب وہ جان کر ہمارے سامنے خود کو اتنا برا بتاتی تھی جتنی بری وہ ہرگز نہیں تھی۔

فارہ بہروز خان ضدی، جذباتی، غصے کی تیز، منہ پھٹ، بدتمیز سب کچھ ہوسکتی ہے مگر وہ ایک باوقار اور سچی لڑکی ہے۔ وہ اگر مجھ سے محبت نہ کرتی تو کبھی محبت کا جھوٹا اظہار بھی نہ کرتی اور میں یہ بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا معیار کبھی بھی اتنا پست اور گرا ہوا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی بھی گھٹیا اور سطحی ذہن کے انسان کو پسند کرلیتی اور اس کی محبت میں بھی مبتلا ہو جاتی۔

وہ اس پر اعتبار کرتا ہے، اس کا یقین کرتا ہے، خود اپنے آپ کو اپنی ہی نظروں سے سرخرو ہوتا دیکھنا ایسا تھا کہ ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''جیسے آج میرا اعتبار کررہے ہو، ایسے مجھ پر ہمیشہ اعتبار کرنا ولی! کبھی مجھے غلط مت سمجھنا۔ یہ بھی مت یاد رکھنا کہ میں پہلے تم سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تھی تو نفرت کیسے کرتی؟ میں نے تمہیں اب جانا ہے اب سمجھا ہے اور مجھے پتہ چلا ہے کہ میرے ڈیڈی نے میرے لئے ایک بہت اچھے انسان کو چنا تھا۔'' اس کے لبوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کے تیزی سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتا وہ ایک دم ہی ہنس پڑا۔

''میری تعریف کے جواب میں یہ تعریف اتنی ضروری تو نہیں تھی۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اپنی تعریف سننے کی امید پر تمہاری تعریف کی تھی۔''

اس کا لہجہ چاہے کتنا ہی غیر سنجیدہ اور لاابالی سا ہو مگر وہ اپنے چہرے پر سے آنسو خشک کرتے اس کے ہاتھ کی ہر انگلی اور ہر پور میں یہ جذبات محسوس کرسکتی تھی کہ چاہے وہ زبان سے نہیں کہہ رہا مگر اسے اس کا رونا اچھا نہیں لگ رہا۔

وہ اس کے کل رات کے رونے کا چاہے جتنا بھی مذاق اڑالے یا لطف لے لے مگر درحقیقت وہ اسے روتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ کوئی آپ کی پرواکرتا ہے۔ آپ کسی کے لئے بہت اہم ہیں، یہ احساس کتنا دل کو خوشی بخشنے والا احساس ہوتا ہے۔

''تم میرا اعتبار کرتے ہو ولی! اس لئے میں تمہیں ایک بات اور بتارہی ہوں ورنہ شاید کبھی بھی بتا نہیں پاتی۔

تین مہینے پہلے فرسٹ جنوری کو جب تم مجھے لینے لاہور آئے تھے۔ میں ان دنوں بہت ڈسٹرب، بہت پریشان تھی۔ ممی مجھ سے ناراض ہوکر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ میں اپنے گھر پر بالکل تنہا تھی۔ میں اپنی زندگی میں بالکل اکیلی ہوگئی تھی۔

مگر اس پریشانی سے بڑھ کر میں آغا جان کے ساتھ اختیار کردہ اپنے رویوں پر اندر ہی اندر پریشان اور پشیماں تھی۔

میں نے ان سے فون پر بات نہ کی، اپنے گھر پر ان سے مس بی ہیو کیا۔ ان سب باتوں نے مجھے اندر ہی اندر بہت زیادہ گلٹی کانشس کیا ہوا تھا۔

تم نے مجھ سے یہاں آنے کو کہا تو پتہ ہے زبان سے چاہے میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہو مگر دل سے میں کسی طلاق کے لالچ میں نہیں صرف اپنے دل کے یہ کہنے پر تمہارے ساتھ آئی تھی کہ مجھے آغا جان کے پاس جانا ہے جو آغا جان نے تم لوگوں کو سکھایا، وہ مجھے ڈیڈی نے سکھایا تھا۔''

فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو' میں اپنے دل کی آواز سن کر یہاں آئی تھی ولی اتم سے طلاق لینے کی امید پر ہرگز نہیں۔''

اپنے دل کی وہ باتیں جو اسے لگتا تھا وہ اسے کبھی بتا نہ پائے گی اور بتائیں تو وہ ہرگز ان پر یقین نہیں کرے گا۔ وہ سب اسے بتانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو کسی بوجھ سے آزاد کرتے جا رہی ہے۔

وہ اس کے آنسو صاف کر چکا تھا، مگر اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے چہرے پر تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اس نے اب بھی بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

''اب ایک ایک کر کے تم مجھے پہیلے کی ہر بات کی وضاحت دوگی؟ جب مجھے یہ یقین ہے کہ فارہ بہروز خان ایک سچی لڑکی ہے تو پھر دل سے یقین ہے۔ مجھے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تمہاری ایک خوبی بتاؤں فارہ! دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی غلطیاں کرتی ہو، مگر تم میں اور دوسرے لوگوں میں یہ فرق ہے کہ جب تمہیں تمہاری غلطی کا احساس ہو جائے تو پھر تم اپنی غلطی پر اڑی نہیں رہتیں۔ تم اپنی غلطیاں بڑے ظرف کے ساتھ قبول کرتی ہو پھر تم اپنی غلطیوں کے لئے تاویلیں نہیں ڈھونڈ کر لاتیں۔ دوسروں کی طرح اپنی غلطیاں کسی اور سر ڈال کر خود کو بری الذمہ نہیں سمجھتیں۔

اس منافقت، جھوٹ اور دھوکے سے بھری دنیا میں تمہاری سچائی، صاف گوئی اور اپنی غلطیاں قبول کر لینے کا ظرف بہت نایاب اور قابل قدر خوبیاں ہیں۔'' وہ بہت سنجیدگی سے بولتے آخر میں کچھ سوچ کر مسکرایا پھر شرارتی لہجے میں اس سے بولا۔

''اب تمہاری باری ہے میری تعریف کرنے کی۔ اس بات کے لئے آغا جان فارسی کی ایک بڑی اچھی مثال دیا کرتے ہیں۔ افسوس مجھے موقع پر یاد آ نہیں رہی۔''

وہ بھی جواباً مسکرائی مگر پھر کچھ اور یاد آ جانے پر دوبارہ سنجیدہ ہو گئی۔

''میں ایک بات کہوں ولی؟'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولنے لگی۔

''ممی یہاں آنے والی ہیں۔ کیا تم ان کے پچھلے تمام رویے بھلا کر ان کے لئے اپنا دل وسیع پاؤ گے؟ میں ان کا کوئی فیور نہیں کر رہی ولی! میں مانتی ہوں، انہوں نے تمہارے ساتھ ہمیشہ بہت برا بی ہیو کیا ہے' ان کی طرف سے میں تم سے معافی مانگ رہی ہوں۔ پلیز میری خاطر ان کی طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔''

وہ ان دو لوگوں کے بیچ جن سے اسے شدید محبت تھی اب کوئی کشیدگی اور تناؤ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ولی نے اس کی آنکھوں کی امید کی طرف دیکھا۔

وہ آس و نراس میں گھری اسے کچھ ڈرتے ڈرتے دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ جواب میں کیا کہہ دے۔

وہ آغا جان جتنا وسیع القلب اور عالی ظرف نہیں تھا۔ صرف اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی اور بدتمیزی ہوئی ہوتی تو وہ با آسانی بھول جاتا مگر روحی بہروز خان نے ایک بار نہیں کئی بار اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے آغا جان کی توہین کی تھی۔ ان کا دل دکھایا تھا۔ ان کی بے عزتی کی تھی۔ معاف کرنا اگر مشکل تھا تو بھول جانا اس سے بھی زیادہ مشکل۔

مگر وہ اس لڑکی کی آنکھوں کی یہ امید بجھتی نہیں دیکھ سکتا تھا، کسی اور حیثیت سے نہ سہی لیکن جس سے وہ محبت کرتا ہے، اس کی ماں سمجھ کر وہ کوشش کرے گا کہ روحی بہروز خان کے لئے اپنے دل میں وسعتیں پیدا کر سکے۔

سر اثبات میں ہلاتے اور اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے دباتے اس نے فارہ کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس کے اور اپنی ماں کے تعلقات کے حوالے سے فکرمند نہ ہو۔

"ولی! یہ تم نے فارہ کو کہیں....." باہر سے ہی بولتے آغا جان اچانک ہی اس کے کمرے کا دروازہ ایک ہلکی سی دستک کے ساتھ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

ولی نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور اس کے چہرے پر سے بھی فوراً اپنا ہاتھ ہٹایا ہاتھ چھوڑنے اور ہٹائے جانے کو انہوں نے دیکھا یا نہیں مگر پانچ فٹ سات انچ کی اپنی وہ ثابت سالم پوتی تو انہیں بغیر چشمے کے بھی اس بیڈ پر ولی کے برابر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

انہوں نے اتنے اچانک انٹری دی تھی کہ صورت حال کو فوری سمجھنے اور بوکھلا کر ولی کے برابر سے کھڑے ہونے میں بھی اسے ایک سیکنڈ تو ضرور لگا۔

"میں سارے گھر میں سب سے ڈھنڈواتا پھر رہا ہوں فارہ کہاں ہے، صبح ہوگئی، اب تک میرے پاس نہیں آئی، رات بھی مجھے شب بخیر کہنے نہیں آئی تھی۔"

وہ اس طرح سنجیدگی سے بولے جیسے کمرے میں موجود ماحول اور صورت حال نہ انہوں نے دیکھی ہے اور سمجھی ہے۔

وہ بوکھلائی ہوئی اور بے حد نروس تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آسکا کہ وہ جواباً کیا کہے۔

"آغا جان! فارہ مجھ سے یہ کہنے آئی تھی کہ آغا جان سے کہو ہماری شادی کروا دیں۔ آخر نیک کام میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں؟"

ولی کا اطمینان اور سکون اگر قابل رشک تھا تو یہ جملہ بھی کم از کم اس کے چودہ طبق روشن کر دینے والا تھا۔ بوکھلاہٹ بھلا کر اس نے ولی کو غصے سے دیکھا۔ اتنی فضول بات اور وہ بھی اس کے نام سے۔

"بات تو بھئی بالکل ٹھیک ہے۔ نیک کام میں دیر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے تم لوگوں کا، کب کی تاریخ رکھیں۔" آغا جان اس کی بوکھلائی اور غصے میں ملی جلی شکل کا مزا لیتے بظاہر سنجیدگی سے بولے۔

"بس اس مہینے کا کوئی سا بھی مبارک جمعہ رکھ لیں۔"

"جمعہ تو سارے مبارک ہوتے ہیں۔"

"بس تو پھر جو سب سے پہلا جمعہ آ رہا ہے وہ رکھ لیں۔" ان دونوں کے بیچ اس گفتگو میں وہ جیسے خاموش تماشائی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آغا جان! بیٹھیں نا۔" ولی انہیں دروازے کی طرف مڑتا دیکھ کر فوراً بولا۔

"آنے والے جمعہ میں دن کتنے کم رہ گئے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہنے سے سب کام نہیں ہو جائیں گے۔"

ہتھیلی پر سرسوں جماتے وہ دادا پوتا کھڑے کھڑے شادی طے کر چکے تھے۔ آغا جان جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے وہ اس پر برہم ہوئی۔

”تم کتنے جھوٹے ہو ولی! آغا جان ٹھیک کہتے ہیں تم صرف نام کے ولی ہو۔ ولیوں والی کوئی ایک بھی صفت تم میں نہیں۔“

اور ولی کے کمرے سے باہر نکل کر اپنے کمرے کی طرف آتے آغا جان پوتی کی اس جھنجھلائی غصے بھری آواز کو سن کر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

ان دونوں کو ایک ساتھ اور اتنا خوش دیکھتے انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے دور کہیں آسمانوں پر ان کے دونوں بیٹے بھی اس منظر کو ان ہی کی طرح دیکھ رہے ہوں۔ اس پر انہیں کی طرح خوش ہو رہے ہوں۔

وہ فارہ کی خوشی کے لئے اس رشتے کو اگر کبھی ختم کرتے تو اس رشتے کے ختم ہونے سے انہیں بہت تکلیف بہت دکھ پہنچتا۔ اس رشتے سے ان کے دو بیٹوں کی آرزوئیں اور ان کی خوشیاں جڑی تھیں۔

وہ اپنے بیٹوں کی خوشی ان کی آرزو پوری ہو جانے پر بے حد خوش تھے اور اس پر بھی کہ خوشیوں کی یہ تکمیل کسی جبر سے نہیں محبت سے ہوئی تھی۔ وہ محبت کی جنگ ہارے نہیں تھے۔

وہ سب نفرتوں کو اپنی ایک محبت سے شکست دے گئے تھے۔ ان کی ایک محبت نے ہزار نفرتوں کو ہرا دیا تھا۔

ان کے دل میں یہ یقین مزید راسخ ہو رہا تھا کہ محبت‘ محبت ہی سے جیتی جاتی ہے اور محبت کبھی ہارتی نہیں۔ محبت کبھی ہار ہی نہیں سکتی۔

انسانوں کے‘ انسانوں کے ساتھ باہمی تمام جذبوں کو جب اللہ نے روز ازل تخلیق کیا تو محبت ہی وہ واحد جذبہ تھا جس کی تقدیر میں جیت‘ جیت اور صرف جیت لکھی گئی۔

محبت کی قسمت میں ہار نہیں اور یہ اس رب کا فیصلہ ہے۔

ختم شد